”چہارسُو“

...... جھجک

اردو کے افسانوی ادب کی اہم تخلیقی شخصیت حسن منظر کا پورا نام سید منظر حسن ہے۔ وہ مارچ ۱۹۳۴ء میں ہاپڑ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مرادآباد میں حاصل کی۔ ازاں بعد اسلامیہ کالج لاہور اور کنگ ایڈورڈ کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ انہوں نے یونیورسٹی آف ایڈمبرا اور راول کالجز آف فزیشنز اینڈ سرجنز سے اعلیٰ طبّی اسناد حاصل کیں۔ ملازمت کے سلسلے میں انگلستان، ملایا، نائجیریا اور سعودی عرب کے علاوہ متعدد ممالک کا سفر کیا جس کے متنوع تجربے انہوں نے اپنے تحریروں میں خوبصورتی کے ساتھ برتے ہیں۔

یوں تو حسن منظر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''رہائی'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہو کر اپنی دھاگ بیٹھا چکا ہے ازاں بعد ان کے پانچ شعری مجموعے اور کئی ناول منظرِ عام پر آئے جنھوں نے حسن منظر کو اعلیٰ مقام پر فائز کیا۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''جھجک'' بیس ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کسی طرح ڈرامائی رنگ یا جذباتی عنصر کو کام میں لائے بغیر نہایت سنجیدگی اور دُور اندیشی سے معاشرے کو درپیش مسائل کی بڑی بُردباری سے نشاندہی کی گئی ہے۔ حسن منظر قاری کو چونکاتے اور نہ کسی قسم کی لذیذیت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ وہ ماہر نبّاض کی طرح مسئلے کی نشاندہی کے ساتھ دھیمے انداز میں قاری کی توجہ اُن تمام کیفیات، تجربات اور مشاہدات کی طرف مبذول کراتے ہیں جس کے ردِّعمل میں کہانی وجود میں آتی ہے۔ اس طرح حسن منظر قاری کو باخبر بھی کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات میں شامل کر کے اُردو کہانی میں نئی طرح کی ایجاد کرتے ہیں۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ حسن منظر کی دھیمی آنچ پر پکائی ہانڈی کی لذت پر تکیہ کرتا ہے یا بین السطور کہی بات کو پلّے باندھ کر کچھ نیا سوچنے اور کرنے کی سبیل کرتا ہے۔ ...... انوار شریف

اشاعت: ۲۰۱۸ء قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: سٹی بک پوائنٹ، اردو بازار، کراچی۔

...... موتیے دیاں کلیاں ......

عذرا اصغر اپنیاں اُچیچیاں لکھتاں کارن ادب داوڈاتے معتبر حوالہ نیں۔ ہن تیکر او ہناں دی پچھان صرف اردو وچ او ہناں دا تخلیق کردہ نثری ادب سی۔ ہن او ہناں نے پنجابی وچ کہانیاں دا پراگا پلا ک نوں دان کر کے پنجاب ادب دے اُچیرے ناوں وچ اپنا نام لکھوالیا اے۔ او ہناں دی کتاب دے ناں ''موتیے دیاں کلیاں'' توں ای دھرتی، دھرتی دے رنگاں تے خوشبوواں نال گوڑھی جڑت ظاہر ہوندی اے۔ عذرا اصغر دا اِک خاص اسلوب تے ڈھنگ اے۔ اوہ بڑی گہرائی وچ شیواں نوں ویکھن تے او ہناں وچ جاری اتھل پتھل نوں بیان کرن داوَل جاندیاں نیں۔ ایہہ سبھ کہانیاں نویکلے انگ نال سوچیاں تے سوہنے ڈھنگ نال کاغذ تے لیکیاں گئیاں نیں۔ ساہنوں آس اس کہ عذرا اصغر وانگ پنجاب دے ہور وڈے لکھاری اپنی ماں بولی دا قرض اتارن لئی ایہدے ول دھیان دین گے۔ ......ڈاکٹر صغرا صدف

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۳۰۰، دستیابی: پنجاب انسٹی آف لینگوئج، آرٹ اینڈ کلچر، لاہور۔

...... جب ہمیں وردی پہنائی گئی ......

۱۹۷۱ء میں جب وطنِ عزیز پر آزمائش کی گھڑی آئی تو ہمیں سول زندگی سے اچانک فوجی زندگی میں داخل ہونا پڑا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں دو سال کڑی مشقت کے بعد آپ آرمی آفیسر بنتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ کمیشن ایک دعوت نامہ بھیج کر دیا گیا جو پاک افواج کی تاریخ میں انوکھی روایت کہلائی گئی۔ ہم جب بھی اُس دور کو یاد کرتے ہیں تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ اُن دنوں کی یادوں کو سپردِ قلم کیا جائے۔ دل کی بائی پاس سرجری کے بعد مستقل خلش تھی کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی عطا کردہ اس مہلت میں کچھ کیا جائے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر فیروز عالم کی حوصلہ افزائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ان کے ہمت دلانے پر منتشر صفحات کتاب کی صورت میں آپ کے روبرو پیش کرنے میں کامیاب ہوں۔ اس کاوش میں سکھر سے جناب نصیر احمد مسلسل ہماری پیٹھ ڈھوکتے رہے اور سید معراج جامی صاحب بھی چند ملاقاتوں میں اجنبیت کی تمام دیواریں ڈھا کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ سو جناب دھڑکتے دل کے ساتھ ہماری یادداشتیں پیش خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف! ......ڈاکٹر عبدالباری

اشاعت: ۲۰۱۸ء، دستیابی: اے بی میڈیکل سینٹر، مہاجر کیمپ نمبر ۳، بلدیہ ٹاؤن کراچی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۷، شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۸ء

رابطہ: 537/D-1 ' گلی نمبر 18، ویسٹریج-III ' راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: 8730433-8730633-51-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویر الحق

☆

قرطاسِ اعزاز
پروفیسر وسیم بریلوی
کے نام

''ارادوں کا سفر''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

ادبی نام : وسیم بریلوی

نام : زاہد حسن

یومِ پیدائش : ۸۔فروری ۱۹۴۰ء

جائے پیدائش: بریلی یوپی (بھارت)

تعلیم: ایم۔اے۔اردو

(فرسٹ ڈویژن، فرسٹ پوزیشن آگرہ یونیورسٹی، آگرہ)

ملازمت:

لیکچرر شعبہ اردو بریلی کالج، بریلی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۰ء تک

صدر شعبۂ اردو بریلی کالج، بریلی ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک

ڈین فیکلٹی آف آرٹ مہاتما جیوتا پھلے روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۰ء

دیگر تعلیمی سرگرمیاں:

دس ریسرچ اسکالر وسیم بریلوی کی سرپرستی میں تحقیقی مقالے پیش کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

مطبوعۂ مجموعہ کلام:

تبسم غم	۱۹۶۶ء
آنسو میرے دامن تیرا (ہندی)	۱۹۹۰ء
مزاج	۱۹۹۰ء
آنکھ آنسو ہوئی	۲۰۰۰ء
میرا کیا (ہندی)	۲۰۰۰ء
آنکھوں آنکھوں رہے	۲۰۰۷ء
موسم اندر باہر کے	۲۰۰۷ء
اندازِ گزارش (نعتیہ مجموعہ)	۲۰۰۹ء
آخری پڑاؤ (کلیات وسیم بریلوی)	زیرِ ترتیب

ایوارڈ:

☆ میر تقی میر اکادمی لکھنؤ کا امتیازی ایوارڈ

☆ ہندی اردو سنگم لکھنؤ کا غزل ایوارڈ

☆ کلا سمرتی لدھیانہ کا اعلیٰ تخلیقی ایوارڈ

☆ کل ہند ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ لکھنؤ

☆ انجمن امروہہ کراچی پاکستان ''غزل ایوارڈ''

☆ ایلیٹ کالج کراچی پاکستان ''غزل ایوارڈ''

☆ دی عثمانین شکاگو امریکہ ''نسیم اردو'' ایوارڈ

سرفرازی:

☆ کاؤنسلیٹ جنرل آف انڈیا جدہ (سعودی عرب) کے ذریعہ اعزاز ۱۹۹۷ء۔۲۰۰۵ء

☆ ہندی ساہتیہ سمیلن پریاگ کے ذریعہ ۹ ساہتیہ سارسوت اعزاز

☆ گہوارۂ ادب یو ایس اے کے ذریعہ ''ادبی اعزاز''

☆ ہیوسٹن سٹی کاؤنسل ٹیکساس امریکہ کے ذریعہ اعزازی ''آنریری سٹیزن'' اور ''گڈول ایمبیسڈر''۔۲۰۰۷ء

☆ فراق انٹرنیشنل ایوارڈ۔۲۰۰۸ء

☆ سردار جعفری لٹریری ایوارڈ ٹیکساس امریکہ۔۲۰۰۹ء

☆ مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ

☆ لیش بھارتی سمان (یوپی سرکار) ۲۰۱۳ء

☆ ڈاکٹر رام گوپال چترویدی سمان

☆ کیفی اعظمی ایوارڈ ۲۰۱۳ء

☆ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، دوحہ قطر ۲۰۱۳ء

☆ ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ۔۲۰۱۴ء

☆ اتحاد ملت کونشن ''نشان میر'' ایوارڈ۔۲۰۱۴ء

☆ اترپردیش اردو اکیڈمی کا قومی ایکتا صغری مہدی ایوارڈ۔۲۰۱۵ء

☆ امر اُجالا گروپ سے ''اٹل مہیشری واڑی سمان'' ۲۰۱۵ء

☆ سنت کالی داس ساہتیہ سمیتی، کروچھیتر کا سوارڑپدک سمان (گولڈ میڈل) ۲۰۱۵ء

اہم ذمہ داریاں

وائس چیئرمین: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل (بھارت سرکار)۔۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۴ء تک

چیئرمین: جن سترکتا کمیٹی بریلی، ناگرک سماجی بریلی، خلیل ہائر سیکنڈری اسکول بریلی، اے آر روہیل کھنڈ جونیئر ہائی اسکول بریلی۔

بانی: ہند ہائر سیکنڈری اسکول بدھولیا سی بی گنج بریلی

سرپرست: مانو سیوا کلب بریلی

ممبر:

☆ آکاشوانی اور دوردرشن (حکومت ہند) کی مشاورتی کمیٹی اور آکاشوانی رامپور کے پروگرام مشاورتی کمیٹی کے ممبر رہے۔

☆ اردو اکادمی کے رکن رہے۔

☆ انجمن اسلامیہ بریلی کے لائف ممبر

☆ سول ڈیفنس بریلی کے چیف وارڈن رہے۔

رسمِ وفا عزیز ہے

پروفیسر وسیم بریلوی

نہ کسی انگریزی ادیب کا قول نہ کسی جرمنی فلاسفر کا جملہ، نہ کسی عربی مفکر کا دعویٰ نہ کوئی دیومالائی حوالہ، بات اردو شاعر کی ہے تو کیوں نہ سیدھی اردو میں بات ہو۔ مستشرقین کے اقوال زریں کو سرخی تحریر بنا کر نہ تبحر علمی کا لوہا منوانا ہے نہ اردو فکر کو کم مائیگی الجھن سے دوچار کرنا مقصود ہے، ذکر ہے پیرزادہ قاسم کا۔ اردو کے ایک ایسے شاعر کا جو ایک غیر محسوس جادو کی طرح گذشتہ کئی دہوں سے اردو کے تاثراتی افق کے سر چڑھ کر بول رہا ہے مگر اس بے ضرر سلامت روی اور ایسی معصوم بے جگری کے ساتھ کہ اندر ہی اندر تیرا کی کا ہنر کیا فاصلہ طے کر گیا سمندر بھی نہیں جانتا۔ پینتیس سالہ سفر شب بیداری، میں شاید ہی دنیا کا کوئی اور علاقہ بچا ہو جہاں کی نیندوں کا قرض مجھ پر نہ ہو اور شاید ہی اردو شاعری کی ایسی کوئی معتبر ہستی ہو جس کی صحبت و قربت سے فیض حاصل کرنے کا اس خاکسار کو موقع نہ ملا ہو، مگر اس لمبے صبر آزما سفر میں ایک پیرزادہ ہی ایسے ملے جنکے بارے میں کوئی منفی سوچ اندازِ فکر کو مبتلائے آزمائش کر دے بلکہ اس مجسمہ ٔ شرافت کے بارے میں کچھ ایسا ویسا سوچئے تو خود کو گناہگار لگنے لگے۔ شاید اس خوبی کو اردو کی شعری روایت بہت زیادہ سنجیدگی سے نہ لے۔ اس لیے کہ غالبؔ سے مجازؔ و فراقؔ تک شاعر کی شاعری کو اس کی شخصیت و کردار سے الگ کر کے دیکھنے کی روایت عام رہی ہے۔ بہت عرصہ تک تو یہ ایک طے شدہ حقیقت سی بنی رہی کہ بے راہروی، شاہد پرستی، شاہد بازی، شراب نوشی و بدمستی کے بغیر اچھی شاعری ممکن ہی نہیں، امیرؔ و داغؔ کا مشہور مکالمہ اس کا ثبوت ہے۔ بہت سے تو آج بھی اس طرز فکر کو تخلیقیت کا جز ولاینفک سمجھتے ہیں۔ چلئے سر دست اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ پیرزادہ قاسم کی شرافت نفس ان کی تخلیقی توانائی کا زیور بنی یا پاؤں کی زنجیر۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیق کا معتدل مزاج ہونا وقتی شعبدہ بازیوں کو بھلے ہی راس نہ آئے مگر تہذیبی و تمدنی قدروں کے فروغ میں جس تندہی کے ساتھ سرگرم عمل رہتا ہے اس تک پہنچ بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ بھڑکیلی آگ میں چاول پکے تو کنی ضرور رہ جاتی ہے، دھیمی دھیمی آنچ چاول کے جگر تک کو مسخر کر لیتی ہے۔ اعتدال پسند تخلیقیت بھی اس طرح دائمی قدروں کے تسلسل کا کچھ اس طرح حسن بنتی ہے کہ سیاق و سباق میں جائے بغیر اس کے سائے کو بھی چھپانا مشکل ہے۔ پیرزادہ کے فن کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر ''اعتدال'' اور ''خلوص'' کو بہر حال نظر میں رکھنا ہوگا۔ اعتدال کی آنچ کھایا ہوا فنکارانہ رویہ نہ موسمی ہو سکتا ہے نہ کاروباری۔ جو راہ چلتے لوگوں کو دھوکا نہ دے سکے وہ بھلا خود کو کہاں دھوکا دے سکتا ہے اس خود کی اہمیت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ پیرزادہ اس ''دورِ قدکش'' اور اس ''عہد قدگر'' میں رہتے ہوئے بھی اس کے نہیں۔ یہی ان کی پہچان ہے۔ وہ الاؤ کے پاس بیٹھے ہیں آگ کی تمازت سے چہرہ تمتما رہا ہے۔ پورا وجود ہی راکھ ہو جانے کے مرحلے میں ہے مگر عرفانِ ذات کو حیرت انگیز حد تک ڈھال بنا لینے والے پیرزادہ الاؤ کی شعلہ نفسی کو بھی شرمندہ نہیں ہونے دیتے، نہ بھاگتے ہیں اور کسی طرح متزلزل بھی نہیں ہوتے یہ ان کا مزاج ہے۔ بڑے بڑے مشکل لمحوں میں ان کی معنی خیز مسکراہٹ انہیں دلدل میں کنول کی طرح کھلائے رکھتی ہے اور یہ بات کسی میں یوں ہی نہیں آجاتی اس کے پیچھے وہ تمام تہذیبی عوامل کارفرما ہیں جو انہیں خاندانی عظمتوں سے ورثہ میں ملے ہیں۔ بقول ان کے ''روشنی جاں کو حرف سخن بنانے کا عمل میرے یہاں غیر فطری طور پر نہیں آیا بلکہ اس کے محرکات میں میرے گھر کی ادبی و علمی فضا اور میرے گھرانے کی سماجی، سیاسی اور دینی روایات شامل ہیں'' جس میں گھر دادا سے ماں باپ تک شاعری اور صحافت کا چلن رہا ہو اور جس کے گھرانے میں عبد الرحمٰن بجنوری، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ ابراہیم، نہال سیوہاروی اور خورشید الاسلام جیسے ناموں کی گونج رہی ہو اور جس کی خاندانی روایات متصوفانہ بے غرضیوں کی آنچ میں تپ کر کندن ہوئی ہوں وہ کوئی بھی میدان چنتا ''پرواز میں کوتاہی'' کے جرم کا مرتکب بہر حال نہیں ہو سکتا تھا۔ نظریاتی ثابت قدمی بازار سے خرید لانے کی چیز نہیں یہ تو تربیت فکر و نظر کا وہ ثمرہ ہے جو دعا اور دوا دونوں کے صدقہ میں مقدر ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ بتائے نہ بنے۔ پیرزادہ سے بات کیجیے یا ان کا کلام سنئے ان کا تہذیبی ورثہ بولے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے ساتھ پاکستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے مشاعروں میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ امریکہ تو تقریباً تین ماہ رہنا ہوا اور شمالی امریکہ کے کئی اہم مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ منظر یہ ہے کہ ہم لوگ کسی شہر میں ساتھ ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں اہل خانہ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اپنی اپنی ذاتی مصروفیات کے پیش نظر گھر اور گھر کا جملہ سامان تمول ہم شعراء کی ذمہ داری پر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ہم ہی میں سے ایک شاعر دوست کی چشم التفات ٹیلی فون کی طرف ہوتی ہے، فون اٹھاتے ہیں اور شروع ہوتا ہے مقامی و غیر مقامی کالوں کا ایسا سلسلہ ٔ لامتناہی کہ ٹیلی فون بھی کہہ اٹھے ''ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا''۔ موصوف فون کئے جاتے مگر افراد خانہ کی عدم موجودگی میں فون کے اس تصرف بیجا کا تمام تر کرب پیرزادہ کے چہرہ پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے کی شکل میں کچھ اس طرح ابھرتا جیسے اس سب کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار ہوں۔ اپنے ہم نفسوں کی مجرمانہ زیادتی کے لیے بھی خود کو گناہگار ٹھہرانے کا سلیقہ ہی میرے خیال میں ان کے فکری رویہ کی پہچان ہے۔

روح کو کیسا ہی زیاں ہو مگر
نفس کو اک لقمہ ٔ تر چاہیے

جا اور بیجا، صدق دریا اور جائز و ناجائز کے بیچ تناؤ زدہ فاصلوں کی زد پہ رہنا ہی ان کی کمزوری ہے اور یہی ان کی طاقت بھی۔ اعتبار درد کا یوں طرح

طرح سے لفظوں میں ڈھلنا اور اپنی راہ خود بنا لینا کوئی کھیل نہیں۔ وہ نہ بے ضمیر دعووں کے شاعر ہیں نہ بڑا بننے کی بے زمین حکمت عملی کے، وہ تو پوری ایمانداری سے بے ایمانیوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ تخلیقیت کے آتشیں کس بل کو کاغذی لفظوں کے سپرد کر کے اپنا تماشا خود دیکھتے ہیں اور ہر گزرنے والے کو ادھر ہو کر گزرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے وہ تو اس میں لگے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، دیکھئے تو ان کی شاعری بھی تین واضح رنگوں سے عبارت ہے۔ مشرقی محبت کی بے لوث خود اذیتی اور خود کش شائستگی، ہجرت نصیبی کے درد کی توسیع کا رنج اور انسانی و آفاقی قدروں کی بے وقعتی و بے حیثیتی کا احساس، محبت ان کے روم روم میں سمائی ہے مگر لگتا ہے محبت انہوں نے اتنی کی نہیں جتنی ان سے کی گئی ہے۔ اتنا سنبھلا ہوا وہی رہ سکتا ہے جسے آخری فتح کا یقین ہو۔ محبت کا بے محابہ اظہار بھی ان کی غزلوں میں کم ہی ہوا ہے ہاں اکثر اشعار میں ایک بے نام تعلق کی دھیمی دھیمی آنچ محسوس کی جا سکتی ہے۔

ہمیں جلدی بہت تھی عشق میں برباد ہونے کی
کہ پیش و پس میں پڑ کے وقت کو برباد کیا کرتے

یہاں ان کا مسئلہ ہر جذباتی انسان کی طرح یہ ہے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ چاہتے کیا ہے۔

ایک خواب نادیدہ روز ٹوٹ جاتا ہے
زخم خوردہ آنکھوں میں کرچیاں بہت سی ہیں

محبت اور واردات دل کا اظہار ان کی نظموں میں ہوا ہے جہاں انہوں نے بڑی فراخدلی سے ہار جیت کے کھیل کھیلے ہیں، بے بسی، ملاقات، بے تکلفی اس کی مثال ہیں۔ مگر ان کی غزلیہ شاعری میں اس تسلسل کرب کا عکس زیادہ ہے جو ہجرت نصیبی سے شروع ہوا ہے ناقدری معاشرہ بکھراؤ کے کئی موسم سہہ لینے کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

ایک ہی داستان شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا

مجھ کو نشاط سے فزوں رسم وفا عزیز ہے
میرا رفیق شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

شکست وریخت کی انتہاؤں میں سانس لیتی، ان دیکھی سراسیمگی سے جوجھتی زندگی کا یہ اطمینان کہ درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی، فکر انگیز بھی ہے حوصلہ افزا بھی۔ حالات کی چیرہ دستی انہیں بے دست و پا نہیں ہونے دیتی یہ ان کا متصوفانہ خمیر ہی تو ہے جو ایک در بند ہو تو سو در کھلنے کی امید رکھتا ہے۔

میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیئے بجھا گئی

کھوکھلی نمائشوں بے ضمیر رونقوں اور مادیت کے نظر فریب سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کا حشر اس سے بہتر کیا بیان ہو سکتا۔

تیز ہوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے مگر
تن سے کوئی قبا چھنی سر سے کوئی ردا گئی

صبر و جبر کی ازلی کشمکش کا یہ رخ بھی دیکھئے:

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں کونے میں
مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے

بکھراؤ شخصی و اجتماعی سطح پر ہی نہیں فکری سطح پر بھی ہے۔ معیار نقد و نظر بھی موسمی تقاضوں کے اثر سے محفوظ نہیں، چنانچہ ہوتا کچھ ہے دکھائی کچھ دیتا ہے۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا۔ پیرزادہ کا یہ شعر ایسے شعبدہ بازوں کے لیے تازیانہ سے کم نہیں:

عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

سچی سوچوں اور بے نفسی کی رعایتوں کے اس محاذ سود و زیاں پر ڈٹے رہنا زندگی کے سامنے سوال نہ کھڑے کر دے ناممکن ہے۔ چنانچہ پیرزادہ کا یہ ردعمل بہت فطری ہے۔

یہ سوچتے ہیں کب تلک خمیر کو بچائیںگے
اگر یوں ہی جیا کئے ضرورتوں کے درمیاں
ہزار بردباریوں کے ساتھ جی رہے ہیں ہم
محال تھا یہ کار زیست وحشتوں کے درمیاں

حالات کی بے راہروی جب ثقافتی مسلمات و کلیات پر طعنہ زن ہو تو ان کا درد دیکھنے کا ہوتا ہے۔

ہاں یہ دستار فضیلت بھی قبائے زر بھی
خود کو دیکھو تو یہ پوشاک بدل کر دیکھو

فراز دار پر کوئی نہ ہم کو پہچانا
زمانے والوں کی خوش قامتی نظر آئی

پیرزادہ کا غم یہ ہے کہ وہ لیل و نہار تازہ کا خواب آنکھوں میں لے کر نکلتے تھے مگر آنکھوں کے تجربوں نے خوابوں کی حقیقت کھول دی۔

اداس اداس یہ دیوار و در بتاتے ہیں
کہ جیسے راس نہ ہو ان کو میرا گھر ہونا

بجنور کی مردم خیز زمین سے اٹھی یہ ہجرت نصیب مٹھی بھر خاک تقسیم کی آندھی کے ہاتھوں کراچی تو جا پہنچی مگر ہنوز دردِ دربدری کے رحم و کرم پہ رہنے کا

المیہ اس کا مقدر ہے اسی المیہ کا عکس پیرزادہ کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتا ہے مگر اس سلگتے ہوئے آج کے سامنے امید فردا کو تج دینے کے حق میں نہیں۔اسی لیے ان کی شاعری انجمن میں اطمینان اور انتشار میں سکون بخشتی ہے۔ان کا تہذیبی خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس نے سینکڑوں طوفانوں کے رخ موڑے ہیں اور کچھ کو سر سے گزر جانے کی بھی اجازت دی ہے مگر بشارت نور کی علامت یہ خمیر خوب جانتا ہے کہ ہار کو جیت میں کیسے بدلا جا سکتا ہے۔اسی لیے پیرزادہ کا فن نئے امکانات کی نشاندہی سے عبارت ہے۔

خوشی کی بات یہ کہ دبئی میں سلیم جعفری نے ہر سال ایک شاعر کا جشن منانے کی روایت کو تسلسل دیا ہے۔مشاعرہ اور کرکٹ کا شوق تقریباً ساتھ ساتھ خلیجی ممالک میں جوان ہوا ہے مشاعرہ اور کرکٹ کی نفسیات میں جو مماثلتی تہہ داریاں ہیں ان کی طرف سب سے پہلے دلاور فگار کی فنکارانہ نگاہ گئی تھی اور انہوں نے بہت پہلے دونوں کی نفسیاتی مماثلتوں کو بنیاد بنا کر بڑے معرکہ کی نظم کہی تھی۔بخاطر اگر خلیجی سرزمین پر کرکٹ کے کولمبس ہیں تو سلیم جعفری مشاعروں کے فرحت اللہ بیگ بخاطر کے شوق بے پایاں نے کرکٹ کھلاڑیوں کے اعانتی میچوں کے حوالے سے کھلاڑیوں کو تو اس ''دولت مزاج'' معاشرہ میں سراونچا کر کے چلنے کا سامان مہیا کرانے میں کس حد تک کامیابی حاصل کر لی مگر سلیم جعفری اپنی انتھک کوششوں کے باوجود شاید ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔کیا یہ اس حقیقت کا مظہر نہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا یہ مہذب معاشرہ آج بھی گھٹنوں کے بل چل رہا ہے اور ذہنی و فکری پیش رفت کے مقابلے میں ''پیر پرستی'' کا قائل ہے۔

میرا محبوب شاعر

میں اس سے اور اس کے کلام دونوں سے محبت کرتا ہوں۔مگر کیا کروں کہ یہ ظالم صرف نام کا مسلمان نہیں بلکہ نماز بھی پابندی سے پڑھتا ہے لیکن میں اس کے برعکس ہوں۔۔۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

وسیم کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبوب کی پرستش میں بھی مبتلا رہ چکے ہیں لیکن میں ابتدا میں کسی کی پرستش نہیں کرتا تھا۔میرے اور وسیم کے خیالات بھونچال کی کیفیت رکھتے ہیں۔بہر حال ''میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا'' اب کیا کیا جائے، یہ نصیب کی بات ہے۔وسیم کی شاعری میں حادثات زیادہ ہیں۔جو حادثات اور محسوسات شاعر کی حقیقی فکر اور صالح جذبات کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے اُن کے اجمال کی توجیہہ دیگر عنوانات سے ہوتی ہے اور یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر لاشعور کی تہہ در تہہ کا جائزہ لیتے ہوئے ایک امتیازی شکل کے ساتھ شعور کی سطح پر نمودار ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد ہی شاعر کی شعری صلاحیت میں اندرونی وحدت کی علامت کو پرکھنے کے لیے شاعر اور قاری کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا بلکہ ایک خاص مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔میرے نزدیک شاعری وابستگی کے بیساختہ پن کا نام ہے اور یہ وابستگی شاعر کو فروعی ہیئت و تکنیک کے ابہام سے دور رکھتی ہے۔اس کے علاوہ داخلیت و خارجیت کے فروعی اظہار سے مبرا کرتی ہے۔روح اور مادے کے درمیان جو پردہ ہے وہ اُٹھا دیتی ہے۔اُس کے بعد ایک مفکر اپنی زندگی میں کائنات کا جائزہ لیتا ہے:

مری حیات سے شاید وہ موڑ چھوٹ گئے
بغیر سمتوں کے راہیں جہاں نکلتی ہیں

وسیم کے کلام میں آگہی اور شعور کی تہوں کا جائزہ ہے اور ایسا شعور و آگہی جو کیف و سرور کا گلدستہ ہے یہ اکثر خدوخال سے بلند ہو کر کائنات کی رنگینیوں اور دلکشیوں سے لطف حاصل کرتے ہیں۔شاعری بھی دراصل وہی شاعری ہے جو اپنے وجود سے ہمیں زندگی کی نزدیک تر چیزوں کا احساس دلاتی ہے۔وسیم کی شاعری احساس حیات کی احساس افزا شاعری ہے اور اس آئینۂ احساس میں دور کے عکس نزدیک پر جلا کر رہے ہیں۔لیکن وسیم ہر عکس کے درمیان مستقل وجود کا احساس دلا رہے ہیں:

میں چل رہا ہوں کہ چلنا بھی ایک عادت ہے
یہ بھول کر کے یہ رستہ کہاں کو جاتا ہے

فراق گورکھپوری (●)

براہِ راست

اردو ادب میں لفظ ''سدا بہار'' کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔سرِ دست یہ کہنا ناممکن ہے اور نا مناسب بھی کہ جو احباب اس لفظ کو استعمال میں لاتے رہے وہ کس حد تک اس لفظ سے انصاف کر پائے۔یعنی تخلیقات کی حد تک یا شخصیات کے حد تک استعمال ہونے والا لفظ ''سدا بہار'' قرینۂ انصاف رہا؟ مگر آج کی محفل کے خصوصی مہمان جناب وسیم بریلوی کی نسبت لفظ ''سدا بہار'' جتنی بار بھی اور جن معنوں میں بھی استعمال کیا جائے وہ صد فیصد حق بہ حقدار تصور کیا جائے گا۔

جناب وسیم بریلوی نے چھ دہائیوں پر مشتمل اپنے علمی، ادبی اور شعری سفر سے اردو زبان کی وسعت اور معنویت میں تو اضافہ کیا ہی ہے بلکہ اردو شاعری کو غیر اردو داں طبقے تک مقبول و ہر دلعزیز بنانے میں وسیم بریلوی صاحب کا کردار بہت طاقتور رہا ہے۔

ذیل کے صفحات میں جناب وسیم بریلوی کی شخصیت اور فن کا شفاف آئینہ ترتیب دیا گیا ہے جس کی کامیابی یا ناکامی کا تمام تر دارو مدار ہمیشہ کی مانند آپ کی رائے کا محتاج ہے۔

گلزار جاوید

☆ ہم اکثر گفتگو کی ابتدا ایامِ طفلی، خاندان یا پس منظر سے کیا کرتے ہیں۔آپ سے ہمارا سوال ہے کہ 6 سال کی عمر میں چوتھی جماعت، 8 سال کی عمر میں پانچویں جماعت، چودہ سال کی عمر میں گیارھویں جماعت اور اٹھارہ سال کی عمر میں سولہ جماعتیں کس طریق پر پاس کیں؟

☆☆ ان دنوں تعلیمی نظام ضابطوں سے بے نیاز تھا۔ نہ اسکولوں کی کثرت نہ داخلوں کی مارا ماری نہ کے۔جی (K.G) فرسٹ سیکنڈ کے ابتدائی مرحلے نہ داخلے کے لیے عمر کا تعین۔یوں بھی زمیندار گھرانوں میں تعلیم کون سا بڑا مسئلہ تھا۔والدہ محترمہ کا جنون کی حد تک تعلیم دلانے کا شوق تھا کہ گھر پر پڑھانے والے ماسٹر علم دار حسین لے گئے تھے۔تیسرے درجے میں داخلہ کرانے کو اور کرا آئے چوتھے میں۔خاندان میں چہ مگوئیاں ہوئیں۔طنز بھی کسے گئے مگر وہ میری طرف سے پُر اعتماد تھے۔عمر تھی اُس وقت چھ سال۔ہر سال اچھے نمبروں میں پاس ہوتا رہا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا نہیں نہ سوچا۔پھر اٹھارہ سال کی عمر میں سولھویں پاس کرنے پر حیرت کیوں۔

میں چل رہا ہوں کہ چلنا بھی ایک عادت ہے
یہ بھول کر کہ یہ رستہ کدھر کو جاتا ہے

☆ شخصیات تین سوال ایک، انتقام الحسنین ایڈووکیٹ، دیونندن جی اور عثمان صاحب اپنے احساسات کی لڑی میں تینوں شخصیات کو پرو دیجئے؟

☆☆ دیونندن وہ پہلے اہم شخص تھے جو میرے بچپن کا حوصلہ بنے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ریاست رام پور کے وزیر تعلیم تھے جنہوں نے بیت بازی کے مقابلے کی صدارت کرتے ہوئے نویں (۹) جماعت کی ٹیم سے نبرد آزما چھٹی جماعت کی ٹیم کے چھوٹے سے بچے کو اکیلے دم پر لڑتے دیکھا اور کمزور پڑتے دیکھ گودی میں اٹھا لیا اور چھٹی جماعت کی ٹیم کی جیت کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے میری کم عمری کو خود اعتمادی کے نئے پر دیدیئے۔

عثمان صاحب میرے استاد بھی تھے پھر شعبہ اردو بریلی کالج میں میرے صدر بھی رہے۔وہ علم و ادب کے نہیں کھیل کے مردِ میدان تھے۔بریلی کالج جیسے بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں چھ سات ہزار طلبہ اور طالبات پر مشتمل تاریخی کالج کی سیاست کے کامیاب شہسوار کے طور پر مستقل وارڈن رہے، پرا کثر پرنسپل کے معتمد رہے۔ظاہر ہے ان کی گونا گوں مصروفیات کی بنا پر مجھے کچھ زیادہ ہی پڑھانے اور پڑھنے کا موقع مل گیا۔مگر اُن کے کالج کے اقتدار کا حصہ ہونے کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ اُن دنوں جیسے اردو بیزار ماحول میں شعبۂ اردو بے وقعتی کا شکار ہونے سے بچا رہا۔یہ بھی حقیقت ہے کہ کالج کی نوکری کے ابتدائی سات آٹھ سال موصوف سے عملی زندگی میں واسطہ پڑنے کے بعد کرب کے اُن سبھی موسموں سے روشناس کرا گئے جنہیں تجربوں کا تلخ باب کہا جا سکتا ہے۔شدید جذبۂ مزاحمت کے باوجود لب کشائی اس لیے کبھی ہو ہی نہیں پائی کہ وہ میرے محسن تھے گھریلو مالی تنگی کی وجہ سے اگر وہ ایم۔اے فائنل کا امتحان دیتے وقت میری فیس اپنی جیب خاص سے جمع نہ کرتے تو نہ مجھے ایڈمٹ کارڈ ملتا اور نہ اُس وقت کے چوراسی ایفیلیٹڈ (Affiliated) کالجوں کی آگرہ یونیورسٹی میں ٹاپ کرتا۔ٹکراؤ کے انتہائی مشکل لمحوں میں بھی اُن کا یہ احسان سامنے آن کھڑا ہوتا اور مجھے بے بس کر دیتا۔رہی بات تیسری شخصیت کی تو ابتدائی غزلیں میں نے اپنے والد محترم حضرت نسیم مراد آبادی صاحب کو دکھائیں۔مگر باقاعدہ اُستاد تھے میرے جناب انتقام الحسنین منتقم حیدری۔پیشے سے وکیل تھے رہنے والے قصبہ سنبھل کے تھے رہتے بریلی میں۔چند ہی غزلوں کے بعد موصوف نے مجھے فارغ الاصلاح قرار دیدیا۔ مگر اُن کی شخصیت جب تک رہی میرے لیے آئیڈیل ہی رہی نہایت سنجیدہ بردبار اور صاحب فہم و ذکا۔علمی و ادبی نکتہ سنجیوں کے ساتھ زندگی کے بے شمار رویوں سے شناسائی اُن کی ہی کشادہ ظرفی کے صدقے میں ہوا۔

یہ کون راہ دکھا کر چلا گیا مجھ کو
میں زندگی میں بھلا کس کے کام آیا تھا

☆ آپ کے خاندانی پس منظر میں جاگیرداری کا ذکر ملتا ہے۔آپ

جانتے ہیں 1857ء کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے اپنی قوم سے بے وفائی کر کے انگریز حکومت اور فوج سے وفاداری نبھائی اُس کے صلے میں یہ جاگیریں وصول کی گئیں؟

☆☆ یہ سچ ہے مگر پورا سچ نہیں۔ ۱۸۵۷ء جسے برصغیر کی پہلی جنگ آزادی کہیے جس کے بعد بادِ مخالف کی زد پر چراغ جلانے والوں یا یوں کہیے آہنی دیوار سے سر ٹکرانے والوں کو بڑی اذیت کا سامنا کرنا پڑا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بے جا سے کوئی بھی معاشرہ بہت زور آزما نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ انگریزوں کے خلاف بھڑکی آگ کو ٹھنڈا ہونا ہی تھا سو ہوئی مگر نئے نظام کی فکر یہ تھی کہ جن سے اقتدار چھینا ہے اور جس سے آگے بھی خطرہ ہو سکتا ہے اُنہیں کیسے بے دست و پا کیا جائے چنانچہ مکمل اقتدار پا جانے کے بعد ظلم و تشدد کا جو طویل سلسلہ چلا اُس کے زیادہ تر شکار وہی ہوئے جو سر سے کفن باندھ کر برسرِ پیکار ہوئے۔ پھر ظلم کی آندھی آندھی کے بعد حالات پر قابو پایا گیا اور خاص حکمتِ عملی کے تحت جاگیردارانہ زمیندارانہ نظام اس لیے قائم رکھا گیا کہ بیدار بغاوتوں کو نیند کی گولیوں کا عادی بنایا جا سکے۔ کچھ لوگوں کو عیش کی زندگی دے کے باقی کے استحصال کا راستہ ہموار کیا جا سکے۔ علم و عمل سے بیگانہ رکھنے کی ایک ایسی منظم سازش تھی جس کے اثرات دور تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کم عمری میں ان تاریخی واقعات سے واقف تو کیا ہوتا مگر ہاں فطرتاً ایسی کچھ باتیں منہ سے ضرور نکل جاتیں جو زمیندار خاندان کی رعونتوں کے حلق سے نہیں اُترتیں۔ میں اکثر کہہ دیتا آپ جس گاؤں میں مال گزاری وصول کرنے جاتے ہیں وہاں کے کسان صبح چار بجے کاندھے پر ہل لیکر کھیت پر نکل جاتے ہیں۔ چاہے جان لیوا سردی ہو یا تپش برساتی گرمی۔ کیا حق ہے آپ کو اُن کی محنت کا پھل کھانے کا اس پر سرزنش ہوتی، بڑوں کی ڈانٹ کھاتا۔ دل ہی دل میں کڑھتا خاموش ہو جاتا۔ برسوں شاید اسی زیادتی کے ردِ عمل نے مجھے عید کے کپڑے پہننے سے باز رکھا۔ پُرانے کپڑے پہننے پر طنز ہوتے لعن طعن ہوتی مگر میں ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

☆ قیامِ رامپور کی یادوں میں ہمارے قارئین کو شریک کیجیے اور اس امر سے بھی آگاہ کیجیے کہ رامپور کے پانی کو پھیکا شربت کیوں کہا جاتا ہے؟

☆☆ سوال کے ساتھ چھوٹی سی عمر کی آنکھوں سے دیکھا گیا رام پور آنکھوں میں گھومنے لگا۔ سویا سویا سا شہر، چھوٹے چھوٹے محلوں میں بٹے نوابی شہر کا بے زبان ماحول، بے فکری کی چادر اوڑھے شہر کے سیدھے سچے لوگ۔ ذرا ذرا سی بات پر چاقو نکل آنے والے واقعات بیان کرتے دن رات۔ اقتصادی بدحالی کا مرثیہ پڑھتے کچے پکے گھر۔ ان میں رہتے چھوٹے موٹے کامداروں کی بڑی آبادی۔ والیِ ریاست رضا علی خان کے نام پر ایک کالج جو بعد میں گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج ہوا۔ ولی عہد مرتضیٰ علی خان کے نام پر ایک ہائی اسکول جس میں میں نے چھٹی ساتویں جماعت کی تعلیم حاصل کی۔ شہزادہ ذوالفقار علی خان کے نام پر ایک اسکول۔۔۔ گھر گھر چوسر پچیسی صنعت کے نام پر بیڑی کے کارخانے۔ اس عمر میں شہر کے بارے میں اور تو کیا جانتا تھا اپنی دنیا محلّہ کٹ گیا میں کرائے کا چھوٹا سا گھر تھا یا مرتضیٰ سکول رام پور۔ خواتین شہر میں ایک سے دوسرے محلے تک ٹھیلوں میں بیٹھ کر جاتیں جن پر آگے پردہ بندھا رہتا اور جنہیں آدمی کھینچتے تھے۔ مردوں کی سواری سائیکل تھی یا تانگے۔ عورتیں برقعوں میں باہر نکلتیں۔ سرخ سفید رنگوں کی زبان بولتی بانکی سجیلی مردانگی پٹھان جوانیوں کی حوصلہ مندیوں سے الگ پہچانی جاتی۔ نوابی قلعہ شہر کے وسط میں ہے مگر عام آدمی کا داخلہ اس میں ممنوع تھا۔ عید میلادالنبی کے موقع پر یا پھر کسی شاہی تقریب کے بہانے عوام پر شاہی قلعے کے دروازے کھلتے تو رونقوں کا ایک نیا جہان نظر کے سامنے ہوتا۔ رنگ برنگے قمقموں کی آرائش اور پیڑوں کی شاخوں، پتوں پر پڑی بلبی جھالروں سے جو فضا بنتی مدتوں عوام کے ذہنوں پر چھائی رہتی اور شاہی اقتدار کی ہیبت ذہنوں پر مسلط رہتی۔ عید میلادالنبی کے موقع پر تبرک کے طور پر سوا پاؤ کا نقطی کا لڈو جو ہر خاص و عام کو تقسیم کیا جاتا اس کے لیے کیا جان لیوا کھینچا تانی ہوتی دیکھتے ہی بنتا۔ گھر گھر اُردو شاعری اور بیت بازی کی محفلیں سجتیں۔ گھریلو خواتین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں بچوں کی حوصلہ افزائی کرتیں کم عمر بچوں کو شاعری کے بارے میں سوچنے کا موقع ملتا۔ یہ وہ ماحول تھا جو بریلی میں کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ بچے ہمت افزائی کے طور پر انعام پاتے۔ بیت بازی کا چلن عام تھا۔ اسکول میں اس کا کیا زور تھا اس کی تفصیل پہلے پیش کی جا چکی ہے۔

اپنے ماضی سے کبھی ملنے چلا آتا ہوں
تیرے اس شہر سے ورنہ مرا رشتہ کیا ہے

☆ ابتدائے سفر میں جدیدیت اور ترقی پسندی سے آپ کا رومان کس نوعیت کا رہا اور آپ کی شخصیت و فن پر اُس کے اثرات کیا رہے؟

☆☆ جب تخلیق کی تڑپ نے پر پھڑپھڑائے تو ایک جنون بے سروساماں تھا جو لفظوں میں ڈھلنے کو بے چین تھا۔ نہ ترقی پسندی کی طرف دیکھا نہ جدیدیت کو جنا بس ایک درد تھا جو پورے وجود کے روئیں روئیں سے لفظوں کے سہارے پھوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ غم آشنائی سے غم شناسی تک کے سفر میں یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کون سا قدم ترقی پسندی کی راہ پر پڑا کس نے جدیدیت کو سرخ رو کیا۔ فطری طور پر یہ کوشش بہر حال رہی کہ شاعری خود سے ہم آہنگ ہو اور واقعیت پر مبنی ہو۔

میں وسیم شعر کہنے کے لیے ترس رہا ہوں
کئی دن سے آنکھ میری اِدھر اشکبار کم ہے

☆ میر تقی میرؔ سے آپ کی نسبت کا ذکر ایک سے زائد احباب بار بار کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ میرؔ کی خاکِ پا بھی نہیں مگر اُن کی نسبت کا ذکر میرے لیے باعث فخر اس لیے ہے کہ میرؔ کی عظمت کا ذکر کسی بھی شہرت کے باب میں نہیں ملتا۔ میرؔ کا روحانی فیض ہے۔ متقدمین متاخرین سے لے کر آج کے شعراء کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میرؔ جیسا لائق اعتبار شاعر شاید ہی کوئی ہو جس نے پوری زندگی جیسا سوچا جیسا کہا سب پبلک ڈومن میں لے آیا۔ ایسی مثال شاید ہی کسی زبان

میں دیکھنے کو ملے۔اس لیے میؔر سے وابستگی فطری ہے نمائشی نہیں اور یہ اس لیے ہے کہ میؔر کی پوری شاعری دردمندی کی بھاشا بولتی ہے اسی بھاشا کا ایک ادنیٰ سا طالب علم میں بھی ہوں۔

خشک مٹی ہی نے جب پاؤں جمانے نہ دیئے
بہتے دریا سے پھر اُمید کوئی کیا رکھے

☆ ؎ عجب کشمش میں پڑگئی ہے زندگی
دوسرا مصرعہ اور کشمش کی وجہ تسمیہ بھی بتلایئے؟

☆☆ یہ اس عمر کا مصرع ہے جب وجہ کشمکش بتانے کا نہ کوئی اہل ہوتا ہے نہ ذمے دار۔حالات آپ کے سامنے ہیں۔پہلا مصرع جس قلم سے جس عمر میں نکل رہا ہے اُس کے پیچھے کتنے عوامل کارفرما ہیں۔اس کو آپ ہی قلم بند کرسکتے ہیں۔والد صاحب نے مصرع لگا کر یوں مکمل کیا تھا:

نہ غم قابو میں اپنے ہیں نہ بس میں ہے خوشی اپنی
عجب اک کشمکش میں پڑ گئی ہے زندگی اپنی

☆ ہر عمر اور ایّام کے نصف درجن سے زائد معاشقوں نے آپ کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کیے اس کے بعد ارینج میرج سے حالات نے کیا رُخ اختیار کیا؟

☆☆ جس مہذب اور لیے دیے رہنے والے معاشرے میں آنکھ کھولی اُس میں سوچا زیادہ جاتا یا بولا اُس سے بھی کم جاتا۔محبت بے زبانی کی ایسی زبان تھی جسے کھل کھیلنے کی اجازت ہی کہاں تھی مشرقی محبت گھٹ گھٹ کر دم توڑنے کا ایسا خاموش المیہ بنی رہی جس کی پرچھائیاں بھی شاید نہ ملتیں اگر تخلیقی ادب کے شہکار سامنے نہ آتے۔جذباتی رشتوں کے یہ بامعنی موڑ نہ ہوں تو زندگی کا سفر شب وروز کی بے معنی گنتی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔آپ پوچھتے ہیں کیا اثر ڈالا۔یہ وہی اثر تو ہے جو میری پہچان کا ذریعہ بنا اور مجھ جیسے معمولی سے سیاق وسباق والے شخص کی عمر کے ہر پڑاؤ سے ہمکلام ہونے کو آپ جیسے ذمہ دار قلم کار کو مجبور کیا ہے۔

میرج ہمارے معاشرے کا ایک سچ ہے جس سے چاہے نہ چاہے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ارینج میرج سماجی تقاضوں کے احترام کا ایک ایسا رویہ ہے جسے قبول کرنے اور برتنے میں کتنے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں خود سے کہیں نہ کہیں لڑتے ضرور رہتے ہیں۔خوش قسمتی یہ رہی کہ ناز کرنے والی ہی نہیں ناز اُٹھانے والی رفیق سفر نے میرے اندر کے فنکار کو زندہ رکھنے میں بڑی مدد کی۔گھر اُن پر چھوڑا۔میں نے باہر کی راہ لی۔سماجی زندگی میں میرا وزن ووقار اُن کا مرہونِ منت ہے۔بچوں کی تعلیم وتربیت کے معاملے میں اُن کا جنون بڑا کام آیا۔میرے پیرینٹس ڈے پر نہ ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی بچوں کو ٹیچر کی بے التفاتی کا شکار ہونا پڑتا کیونکہ مصروفیت مجھے اُن کی توقعات پر پورا اُترنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ایسی مشکل سچویشن کو اہلیہ ہی اپنی حکمت عملی سے سنبھالتی تھیں۔کُل ملا کر گھریلو زندگی سے لے کر سماجی زندگی تک کے اُتار چڑھاؤ کبھی اُن کی مخلصانہ کوششوں سے میری ترقی کے راستے کا روڑا نہیں بنے۔میرا ماننا ہے کہ گھر میں شانتی ہو تبھی باہر کی جنگ لڑی جاسکتی ہے۔

تھکے ہارے پرندے جب بسیرے کے لیے لوٹیں
سلیقہ مند شاخوں کا لچک جانا ضروری ہے

☆ سنا ہے!آپ تخلیق کردہ کلام سے منتخب اشعار لے کر باقی اشعار تلف کردیتے ہیں؟

☆☆ یہ صحیح ہے بکھراؤ اور انتشار سے منظم اور منتخب ہونے تک کا سفر ہی آپ کو قابلِ ذکر بناتا ہے۔

وسیؔم ہم بھی بکھرنے کا حوصلہ کرتے
ہمیں بھی ہوتا جو کوئی سنوارنے والا

☆ رُکی تھمی سی کیفیت سے کیا مراد لی جائے اور اس کا جواز کہاں تلاش کیا جائے؟

☆☆ رُکی تھمی سی کیفیت کا ذکر جن اہلِ قلم نے میری شاعری کے حوالے سے کیا ہے شاید اُن کی مراد اُس کیفیت سے ہے جو لفظوں سے مترشح نہیں ہوتی بلکہ احساس کی سطح پر خاموش مکالمہ چاہتی ہے۔اسی مکالمے کا تنظیمی روپ خود کلامی ہے۔

میں کچھ اس طرح جیا ہوں کہ یقین ہو گیا ہے
مرے بعد زندگی کا بڑا احترام ہو گا

بسی ہوئی ہے مری غم نواز نظروں میں
وہ رات جس میں چراغوں کی عمر کم ہو گی

اشک پی لیتا ہوں یہ سوچ کے دانستہ وسیؔم
دل کے ٹکڑے ہیں انہیں جسم بدر کون کرے

☆ آپ کے اشعار کے دوسرے مصرعہ کو ڈرامائی بتلانے والے کس امر کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں؟

☆☆ تنقیدی تحریریں اپنے محاذوں کو لائق مطالعہ بنانے اور اپنے دعوؤں کو مدلل کرنے کے لیے محض نئی اصطلاحیں ہی وضع نہیں کرتیں بلکہ ایسے گوشے بھی نکالتی ہیں جن کے ذریعے تخلیق کار کے فکری کس بل کو لفظی اور معنوی سطح پر پرکھا جاسکے۔دوسرے مصرے کے ڈرامائی ہونے کی بات بھی اسی زمرے میں آتی ہے ویسے ڈرامہ نہ میری زندگی میں ہے نہ میرے کردار میں۔میں ایک سیدھا سا بے ضرر سا قلم کار ہوں جس نے نہ کبھی یہ سوچا کہ کیا لکھنا ہے نہ یہ کہ کیا لکھنا چاہیے۔بس ایک بے نام سی خلش کا ستایا ہوں جو اظہار چاہتی ہے۔لفظ بھی وہی دیتی ہے اور جواز بھی اسی کی دین ہے۔رہی بات اشارہ کرنے والوں کی تو میں اس لیے نہیں انکار کرونگا کہ اُنہوں نے جو گوشہ تلاشا ہے وہ شاید یہ واضح کرنے کے لیے ہو کہ میرا ایک کے بعد دوسرا فکری قدم غیر متوقع ہوتا ہے۔ایسی بے اختیاری کسی

قلم کار کا مقدر ہو جائے "وہ کیوں نہ خوبیِ قسمت پہ اپنی ناز کرے" ہندی کے ایک بڑے کوی بھارت بھوشن نے جھانسی کے ایک پروگرام کے موقع پر ایک بات کہی تھی۔ جھانسی میں ماتا ٹیلہ ڈیم ہے۔ بہت دور تک سڑک پر گاڑی سے جایئے تو نچلی سطح پر پانی بہتا ہے مگر ایک آخری موڑ پر گھومیے تو ماتا ٹیلہ ڈیم پانی کے پہاڑ کی طرح سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ میرے شعروں پر بات کرتے ہوئے انہوں نے یہی کہا تھا کہ وسیم بھائی آپ کے شعر کے آخری حصے پر پہنچ کر ماتا ٹیلہ ڈیم سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ آپ نے دوسرے مصرعے کے ڈرامائی ہونے کی بات کہی تو مجھے اس استعجابی کیفیت کے ذکر سے بھارت بھوشن کی کہی بات یاد آئی۔

پانی پہ تیرتی ہوئی اک لاش دیکھئے
اور سوچئے کہ ڈوبنا کتنا محال ہے

☆ ماضی کے وہ کون سے حادثات وواقعات ہیں جو آپ کی غزلوں میں نوحہ بن کر در آئے ہیں؟

☆☆ میں بچپن سے بہت حساس تھا ذرا ذرا سی ٹھیس دنوں دُکھ دیتی۔ ذرا سی بدلی نظر مار ڈالتی۔ زمیندار گھرانے میں جنم لینے کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ "نام بڑے اور درشن چھوٹے" باہر سے بڑا دکھنے کی مجبوری اور اندر سے خالی تجوری۔ بڑے تناؤ میں دیکھتا اپنی مادرِ گرامی کو۔ پھر ننھیال میں پیدا ہونے، پرورش پانے کی اذیت سبھوں کی نظروں میں گرے ہونے کا درد بات بات پر خانگی حیثیت رکھنے کے دلدوز تراشوں نے اندر اندر کچھ کر گزرنے کی اُس تڑپ کو زندہ رکھا جو ٹھوکریں کھا کر اُٹھنے اور کھڑے ہونے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ باتیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوتیں مگر ان کے درد لامتناہی۔ اللہ بخشے نانا میاں جاہ وجلال والے تھے مگر ۱۹۴۷ء میں حالات بگڑے فضاؤں میں زہر گھلا۔ والدہ صاحبہ محض تعلیم کی غرض سے اپنے پانچوں بچوں کو لے کر رام پور منتقل ہو گئیں۔ اکیلی باعزم خاتون پانچ چھوٹے چھوٹے بچے کرائے کے کچے مکان میں رہائش پانچویں جماعت کے امتحان ہو چکے تھے بریلی سے والدہ صاحب کو تار ملا۔ "فوراً بریلی آؤ معاملہ سنگین ہے" والدہ صاحب باقی سب کو وہیں چھوڑ کر مجھے ساتھ لے کر بریلی آئیں۔

آنگن کی بڑی چوکی پر نانی جنہیں ہم امّاں کہتے تھے عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں والدہ صاحبہ نے برقعہ اُتار نانی کے سلام پھیرنے کا انتظار کیا۔ سلام پھیرا تو والدہ سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بتایا تمہارے والد یعنی ہمارے نانا نے ساری جائیداد جو تین گاؤں پر مشتمل ہے تمہارے نام لکھ دی ہے اس پر تمہارے بھائی احتشام اللہ بندوق لیے گھوم رہے ہیں اور تمہارے والد کے ہاتھ میں بھی بندوق ہے دونوں میں سے ایک کی جان جانا طے ہے۔ میرے بچپن کے کان یہ سُن رہے تھے آنکھیں دونوں ماں بیٹی کو زار و قطار روتے دیکھ رہی تھیں یا اللہ اب کیا ہوگا؟ اسی دوران گاؤں سے ماموں آ گئے گھر میں داخل ہوئے مجھے اور میری والدہ کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے زور زور سے چیخنے لگے۔ ایک ایک کو گولی سے مار دونگا ایسے تھوڑے ہی جائیداد جانے دوں گا۔ کچھ توقف کے بعد والدہ صاحبہ اُن کے لیے پانی کا گلاس لائیں تسلی سے بات کرنے کو کہا وہ آگ کھاتے انگارے اُگلتے رہے۔ مگر واہ ری میری صابرہ خاتون یعنی میری والدہ اُنہیں شانت کرتے ہوئے گویا ہوئیں بھیّا پوری جائیداد ابا میاں نے میرے نام لکھ دی ہے مگر میں نے لے تھوڑی لی ہے اتنا سُنتے ہی ان کے چہرے کا رنگ دیکھنے کا تھا۔ پانی پیا بولے تم سمجھ بھی رہی ہو کہ کیا کہہ رہی ہو۔ بولیں میں خوب سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ آپ کل ہی وکیل سے مشورہ کر کے کاغذات بنوا لیجئے مجھے صرف اپنا حصہ چاہیے کسی کا حق نہیں میرے بچے تعلیم حاصل کر لیں میرے لیے یہ بہت ہے۔ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا۔ ماموں کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ نانا کے بے حد دباؤ کے باوجود والدہ صاحبہ نے کاغذات پر دستخط کر دیے جس کا جو حق تھا اُسے لوٹا دیا۔ اس کے بعد اپنے حق کے پیسے لینے کے لیے نواب گنج تحصیل کے رچھولا گاؤں جب مال گزاری وصولی کے موقع پر والدہ صاحبہ کو جانے کا حکم ہوتا تو ذلت کے خوف سے نہ میں جانے پر آمادہ ہوتا نہ بڑے بھائی مرحوم افروز صاحب جانے کا دم بھرتے۔ بڑے تکلیف دہ دور سے گزرے ہمارے بچپن کے وہ دن جب اپنے ہی حق کے پیسے لینے جانے اور اقتدار کے نشے میں چور گھڑکیاں سُنتے۔ والدہ صاحبہ کا صبر واستقلال ہمارا سب سے بڑا سہارا تھا جو مشعل راہ بنا۔ انہیں حالات کی انگلی پکڑ کر زندگی آگے بڑھتی ہے تو رومان پرور اُمنگوں کا جہان تازہ لبیک کہتا محسوس ہوتا ہے۔

جذباتی شکست وریخت کی کئی کہانیاں آپ کے سوال کے اردگرد تیر رہی ہیں مگر یہ شعر شاید آپ کے تجسس کے کام آ سکے۔

یہ آرزو بھی تباہی کا پیش لفظ بنی
کسی نظر میں رہیں اور کوئی نظر میں رہے

☆ آپ کے ہاں کفایتِ لفظی بھی قاری کی توجہ پاتی ہے۔ اس عمل میں اساتذہ کا ذکر اور اُن کی پیروی کا حوالہ بھی آتا ہے۔ آپ کی زبان سے سنیں گے تو لطف دوبالا ہو جائے گا؟

☆☆ کفایت لفظی بیانیہ تقلید نہیں لفظوں کے عدل کا معاملہ ہے۔ کم سخنی جیسے مہذب شخصیت کا حسن ہوتی ہے کفایت لفظی تحریر وتقریر کا زیور ہے مگر اُسی صورت میں جب ترسیل متاثر نہ ہو۔

دیکھئے گلزار صاحب! کم سخنی جیسے شائستگی کی علامت ہے ویسے ہی کفایت لفظی شعریت کا حسن۔ مہذب معاشرے شور سے نہیں تامل وتعاون سے پہچانے جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے غزل مشرقی تہذیب کی مستحکم آواز ٹھہری۔ میرے یہاں اگر آپ کفایت لفظی پاتے ہیں تو یہ میری کسی کوشش کے نتیجے میں نہیں بلکہ اس ورثے کا حصہ ہے جو بزرگوں سے مجھے ملا ہے۔ میر کے دو شعر سُنیئے:

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

غالبؔ کوسنیئے:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

فراقؔ کہتے ہیں:

ایک وہ ملنا ایک یہ ملنا
کیا تو مجھ کو چھوڑ رہا ہے

ہر شعر کے پاس بڑی کہانی ہے مگر کفایت لفظی دیکھئے غزل میں بڑا آرٹ ہے۔لفظی فضول خرچی کی نظم تو متحمل ہوسکتی ہے غزل نہیں۔

☆ ذاتی احساسات وتجربات کے لیے روایتی سانچے ناکافی ہیں۔ یہ رائے مذکور آپ سے غیر روایتی سانچوں کی بابت سوال کرنے پر اُکسا رہی ہے؟

☆☆ غالباً میں نے یہ بات غزل کے علاوہ گیت کی طرف جانے کے ضمن میں کہی تھی اور یہ اس لیے کہ غزل نے ایک ایسے شہری معاشرے سے ہم کلام رہنے میں صدیاں کاٹ دیں جس سے تھوڑے ہی فاصلے پر لاتعداد گاؤں بستے تھے جن میں برصغیر کی پچاس فیصدی آبادی رہتی تھی جس کی سادگی بھولے پن کی آغوش میں کروڑوں لوگوں کے احساسات، جذبات، مسائل، موسم اور پتہ نہیں کون کون سے ان بوجھے پہلو رقص کرتے ہیں، سانس لیتے ہیں۔ان کی طرف واجبی توجہ بھی دی جاتی تو کتنا بڑا سرمایہ ہوجاتا اُردو شاعری کے پاس۔۔۔

گاؤں کے میلے پنگھٹ دیکھو
شہر میں ہندوستان نہیں ہے

☆ وسیم بریلوی کی شاعری عصر حاضر کے غموں کی گواہی ہے۔کون سے غم ذاتی،قومی، بین الاقوامی،سیاسی،سماجی یا مذہبی؟

☆☆ کون سا غم نہیں بے حیثیتی کے وہ دن یاد کیجیے جب در در مارے پھرتے ہوں اور سر سائے کو ترس رہا ہو۔ذاتی غم یوں بولتا:

ٹھوکروں میں کیوں سکونِ دل نہیں
زندگی اک راہ ہے منزل نہیں

زندگی ہے اور دل نادان ہے
کیا سفر ہے اور کیا سامان ہے

قومی وملی سطح پر اپنی بے بضاعتی متاثر کرتی تو بات یوں ہوتی۔۔۔

غم بیاں کرنے کا کوئی اور ڈھنگ ایجاد کر
تیری آنکھوں کا یہ پانی تو پُرانا ہو گیا

☆ احتجاج،مزاحمت اور انقلاب کس کے خلاف اور کس شکل میں؟

☆☆ احتجاج،مزاحمت میرے خیال میں انسانی وجود کی سرشت میں ہے۔ قدرت نے ہر متنفس کو الگ وجود دیا ہے الگ سوچ دی ہے الگ نگاہ۔پہلی سانس سے احتجاج ومزاحمت کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔جب انسان اپنے اطراف وکناف کو اپنے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اپنی سوچوں کے رنگ میں ڈھالنے کے درپے رہتا ہے۔مسلسل اسی تگ ودو کے چلتے یا تو محض اسی ماحول کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے یا تھوڑا بہت اپنے حساب سے بدلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔کوئی بڑی شخصیت اُٹھتی ہے تو اس طرح سے اُٹھتی ہے کہ انقلابوں کی تاریخ رقم کر جاتی ہے مختصر یہ کہ احتجاج کبھی کبھی اپنے خلاف تک ہوجاتا ہے کس مشکل میں ہوتا ہے تو سُنیئے:

بھٹکتے مرضی سے اپنی کہیں بھی کھو جاتے
ہم اپنے بس میں ہی کب تھے کہ تیرے ہوجاتے

☆ روایت سے انحراف یا منکر ہونا کسی تخلیق کار بالخصوص آپ کے لیے اعزاز ہے یا اعتراض برائے اعتراض؟

☆☆ روایت سے انحراف یا انکار زیادہ تنقید نگاروں یا تبصرہ نگاروں کی اصطلاحی کردار نگاری کے پرتو ہیں۔ ہر بیس پچیس سال کے بعد کسی بھی انسانی معاشرے میں لفظی ومعنوی سطح پر تخلیق اپنے رویے بدلنے کو مجبور ہوتی ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی زندگی نئے روپ میں ڈھلنے کو بے چین ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے یہ نہ کوئی اعزاز کی بات ہے نہ اعتراض کی۔یہ ایک عام سا جملہ بن کر رہ گیا ہے جس کی مجھے کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔کتنی ہی انحراف یا انکار کی کوشش ہو روایت ہی وہ بنیاد ہے جو فکری رویوں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا شعور بخشتی ہے۔

☆ بقول شمیم کرمانی آپ کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے داخلی وخارجی مسائل پیش کرنے کے ساتھ اُن کا حل بھی تلاش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔تن تنہا کوئی شخص اس طرح کی خواہش کو عملی جامہ کیونکر پہنا سکتا ہے؟

☆☆ تاریخ گواہ ہے بڑی سوچ کسی ایک ذہن کا مقدر ہوئی مگر عملی جامہ پہنتے پہنتے بے شمار سوچیں شریک سفر ہوگئیں یہی تعمیری رویہ مشعلِ راہ ہو تو کیا ممکن نہیں۔

سفر مشکل سہی لیکن مری ہمت یہ کہتی ہے
اکیلا چل دیا ہوں میں اکیلا رہ نہیں سکتا

☆ سحر انصاری صاحب کا یہ خیال کہ: آپ کا کلام قدیم یونانی ناقدین کے مطابق صداقت پر مبنی ہے کچھ ابہام کا حامل لگتا ہے؟

☆☆ یہ سوال تو آپ کو سحر انصاری صاحب سے کرنا چاہیے مگر مجھ سے پوچھتے ہیں تو کہنے دیجیے۔ میں نے جو کچھ کہا خود سے نظر ملانے کے لائق بنے رہنے کے لیے کہا۔خود کو خود سے وابستہ رکھنے کے لیے کہا۔شاید اسی طرف اُن کا اشارہ ہو۔

خود میں وہ لمحہ لمحہ تغیر ہے اے وسیمؔ
ملتے ہوں جیسے روز کسی اجنبی سے ہم

☆ سچائی تو تعریف کی ذیل میں آتی ہے۔اُس سقّا کی کو ہم کس عنوان سے موسوم کریں جو آپ کی شاعری میں نشان زد کی گئی ہے؟

☆☆ اُسی نام سے موسوم کریں جو مجھے آپ جیسے قاری سے دُور نہ ہونے دے۔

سلگتی آنکھوں سے عنوانِ شام لکھتا ہے
دیئے کی لَو پہ کوئی تیرا نام لکھتا ہے

☆ آپ کے باب میں نئی غزل اور نئے شعور کا تصور رکھنے والے، بہت سے لوگوں کی حق تلفی نہیں کر رہے؟

☆☆ سوال واضح نہیں جواب کیا دوں۔

جہاں روشنی کا لانا اگر اک گنہ سے کم ہو
تو یہ صبح کے مسیحا پہ صلیب شام کیوں ہے

☆ ابتدا میں آپ کی نظموں میں اختر شیرانی، مجاز، ساحر اور جاں نثار اختر کے اثرات نظر آئے مگر یہ قربت دیرپا ثابت نہ ہو سکی؟

☆☆ اثرات تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ شاعر وہی لکھتا ہے جو لکھنے پر مجبور ہو۔ یہ تاثر کا لفظ پہن لینا کسی جذبے کا زبان پا جانا ایک ایسا نشہ ہے جو کسی فنکار کو دیر تک ہوا میں اُڑنے کا حق دے دیتا ہے مگر یہ ممکن تبھی ہے جب جذبہ بھی اپنا ہو لہجہ اور تجربہ بھی اپنا ہی ہو۔ تقلیدی تحریر نہ یہ نشہ دے سکتی ہے نہ دیرپا تاثیر۔

ہمارے شعروں میں اک دور سانس لیتا ہے
وسیم کیسے زمانہ ہمیں بھلائے گا

☆ کچھ احباب کا خیال ہے کہ نظم کی بابت آپ کا رجحان سنجیدہ نوعیت کا نہیں۔ یہ صرف زمانہ شباب میں دلی کیفیت کے زیر اثر کہی گئیں ہیں؟

☆☆ عہد جوانی کی وارداتی نظمیں نہ وقتی ہیں نہ رسمی جتنی دیر میرا ''میں'' نظم کی زبان بولتا ہے جذبہ وفکر کی پوری سچائی اور توانائی کے ساتھ بولتا ہے۔ نظم کا خواب سفر مختصر ہو سکتا ہے مگر رجحان کی سنجیدگی لفظ لفظ بتائے گا۔ جذباتی اور رومانی دور کی اپنی ہی دنیا ہے اگر تنقید اس عہد کی رومانی تڑپ اور جذباتی کسک کو اہمیت دینے سے بچتی ہے تو کبھی تنقید بھی ہو سکتی ہے تخلیق کے اس موسم کی نہیں۔

نظر اُٹھاؤ تو قدموں میں اک زمانہ ہے

☆ قیامِ سنبھل کے دوران انگریزی نظموں کے اردو تراجم کس تحریک پر کئے۔ یہ سلسلہ کب تک چلا اور وہ تراجم کن شعرا کے کلام پر مشتمل تھے نیز اُن کے شائع ہونے کی صورت میں احباب نے کس طرح کے ردِعمل کا اظہار کیا؟

☆☆ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ انٹر کالج سنبھل میں اُردو کے ساتھ انگریزی بھی نویں جماعت کو پڑھانا ہوتی تھی تو سوچا کیوں نہ ایسا کیا جائے جو نیا ہو چنانچہ کورس کی کئی نظموں کے ترجمے آسان اردو میں کر دیے۔ طلباء نے یاد کر لیے اور جیسا کہ بعد میں بتایا گیا انگریزی کی وہ نظمیں اُردو میں منتقل ہوئیں تو طلباء کے ذہنوں میں محفوظ رہ گئیں۔ کافی عرصے تک چرچا بھی کالج میں رہا ایک سال بعد تو میں دلّی چلا ہی آیا تھا مگر ان ترجموں کو آپ ابتدائی کوشش کہہ سکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ وہ چھپوائی گئیں نہ محفوظ رہ سکیں شاید کسی پُرانی ڈائری میں دو ایک پڑی ہوں ورنہ یہ کوئی سنجیدہ کوشش شاعری کی نہیں کہی جا سکتی۔

☆ غزل کی طرح آپ کے گیت بھی خاصے مقبول ہیں۔ اس باب میں آپ نے اردو کے علاوہ اور کن زبانوں سے استفادہ کیا؟

☆☆ میں نے اکثر سوچا کہ غزل جو اُردو شاعری کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر لائق فخر صنف سخن ہے کہیں نہ کہیں ایک مخصوص شہری معاشرے کی ترجمان ہونے سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی۔ درباروں، اُمراء کی محفلوں، رئیسوں کی صحبتوں یا مخصوص و منتخب شہری محفلوں کی پسند بنی رہی۔ شہری آبادی کی بغل میں بسنے والے برصغیر کے دیہاتوں کھیت کھلیانوں سے جیسے اردو غزل کا کوئی رشتہ ہی نہیں رہا آج بھی شہر سے بیس کلو میٹر دور بسے دیہات میں چلے جایئے اور پڑھیے وہاں غالب کا شعر:

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

دیکھئے کیا ردعمل ہوتا ہے۔ غزل مہذب و منتخب شہریت سے ہمکلام رہنے میں ہی مطمئن رہی۔ مجھے لگا ہندوستان کی لوک سنسکرتی کی اپنی بڑی تاریخ ہے جس کے پاس اودھی، برج، بھوج پوری، گیتوں کی روایت ہے کیوں نہ اس سے استفادہ کیا جائے اور ہندوستانی تہذیب کے بہت سے بوجھے اَن بوجھے رنگوں سے گیتوں کی بھاشا میں مخاطب ہوا جائے۔ یہ کوشش تھی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ علاقائی بھاشاؤں میں گیت کو ہلے پھلکے جذباتی موضوعات کے لیے برتا جاتا رہا ہے۔ میری کوشش یہ رہی کہ گیت محض ایک جذباتی رویہ نہ ہو فکر انگیز بھی ہو۔ گیت ہندی زبان کا بڑا سرمایہ ہے اس لیے کسی اور زبان سے کسبِ فیض کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

چُنر یا کاغذ ہوئی جائے
جو دیکھے کچھ لکھ ہی جائے
بھری جوانی منہ سے نکلی بات چھپاؤں چھپ نا پائے

☆ آپ کے گیتوں کی غنائیت نے بالی وڈ کے کانوں میں رس کیوں نہیں گھولا؟

☆☆ فلمی دنیا یا فلمی بازار کے معیار پر پورا اُترنا چڑھنے سے زیادہ اُترنے جیسا ہے۔ یہاں آپ کے فن کی پذیرائی سے پہلے آپ کی ذات کو کئی امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں فقط پاسنگ مارکس کافی نہیں امتیازی نمبر چاہئیں۔ لہٰذا میں اُدھر کیا جا پاتا۔ دو بار کسی بڑے ڈائریکٹر نے مرید افسر کے کہنے سے بلایا بھی وہ شرطیں ناقابلِ قبول نکلیں۔ بہر حال بڑی دنیا لیے اپنی چھوٹی سی دنیا میں اپنی ہی شرطوں پر رہے۔

یہ سر عظیم ہے جھکنے کہیں نہ پائے وسیم
ذرا سی جینے کی خواہش پہ مر نہیں جانا

☆ تنہایئے کی صنف کب، کہاں، کیسے وجود میں آئی اور آپ جیسی باغ و بہار شخصیت کو یہ ترکیب برتنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ تنہایئے خاکساری کا ایجاد کردہ لفظ ہے۔ اس کا وجود بہت فکری

ہے۔صدیوں سے غزل مکمل ہوکر کاغذ کی زینت بنتی رہی دواوین اُٹھا کر دیکھئے غزل مکمل نہ ہوتو جگہ نہیں پاتی۔تخلیقی ذہن مسلسل ایک محور پرنہیں رہ سکتا۔کوئی اضطراری کیفیت کوئی غیر معمولی جذبہ کوئی وقتی تاثرہی تخلیقی ذہن پر غالب ہوتا ہے اوراس شدت سے غالب ہوتا ہے کہ شعر کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔یہ صورت حال بہت دیرتک نہیں رہتی۔ہوسکتا ہے اس تاثر یا جذبے کا تسلسل دوایک شعراوردے جائے مگر غزل مکمل کرنے کے لیے جب ردیف اور قافیے کی پابندی کے ساتھ سرگرداں رہتے ہیں تو رفتہ رفتہ جذبے کی شدت کم ہوتی جاتی ہے اور شاعر زبردستی کے اشعار شامل کر کے غزل کا پیٹ بھر دیتا ہے۔میراماننا ہے کہ جس وقت کسی جذبے کا غلبہ تخلیقی سطح پراُبھرے تو شعر ہوضرور ہواُسے کتاب کا حصہ بنائیے چاہے ایک ہی کیوں نہ ہومگر زبردستی ایک شعر کی خاطر غزل مکمل کی جائے یہ غیر فطری ہے۔جب غزل کا ہر شعر انفرادی سانسوں سے جی سکتا ہے تو آئی۔سی۔یو جانے کی کیاضرورت ہے۔

روشنی سے ہیں دامن بچائے
کتنے خود دار ہوتے ہیں سائے

☆ آپ کے ہاں وقت کی قلت کے باعث نظر ثانی یا توجہ کا عمل کم ہونے کے سبب معیار کس طرح قائم رہتا ہے؟

☆☆ تخلیق کار پر خالق کائنات کی خاص عنایت نہ ہوتو کیسے کرےلمحوں میں صدیوں کا سفر۔رُکنا ٹھہرنا توقف ذہانتوں کے بس کا ہے ہی نہیں۔بڑا تخلیقی ذہن کمزورلمحوں میں بھی معیار سے نہیں گرتا۔شعر کی لفظ لباسی نظر ثانی کے مرحلے سے گزرسکتی ہے مگر خیال تو خیال ہے تخلیقی آنچ میں تپ کر ہی منہ سے بولتا ہے۔

مری حیات سے شاید وہ موڑ چھوٹ گئے
بغیر سمتوں کے راہیں جہاں نکلتی ہیں
وسیمؔ آؤ ان آنکھوں کو غور سے دیکھو
یہی تو ہیں جو مرے فیصلے بدلتی ہیں

☆ نصف صدی سے زائد وسیم بریلوی کے شعری سفر میں شاعری انسان اورانسانوں کے بیچ مکالمے کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

☆☆ یہی جو آپ کے سامنے شعروں کی شکل میں ہے:

اُترے ہوئے نشے کی طرح کیا پتہ لگے
کس فاصلے پہ چھوٹ گئے زندگی سے ہم

☆ ''میاں جتنا آپ سوئے نہیں اتنا ہم مشاعروں کے لیے جاگے ہیں'' یہ شکوہ ہے،شکایت،تنقید یا حقیقت کا اظہار جس سے مشاعروں کی بدنظمی صاف عیاں ہے۔کیا کوئی صورت مشاعروں میں نظم وضبط کی نہیں بن سکتی۔کیوں آپ جیسے سینئر شعراءمشاعروں اور گلے بازوں کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے؟

☆☆ یہ جملہ کسی اور تناظر میں ہے جب لسانی اورادبی سطح پرآنکھ کھولی تو اردو کواپنے وجود کی جنگ لڑتے پایا۔اُردو مخالف کو تو جانے دیجئے اردو معاشرہ خوداردو یا اُردو والوں کو کہاں عزت دیتا تھا میں نے اردو کی اعلیٰ تعلیم کی سوچی تو اُنگلیاں اُٹھیں طنز کیے گئے۔حقارت سے دیکھا گیا اُردو کے نام پر سارے دربند دیکھے تو تڑپ پیدا ہوئی۔اردو کے لیے کچھ کر گزرنے کی۔اُردو کا وقار بحال ہو سب سے بڑا سوال یہ تھا۔نہ رسالے کی طرف دیکھا نہ ناقدین سے سُر ملائے۔بند کوئیں میں کیا کنکری ڈالتے اور طوفان کا انتظار کرتے۔اردو کا مقدمہ شاعری کے ذریعے عوام کے بیچ لے گئے۔ان میں محض اردو والے نہیں تھے ہندی والے بھی تھے۔پنجابی،گجراتی اور بنگالی والے بھی تھے۔پچاس سال کی شب بیداریاں رائیگاں نہیں گئیں۔پہلا چیلنج تھا زبان بچانے کا۔جس زبان کا نام لینا اسکول کالج یونیورسٹی کی سطح پر شجر ممنوعہ بن گیا ہواُس کی شاعری سننے کے لیے ہر زبان ہر مکتبہ فکر ہر طبقے ہر مذہب ہر نظریے کے لوگ جب صبح چار بجے تک بیٹھنے پر مجبور ہوئے تو کہنا پڑا کہ میاں جتنا تم سوئے نہیں ہواُتنا ہم جاگے ہیں اور خود ہی نہیں جاگے لوگوں کو اردو کے نام پر جاگنے کے لیے مجبور بھی کیا۔جملے کا رخ کدھر ہے آپ سے بہتر کون سمجھے گا۔

سیلن زدہ کمروں میں بیٹھ کر لوگ جب سورج کی تمازت پر تبصرے فرماتے ہیں تو سچ مچ ہنسی آتی ہے۔سوال کا دوسرا حصہ یقیناً قابل غور ہے۔مشاعرہ جب ایک مہذب ادارہ بن چکا ہے تو اس کے ضابطے بھی طے ہونے چاہیے کچھ سال پہلے کراچی میونسپل کمیٹی کے پچھتر سالہ جشن کے موقع پر شہری استقبالیہ میں شرکت کی تو مہمان خصوصی کی حیثیت سے عرض کیا تھا کہ شب میں گیارہ بجے مشاعرے شروع کرنا صبح تک سامعین کو بٹھائے رکھنا اور پسندیدہ شعراء کو سنوانے کے لیے اُن پر زیادتی کرنا اور نئی نسل کو خاص طور پر بڑی روایت سے بیزار کرنے کا عمل۔مشاعرہ سرکاری وغیر سرکاری تقریبات کی طرح شام چھ بجے شروع کیا جائے رات دس بجے تک ختم کردیجئے یہ شاعری بے عملی کے دور کی یادگار بن کر کب تک آج کے برق رفتار ذہنوں کی اُڑانوں کا امتحان لیتی رہے گی۔خاص طور پر رات بھر کی شعری محفلوں پراصرار کرنا نئی نسل کو پوری طرح اپنے تہذیبی ورثے سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

وسیمؔ صبح کی تنہائی سفر سوچو
مشاعرہ تو چلو رات بھر کا ہو جائے

☆ یہ جوآج کل کتب کی شاعری اور مشاعروں کی شاعری میں تفریق پیدا ہوگئی ہے اس کے نقصانات سے کس طرح بچا جاسکتا ہے؟

☆☆ واقعی شاعری ان دنوں دوخانوں میں بٹی ہوئی ہے چھپنے والی شاعری کی اپنی ادا ہے تو ڈائس پر پڑھی جانے والی شاعری کا اپنا انداز ہے۔پریشانی کی بات یہ ہے کہ اگر ڈائس کی پچانوے فیصدی شاعری مسترد کرنے کے لائق ہے تو رسائل میں شائع ہونے والی بھی نوّے فیصدی شاعری کاغذی خانہ پُری سے زیادہ کچھ نہیں۔میرے خیال میں دونوں جگہ شعراء کی لفظی کاری گری اور ایسی بازی گری سے ہٹ کر زمینی حقیقتوں یا جذباتی سچائیوں سے وابستہ رہنے کی کوشش کرنا چاہیے تبھی شاعری لوگوں کے دلوں کی زبان بنے گی ورنہ رسائل ناقدین کی

نظر میں آنے اور محفلوں کی شاعری سامعین کی سطح تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی حیثیت ہی سے سمجھوتہ کر بیٹھے گی۔ دونوں جگہ ضروری ہے کہ تخلیق کار رسائل میں ناقد کو اور محفل مشاعرہ میں سامعین کو اپنی فکری سطح تک لانے کی کوشش کرے تبھی یہ فرق جو رسائل و مشاعرہ کے بیچ پیدا ہوا ہے ختم ہوگا۔

ہمارا عزم سفر کب کدھر کا ہو جائے
یہ وہ نہیں جو کسی رہگذر کا ہو جائے
اُسی کو جینے کا حق ہے جو اس زمانے میں
اِدھر کا لگتا رہے اور اُدھر کا ہو جائے

☆ جو لوگ آپ کی مقبولیت کو مشاعروں کی دین کہتے ہیں اُن کو آپ کس طرح مطمئن کرنا چاہیں گے؟

☆☆ مجھے خوشی بھی ہے اور فخر بھی میری مقبولیت مشاعروں کی دین ہے۔ یہاں اپنے بل پر کھڑے ہونا اور زندہ رہنا ہوتا ہے۔ نہ کسی تحریک کا تعاون نہ کسی گروہ کی سرپرستی نہ کسی ''ہم شما دیگر نیست'' کشف برداری نہ کسی پی آر شپ کی پشت پناہی نہ خبروں میں بنے رہنے کے ہتھکنڈے نہ بے ضمیری کا پردہ رکھنے کو کم ظرف دعوے۔ پھر بھی تین نسلوں کی ذہنی و فکری رفاقتوں کا سزاوار ٹھہرا۔ جتنے شعر خاکسار کے پچھلے پچاس سال میں ضرب المثل بنے شاید ہی کسی اور کے نصیب میں آئے ہوں۔ یہ قلم بخشنے والے کا کرم خاص نہیں تو کیا ہے، مجھ جیسے حقیر فقیر پر۔

کھُلی چھتوں کے دیئے کب کے بجھ گئے ہوتے
کوئی تو ہے جو ہواؤں کے پر کترتا ہے

☆ کچھ دوست آپ کے ہاں موت کے خوف کا اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ یہ محض خیال ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی پائی جاتی ہے؟

☆☆ موت ایک زندہ حقیقت ہے اسے یاد رکھنا اس کا ذکر اس کا خوف زندگی کو بے عمل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔

☆ کہیں اس خوف میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا قول تو جواز نہیں بن رہا ''شاعری شخصیت سے گریز بلکہ معدوم ہونے کا نام ہے؟''

☆☆ شاعری وجود کی لے بن جائے تو کھونے پانے کی معنویتیں ہی بے معنی ہونے لگتی ہیں۔ خود جوئی کا یہ عمل موت کے خوف کو کتنا زندگی بخش بنا سکتا ہے دیکھنا ہے تو زندہ شاعری کے ہو کے دیکھئے۔

آج بھی اس زندگی کی لاش میں
جان پڑ جاتی ہے تیرے نام سے

☆ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ آپ ناقدین کو اور ناقدین آپ کو خاص اہمیت نہیں دے رہے، اس عدم تعلق کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ خود کو وقت دینے میں جسے عمر کم پڑ رہی ہو وہ تنقید کے لیے کہاں سے وقت لائے۔ عصری مجبوریوں کے بادل چھٹنے دیجئے تنقید کہاں ہاتھوں سے جانے والی ہے۔ میرا خاکسارانہ اعتماد ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ میں تخلیقی تحیر کے یہ انمول شب و روز اِدھر اُدھر بانٹ دوں۔

جس زمیں پر میں کھڑا ہوں وہ مری پہچان ہے
آپ آندھی ہیں تو کیا مجھ کو اُڑا لے جائیں گے
آپ بس کردار ہیں اپنی حدیں پہچانیئے
ورنہ پھر اک دن کہانی سے نکالے جائیں گے

☆ کہتے ہیں کہ وسیم بریلوی نے بہت جرأت اور بہادری سے سیاست اور سیاستدانوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ چلئے مان لیتے ہیں۔ قصہ مگر الٹ ہے وقت کے ساتھ ساتھ سیاست سفاک اور سیاستدان خونخوار ہوتے جا رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ کوئی کیا کرے؟

☆☆ یہ المیہ آج کا نہیں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے اور اب بھی ہوتا ہے انہیں تضادات سے شعور نمو پاتا ہے تخلیق پر نئی معنویتوں کے در کھُلتے ہیں۔

اصولوں پر جہاں آنچ آئے ٹکرانا ضروری ہے
جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے

میں قطرہ ہو کے بھی طوفاں سے جنگ لیتا ہوں
مجھے بچانا سمندر کی ذمے داری ہے

یہ ہے تو سب کے لیے ہو یہ ضد ہماری ہے
اس ایک بات پہ دنیا سے جنگ جاری ہے
دُعا کرو کہ سلامت رہے مری ہمت
یہ چراغ کئی آندھیوں پہ بھاری ہے

☆ آج کے اردو نا آشنا بھارتی سماج میں اردو ادب و شاعری کا سفر کس سمت رواں ہے، انجام کی بابت آپ بتلا سکتے ہیں یا خدا؟

☆☆ اُردو آشنا سماج دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ مگر اُردو رسم الخط آشنا سماج دن بہ دن سکڑتا جا رہا ہے۔ دینی مدارس نہ ہوتے تو رسم الخط آشنائی کے لالے پڑ جاتے۔ ہندوستان ہو یا پاکستان بڑے شہروں کے متمول اُردو گھرانوں کے بچے پبلک اسکولوں کے دروازے پر فخریہ جبیں سائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انگریزی دانی کو وجہ افتخار سمجھتے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کی بات اس کی غیر معمولی معنی آفرینی دلکشی کا جادو ہر صاحب دل کے سر چڑھ کر کچھ اس طرح بول رہا ہے کہ اردو داں تو گرویدہ ہیں ہی جو اردو نہیں جانتے وہ بھی رومن اور دیوناگری رسم الخط کے ذریعے اس کی عظمتوں کے قائل ہو رہے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں مسلمانوں کی ہمت و استقلال کا ذکر کن معنوں اور علاقوں سے ہے۔ آج کے مسلمان تو امریکہ بہادر کے دربار میں سجدہ ریز ہونے کو بیتاب ہیں؟

☆☆ اس سوال کے جواب میں بس ایک شعر حاضر ہے:

عظیم تھے یہ دعاؤں کو اُٹھنے والے ہاتھ
نہ جانے کب انہیں کاسہ بنا لیا میں نے

☆ بابری مسجد کا تنازعہ بھی دونوں اقوام کے درمیان باعث نزاع ہے۔ آپ کے خیال میں اُس کا کوئی مناسب حل ہے جس سے دونوں طبقات مطمئن ہو جائیں؟

☆☆ اتنا ہی کہنا کافی ہے۔
محبت کے یہ آنسو ہیں انہیں آنکھوں میں رہنے دو
شریفوں کے گھروں کا مسئلہ باہر نہیں جاتا

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ بھارت کی بیس کروڑ سے زائد مسلم آبادی کو جس قدر مشکلات اور عدم تحفظ کا سامنا آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ نہ صرف بھارت بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر خوف و ہراس کی کیفیت کس چیز کا پیش خیمہ ہے اور اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہو تو ضرور خوش خبری سنایئے؟

☆☆ اصل ہندوستان دیکھنا ہے تو اس شعر کی آنکھوں میں دیکھئے:
کل اک گاؤں کی بُڑھیا میری کار سے جب ٹکرائی
بولی توہرا دوش نہیں ہے ہمی کو دیکھت ناں ہی

☆

''چہرے پہ لکھا ہوا''

وسیم بریلوی کی شخصیت کے عالمانہ اور حکیمانہ پہلو بھی ہیں، جہاں انہوں نے اپنی شاعری سے سماج کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے وہیں بحیثیت ایک پروفیسر مختلف ڈگری کالج ہی نہیں بلکہ روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی کے قیام میں بھی کلیدی رول ادا کیا۔حکومتِ ہند کی قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر فروغِ اردو کے لیے اقدامات کئے اور کررہے ہیں انہیں اردو کی تاریخ میں سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔

آج ہماری پیاری زبان اُردو جو عالمی اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی تیسری بڑی زبان بن چکی ہے اس کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے میں جن یادگار مشاعروں کا گزشتہ پچاس برس میں اہم رول رہا ہے ان مشاعروں میں وسیم بریلوی کی شرکت اور شمولیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔وسیم بریلوی ایک جیتے جاگتے ادبی معیار، وقار اور کردار کا نام ہے۔ان کا شعری سفر''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ'' کا مصداق بن کر جاری وساری ہے۔وہ خود کہتے ہیں کہ تخلیق کار اپنے زمانے کا حادثہ ہوتا ہے اور تنقید نگار اپنے عہد کا رپورٹر۔یہ ذمہ داری رپورٹر کی ہے کہ وہ جائے حادثہ کو تلاش کرے۔وسیم بریلوی تو بیباک اور بے خوف ہو کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں:

حادثوں کی زد پہ ہیں تو مسکرانا چھوڑ دیں
زلزلوں کے خوف سے کیا گھر بنانا چھوڑ دیں

وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ایک مدرس اور ایک پروفیسر بھی ہیں۔تعلیم کو فروغ دینا، ذہنوں کو جگانا اور شعور کو پروان چڑھانا ان کا مقصد حیات ہے۔اسی مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے وسیم بریلوی نے شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔انہوں نے شاعری میں بھی اپنے لیے اس لباس کو پسند کیا جو ایک پروفیسر کا لباس ہوتا ہے۔بالفاظ دیگر وسیم بریلوی نے اپنے ظاہر و باطن میں کبھی فرق نہیں کیا:

دیکھئے کب کوئی پڑھنے والا ملے
میں ہوں اپنے ہی چہرے پہ لکھا ہوا
پیاس کا وہ سفر ہوں میں جس کو وسیم
کوئی بادل ملا بھی تو برسا ہوا

پروفیسر ناشر نقوی

''دیوں کی گرم مزاجی''

(پروفیسر وسیم بریلوی کی غزلیہ کلام سے بصد شوق)

فاری شا (راولپنڈی)

☆

مجھے بجھا دے مرا دور مختصر کر دے
مگر دیئے کی طرح مجھ کو معتبر کر دے

مری تلاش کو بے نام و بے سفر کر دے
میں تیرا راستہ چھوڑوں تو دربدر کر دے

بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی عمر ہی کتنی
میں تیری شام ہوں آ جا مری سحر کر دے

جدائیوں کی یہ راتیں تو کاٹنی ہونگی
کہانیوں کو کوئی کیسے مختصر کر دے

ترے خیال کے ہاتھوں کچھ ایسا بکھرا ہوں
کہ جیسے بچہ کتابیں اِدھر اُدھر کر دے

O

☆

لہو نہ ہو تو قلم ترجماں نہیں ہوتا
ہمارے دَور میں آنسو زباں نہیں ہوتا

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

بس اک نگاہ مری راہ دیکھتی ہوتی
یہ سارا شہر مرا میزباں نہیں ہوتا

ترا خیال نہ ہوتا تو کون سمجھاتا
زمیں نہ ہو تو کوئی آسماں نہیں ہوتا

میں اس کو بھول گیا ہوں یہ کون مانے گا
کسی چراغ کے بس میں دھواں نہیں ہوتا

O

☆

مجھے پوچھنے کا حق دے کہ یہ اہتمام کیوں ہے
مرے ساتھ پیاس کیوں ہے ترے پاس جام کیوں ہے

جسے میری تیرہ بختی سے فروغ مل رہا ہو
وہی صبح پوچھتی ہے مرے گھر میں شام کیوں ہے

تری بے نیازیوں کو کبھی سوچنا پڑے گا
جہاں تیری گفتگو ہے وہاں میرا نام کیوں ہے

یہاں روشنی کا لانا اگر اک گنہ سے کم ہو
تو یہ صبح کے مسیحا پہ صلیبِ شام کیوں ہے

میں وسیم وقت سے بھی ابھی مطمئن نہیں ہوں
مجھے اس سے یہ گلہ ہے کہ یہ سست گام کیوں ہے

○

☆

بہت خوں رنگ کرنا پڑ رہی ہے داستاں مجھ کو
کہ پھر بھولے سے بھی کوئی نہ سمجھے بے زباں مجھ کو

مگر تم نے مجھے گم کردۂ منزل بنا ڈالا
میں کہتا ہی رہا سمجھو شریک کارواں مجھ کو

ذرا سا خود میں جھانکا زمانہ ہو گیا روشن
دکھا دیتی ہیں باہر تک کا گھر کی کھڑکیاں مجھ کو

بگڑ سکتا بھی ہوں کچھ کر گزرنے کا بھی امکاں ہے
تمہاری بے رخی لے جاتی ہے دیکھو کہاں مجھ کو

ذرا خود اعتمادی کی کمی نے مار ہی ڈالا
طلب لے کر جہاں پہنچا ملیں بیساکھیاں مجھ کو

○

☆

کیا بتاؤں کیسا خود کو دربدر میں نے کیا
عمر بھر کس کس کے حصے کا سفر میں نے کیا

تو تو نفرت بھی نہ کر پائیگا اس شدت کے ساتھ
جس بلا کا پیار تجھ سے بے خبر میں نے کیا

کیسے بچوں کو بتاؤں راستوں کے پیچ و خم
زندگی بھر تو کتابوں کا سفر میں نے کیا

کس کو فرصت تھی کہ بتلاتا تجھے اتنی سی بات
خود سے کیا برتاؤ تجھ سے چھوٹ کر میں نے کیا

چند جذباتی سے رشتوں کے بچانے کو وسیم
کیسا کیسا جبر اپنے آپ پر میں نے کیا

○

☆

تمہاری راہ میں مٹی کے گھر نہیں آتے
اسی لیے تو تمہیں ہم نظر نہیں آتے

محبتوں کے دنوں کی یہی خرابی ہے
یہ روٹھ جائیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے

جنہیں سلیقہ ہے تہذیبِ غم سمجھنے کا
انہیں کے رونے میں آنسو نظر نہیں آتے

خوشی کی آنکھ میں آنسو کی بھی جگہ رکھنا
بُرے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

بساطِ عشق میں بڑھنا کسے نہیں آتا
مگر ہر ایک کو بچنے کے گھر نہیں آتے

○

☆

ہوا اندھیروں کے ایسے دباؤ میں آئی
پھر اک غریب کے گھر کا دیا اٹھا لائی

گھروں کی بات گھروں سے اگر نکل آئی
تو پھر کسی کے نہ روکے رکے گی رسوائی

خیال یہ تھا کہ اب دن ضرور نکلے گا
مگر یہ رات تو پھر رات لیکے لوٹ آئی

یہ جائیدادوں کی تقسیم بھائیوں میں ہوئی
کہ جائیدادوں میں تقسیم ہو گئے بھائی

بجھا دیئے گئے کیسے بنا وضاحت کے
دیوں کی گرم مزاجی ہوا کے کام آئی

عجیب بات ہے ہر رشتہ ٹوٹنے کے بعد
مجھے تو اپنی ہی کوئی کمی نظر آئی

مری نگاہ میں منزل کے خواب رہتے ہیں
مجھے ستاتی نہیں راستوں کی تنہائی

پرائے درد میں آنسو بہا کے دیکھ ذرا
تری ان آنکھوں کی بڑھتی ہے کیسی بینائی

میں کم نگاہ تھا ایسا کہ پڑھ نہیں پایا
کسی دریچے سے چھنتی رہی شناسائی

ابھی ہم اپنے مسائل میں خود ہی الجھے ہیں
ابھی الجھنے کی تم سے گھڑی نہیں آئی

○

☆

اس سے بڑھ کر خواب جینے کی سزا کچھ بھی نہیں
زندگی بھر ٹھوکریں کھائیں ملا کچھ بھی نہیں

تم تو ماضی کے حوالے کر کے مجھ کو چل دیئے
میری مجبوری یہ ہے میں بھولتا کچھ بھی نہیں

پیار کی اپنی زباں ہے اپنا ہی انداز ہے
میں نے سب کچھ سن لیا اس نے کہا کچھ بھی نہیں

طے شدہ الزام کی جس سے کوئی تصدیق ہو
میرے گھر سے آج تک ایسا ملا کچھ بھی نہیں

کھو دیا قطرے نے خود کو اک تعلق کے لیے
اور مزہ یہ ہے سمندر کو پتہ کچھ بھی نہیں

آخرش آندھی نے جو چاہا وہی ہو کر رہا
کوششیں تو کیں چراغوں نے ہوا کچھ بھی نہیں

○

''بے کسوں کی دستگیری''

ڈاکٹر جاوید نسیمی
(بریلی، بھارت)

وسیم بریلوی کی پیدائش تو بریلی میں ہوئی لیکن ان کے والد جناب شاہد حسن نسیم کا تعلق مرادآباد سے تھا۔ وہ مرادآباد کے ایک بہت بڑے گھر کے چشم و چراغ تھے۔ مرادآباد سے کاشی پور جتنے بھی ریلوے اسٹیشن ہیں اوران کے آس پاس کے تقریباً ۹۵ فیصد گاؤں شاہد حسن صاحب کے پرنانا منشی فداعلی صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ کریم بخش کے بسائے ہوئے تھے۔ وہ ٹھیکیدار کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے لاولد ہونے کے باعث یہ تمام مواضعات منشی فداعلی صاحب کومل گئے۔ ان گاؤں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب فدا علی صاحب نے اس جائداد کو اپنی اولادوں میں تقسیم کیا تو ان کے دولڑکوں منشی مظہر حسن صاحب (شاہد حسن کے نانا) منشی اطہر حسن اور بیٹی (شاہد صاحب کی دادی) کو اتنے گاؤں ملے تھے کہ ان دونوں نے (مظہر حسن اور اطہر حسن) اپنی پانچ پانچ اولادوں کو ایک ایک بڑے موضع کے ساتھ دو دو تین تین چھوٹے گاؤں بھی دیے تھے۔ شاہد حسن صاحب کی والدہ کو حصہ رسدی کے علاوہ ایک گاؤں جہیز میں بھی ملا تھا۔ منشی مظہر حسن صاحب آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اوراس زمانے میں بیس ہزار روپیہ سالانہ مال گزاری سرکار کو ادا کرتے تھے۔ وہ بڑی شان وشوکت کے آدمی تھے ان کی رہائش کی وجہ سے ہی اُس محلے کا نام ''نوابوں کا محلّہ'' یا ''نواب پورہ'' مشہور ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے منشی شوکت حسن صاحب اور نورالحسن صاحب تک اثر ورسوخ اور جاہ وحشمت کا یہ سلسلہ باقی رہا۔ یہ دونوں ہی آنریری مجسٹریٹ بھی رہے اور نورالحسن صاحب کئی مرتبہ میونسپل بورڈ مرادآباد کے چیئرمین بھی رہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب دہلی دربار منعقد ہوا اور فرمانروائے انگلستان وہندوستان جارج پنجم دہلی تشریف لائے تو ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے، نواب اور امراء ورؤسا اس دربار میں شریک ہوئے تھے ان میں منشی شوکت حسن صاحب نورالحسن صاحب اور احمد حسن صاحب بھی شریک تھے جس کا ثبوت وہ مجلد ضخیم کتاب ہے جو اس موقعہ پر شائع ہوئی تھی اور جس میں تمام شرکاء کی مختصر سوانح کے ساتھ فوٹو بھی موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ خاندان ہمیشہ سے عزت ودولت والا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ علم دین اور مذہب کا چرچا بھی اس خاندان میں ایسا تھا کہ ہمیشہ اس خاندان میں جید عالم اور بزرگ ہوتے رہے۔ قطب الاقطاب حضرت مولانا مخدوم سماء الدین صاحب سہروردیؒ اس خاندان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا مزار آج بھی مہرولی کے اس میدانی علاقہ میں موجود ہے جہاں سے ہر سال پنکھے کا جلوس دہلی میں نکلتا ہے۔ حضرت مولانا مخدوم سماء الدین صاحبؒ، حضرت زبیر بن العوامؓ حواری رسولؐ کی اولاد میں سے ہیں اور یہ سلسلہ ایک مقام پر پہنچ کر نبی کریم محمدﷺ کے شجرہ سے مل جاتا ہے (مصباح العارفین از زین العابدین عرف شیخ ادہنؒ)

حضرت مخدوم سماء الدین کا حال ''سیر العارفین'' (سیر العارفین از مولانا جمالیؒ) میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت کی صرف ایک نظر سے بڑے سے بڑے فاسق و فاجر تائب ہو جاتے تھے۔ مخدوم صاحب نویں صدی ہجری میں ملتان سے بیانہ ہوتے ہوئے دہلی تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کر کے لوگوں کی ظاہری و باطنی اصلاح میں مشغول ہو گئے اُس وقت دہلی کے تخت پر سلطان بہلول لودھی تخت نشین تھا۔ وہ مخدوم صاحب سے ارادت رکھتا تھا اور آپ کی خدمت میں برابر حاضری دیتا تھا قدم بوسی کر کے مؤدب ہو کر سامنے بیٹھا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ مخدوم صاحب نے اس کو اپنا مصلّٰی عنایت فرمایا۔ سلطان نے وہ مصلّٰی اپنے سر پر رکھ لیا اور اسی حالت میں قصر سلطانی تک پیدل واپس آیا۔ حضرت مخدوم صاحب کی ولادت ۸۰۸ھ اور وفات ۱۷۔ جمادی الاول ۹۰۱ھ میں ہوئی مہرولی (دہلی) میں بالائے حوض شمسی آپ کا مزار اقدس آج بھی موجود ہے اور پنکھے کا جلوس ان ہی سے منسوب ہے۔

اس خاندان کے اصحاب صاحب علم اور صاحب کشف و کرامت ہونے کے باعث مسلسل حکومت کے مناصب پر بھی فائز ہوتے رہے اور پنج ہزاری تک سے نوازے جاتے رہے۔ وسیم بریلوی کے اجداد میں ''حضرت شیخ نصیر الدین صاحب، سکندر لودھی، ابراہیم لودھی اور بابر شاہ کے عہد میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے جو ایک بڑا منصب تھا'' (کلمات الصادقین)

شیخ نصیر الدین صاحب کے صاحبزادے مفتی جمال الدین عرف جمال خاںؒ کے متعلق ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب ''منتخب التواریخ'' میں درج ہے۔۔۔''اواعلم العلما، درزماں خود بود'' (وہ اپنے زمانے کے تمام علماء میں سب سے بڑے عالم تھے) وہ سکندر لودھی کے وقت سے دہلی کے مفتی مقرر ہوئے اور اکبر بادشاہ کے زمانے تک یعنی اپنی آخری عمر تک دہلی کے مفتی رہے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالبرکات صاحب، مفتی محمد دولت صاحب اور مولانا تراب علی صاحب ایسے جدی عالم بھی اسی خاندان کے افراد تھے جن کے علمی و دینی کارنامے آج بھی مختلف تاریخی کتابوں کی زینت ہیں۔ مولانا ابوالبرکات صاحب کا تصنیف کردہ ایک فتویٰ دو جلدوں میں ''فتاویٰ مجمع البرکات'' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ مفتی محمد دولت صاحب کے متعلق ''آبِ حیات'' میں تحریر ہے کہ خواجہ میر درد مثنوی مولانا رومؒ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ مولانا تراب علی صاحب ۵۲ کتابوں کے مصنف تھے جس کی تفصیل ''شمس التواریخ'' کی جلد دوئم میں موجود ہے۔ اس تمام تفصیل سے ظاہر ہے کہ شاہد حسن صاحب ایک نہایت معزز وضع اور صاحب علم خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اس خاندان میں آج بھی مولوی عزیز حسن صاحب مرادآبادی ایسے عالم اور ڈاکٹر محمد حسن ایسے نقاد ادب موجود ہیں (ڈاکٹر محمد

حسن وسیم بریلوی کے رشتہ کے چچا ہیں)

شاہد حسن صاحب بذاتِ خود نہایت شریف النفس انسان تھے۔ وہ سید میاں غالب علی صاحبؒ سے بیعت تھے۔ مولوی غالب علی صاحبؒ بہت بلند پایہ بزرگ اور حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوریؒ کے خلیفہ تھے۔ شاہد حسن صاحب کے والد شیخ مقصود حسن صاحب کے انتقال کے بعد شاہد حسن صاحب اپنے ماموں منشی الطاف حسن صاحب کے زیرِ پرورش رہے اور ان کے ساتھ مولوی غالب صاحب کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ شاہد حسن صاحب کے بچپن تک دولت ان کے در کی لونڈی تھی۔ ان کے گھر میں ایک کمرہ صرف کپڑوں کے لیے تو دوسرا صرف جوتوں کے لیے وقف تھا اور اسی مناسبت سے الگ الگ کمرے الگ الگ ضروریات کے لیے مخصوص تھے۔ وہ نویں درجہ کے طالب علم تھے کہ انہوں نے شاعری شروع کر دی۔ نسیم تخلص اختیار کیا اور جگر مرادآبادی کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے رئیس امروہوی کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا اور رئیس امروہوی کے پاکستان جانے کے بعد وہ حضرت قمر مراد آبادی سے مشورہ سخن کرتے رہے اور ساتھ ہی اپنے ہم نواؤں کے ساتھ شہر میں خوب خوب ادبی ہنگامے برپا کئے۔ شاہد حسن صاحب جب دسویں درجہ کے طالب علم تھے تو اپنی والدہ کے اصرار پر عدالت سے بالغ قرار دیئے جانے کی خواہش میں اپنے ماموں منشی الطاف حسن، جو کہ عدالت سے ان کے ولی مقرر تھے، کے گھر سے نکل بھاگے اور مرادآباد کے ایک بنئے شیام سندر کے پھندے میں پھنس کر اپنی کل جائیداد جو تین سالم گاؤں اور ایک لق و دق مکان پر مشتمل تھی بلا معاوضہ شیام سندر وغیرہ کو بیچ کر دی۔ اس وقت اُس جائیداد کی مالیت تقریباً دس لاکھ روپے تھی۔ شاہد حسن صاحب کو جب ہوش آیا اور اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سولہ سترہ سال تک جائیداد کی واپسی کے لیے ان لالہ لوگوں سے مقدمہ بازی کرتے رہے جس کے نتیجے میں جو کچھ جمع جتھا پاس تھا وہ بھی گنوا بیٹھے اور مقدمہ بھی ہار گئے۔ لالہ لوگوں کو یہ جائیداد لکھنے کے کچھ عرصہ بعد ہی الطاف حسن صاحب نے شاہد حسن صاحب کی شادی بریلی میں شیخ انتظام اللہ صاحب عرف منا میاں کی صاحبزادی سے کر دی۔ یہ رشتہ کرانے میں الطاف حسن صاحب کی دور اندیشی کا ہاتھ تھا انہوں نے سوچا کہ چونکہ انتظام اللہ صاحب آنریری مجسٹریٹ اور کافی بار سوخ انسان ہیں لہٰذا وہ اپنے داماد کی جائیداد واپس دلانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ شاہد حسن صاحب خانہ داماد کی حیثیت سے سسرال میں رہنے لگے لیکن اس کے خسر صاحب نے جائیداد کے مقدمہ کے سلسلہ میں ان کی کوئی مدد نہ کی بلکہ انہیں سمجھایا کہ تم مقدمہ نہیں جیت سکتے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جائیداد کی واپسی کا خیال چھوڑ کر کوئی نوکری کر لو۔ شاہد حسن صاحب کو اپنے خسر صاحب سے ایسی امید نہ تھی لہٰذا وہ بہت بددل ہوئے اور سسرال کی رہائش ترک کر کے ایک عرصہ تک اپنے ایک دوست منشی سید کاردعلی کے یہاں قیام پذیر رہے۔ شاہد حسن صاحب نے ہائی کورٹ الہٰ آباد تک مقدمہ لڑا لیکن وہ اپنی جائیداد واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے کئی جگہ ملازمتیں کیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور ایم اے، بی ٹی، منشی کامل وغیرہ کے امتحانات پاس کر کے ایک طرف اپنے عزم محکم اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور دوسری طرف یہ بھی ثابت کر دیا کہ علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ انہوں نے کچھ ایسا قلندرانہ مزاج پایا تھا کہ کسی ایک جگہ نہ جمتے تھے۔ آج ایک نوکری چھوڑی کل دوسری پکڑی اور پرسوں اسے چھوڑ دی۔ غرض یہ کہ ان کی کوئی معقول ملازمت تھی نہ معقول آمدنی۔ ان کی بیوی اپنے میکے محلہ کڑھیا میں رہ رہی تھیں اسی مکان میں ۸۔ فروری ۱۹۴۰ء کو وسیم بریلوی کی پیدائش ہوئی۔ ان کی پیدائش کی اطلاع جب ان کے والد اپنے پیر و مرشد سید غالب میاں کو دینے گئے تو خبر سن کر انہوں نے تبسم فرمایا اور زاہد حسن نام تجویز کیا۔ شاہد حسن صاحب خود رقم طراز ہیں:

''جب وسیم کی پیدائش کی خبر دینے اور نام دریافت کرنے میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو خبر سن کر مسکرائے اور زاہد حسن نام تجویز کیا۔ ان کے مسکرانے کا مطلب اس وقت تو سمجھ میں نہ آیا مگر آج انڈو پاک کے مشہور و معروف شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت اور ناموری دیکھ کر مولوی صاحب کی مسکراہٹ کا سبب اب معلوم ہوا۔''

(احوالِ واقعی، مرتبہ شاہد حسن نسیم مرادآبادی)

زاہد حسن کے علاوہ گھر میں ان کا نام پرویز رکھا گیا۔ وسیم کی پیدائش سے تقریباً ۲۵ روز قبل ہی ان کے ماموں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا اور ان کی موت کا سخت صدمہ وسیم کی والدہ کے دل پر تھا۔ وہ ہر وقت بھائی کی یاد میں روتی رہتی تھیں۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ حاملہ عورت جیسا سوچتی ہے اس کے اثرات اس کے ہونے والے بچے پر پڑتے ہیں۔ لہٰذا وسیم کی فطرت میں جو غم پسندی ہے وہ بہت کچھ اسی حادثے کی دین ہے۔ وسیم کو دینی تعلیم مولانا ظہور صاحب سے دلائی گئی۔ بریلی کی تحصیل نواب گنج میں وسیم کے نانا کی جائیداد تھی۔ اسی تحصیل کے گاؤں کریم میں وسیم اپنی نانی، والدہ، دو بھائی اور دو بہنوں کے ساتھ رہائش پذیر ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں نواب گنج کے اسکول میں وسیم کو ان کے بڑے بھائی افروز کے ساتھ ابتدائی تعلیم کے لیے داخل کرا دیا گیا۔ وسیم اور افروز دونوں لہڑو میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتے تھے۔ ایک روز گھر کے آنگن میں لیٹے ہوئے وسیم اور افروز آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ہمارے ماسٹر صاحب ہمیں جو انگریزی کے لفظ پڑھاتے ہیں ان کے معنی بتاتے نہیں ہیں۔ کل کو جب ہمارے بچے ہم سے کسی لفظ کے معنی پوچھیں گے تو ہم انہیں کیسے بتائیں گے؟ بظاہر بچوں کی یہ باتیں ہنسی کی تھیں لیکن ان کی والدہ نے ان باتوں سے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ بچے گاؤں کے اسکول میں پڑھنے لائق نہیں ہیں لہٰذا انہیں لے کر بریلی آ گئیں اور ۱۹۴۵ء میں ہی بریلی میں منوہر بھوشن اسکول (یہ اب انٹر کالج ہے) میں چوتھے درجے میں ان کا نام لکھا دیا گیا۔ وسیم نے وہ کلاس فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، اس کے بعد وہ اسلامیہ اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کر دیے گئے۔ ابھی

امتحان بھی نہ ہو پائے تھے کہ تقسیم ملک کے باعث زبردست فساد شروع ہو گئے اور ہر طرف مار کاٹ مچ گئی، اسی دوران امتحان آ گئے۔ چونکہ وسیم کے نانا آنریری مجسٹریٹ تھے اس لیے دو سپاہی وسیم کو تانگہ پر لے کر امتحان دلوانے لے جاتے تھے اور واپس گھر تک لاتے تھے۔ اسی دوران وسیم کی خالہ جو کہ دہلی میں قرول باغ کے علاقے میں رہتی تھیں ان کی گمشدگی کی خبر ملی، والدہ اور نانا کا رو رو کر برا حال ہوا، گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ آٹھ روز تک لگاتار گھر میں رونا دھونا مچا رہا۔ آخر کار پتہ چلا کہ وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور وہاں خیریت سے ہیں تب جا کر یہ ماتمی فضا ختم ہوئی۔ وسیم کے نانا پاکستان ہجرت کے سخت خلاف تھے تاہم گھر کا سارا سامان بندھا ہوا گھر کے صحن میں کئی روز تک اسی اندیشے کے باعث رکھا رہا کہ معلوم نہیں کس وقت کیا حالات پیدا ہو جائیں؟ جب فسادات نے اور شدت اختیار کی تو ان کے نانا نے وسیم کی والدہ کو بمعہ بچوں کے رامپور منتقل کر دیا کیونکہ رامپور اس وقت بھی پُرسکون تھا اور فساد کے کوئی خاص اثرات وہاں نہ تھے۔ وسیم کی والدہ کے ساتھ ہی اُن کی چچا زاد بہن بھی اپنے پورے کنبے کو لے کر رام پور آ گئیں تھیں انہوں نے رامپور کے محلّہ راج دوارہ میں ایک عالیشان اور وسیع گھر کرائے پر لے لیا اور یہ چاہا کہ وسیم کی والدہ بھی ان کے ساتھ اسی مکان میں رہیں، لیکن وسیم کی والدہ کی خودداری نے یہ گوارہ نہ کیا اور انہوں نے نہایت خوبصورتی سے بات کو ٹال دیا، پھر خود محلّہ کٹ کنوئیاں پر ایک کچے مکان کا نصف حصہ کرائے پر لے کر اپنے بچوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ اسی سال یعنی ۱۹۴۷ء میں رامپور کے مرتضٰی سکول میں چھٹی جماعت میں وسیم کا داخلہ کرا دیا گیا اور وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اس اسکول میں ہر سال ایک اجلاس ہوتا تھا۔ کھیل کود کے علاوہ اس میں بیت بازی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ نویں درجے میں دو بھائی تھے جن میں سے ایک نام محمود اور دوسرے کا مسعود عالم تھا۔ یہ دونوں ہر میدان کے شہسوار تھے۔ کوئی بھی مقابلہ ہو ایک بھائی فرسٹ اور دوسرا سیکنڈ آتا تھا یعنی اسکول کی ساری ٹرافیوں پر اُن ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ وسیم نے بیت بازی کے مقابلے کے لیے ایک ٹیم بنائی اور تیاری شروع کر دی۔ چھٹے درجے کا طالب علم ہونے کے باوجود شعر یاد کرنے کے لیے تمام اساتذہ کے دیوان پلٹ ڈالے۔ نہایت مشکل حروف جیسے چ، ڑ، ث وغیرہ سے شروع اور ختم ہونے والے بہت سے اشعار یاد کر لیے۔ آخر کار مقابلہ ہوا اور وسیم کی ٹیم نے نویں جماعت کی ٹیم کو شکست دے کر کامیابی حاصل کر لی۔ اس کامیابی پر انہیں اس وقت ریاست رامپور کے وزیر تعلیم دیوکی نندن جی کے ہاتھوں انعام سے نوازا گیا۔ ان ہی دنوں وسیم نے عشرت مارہروی کا لکھا ہوا ایک سلام ''سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی'' پڑھنا شروع کیا۔ ان کی آواز میں ایسا درد تھا کہ جب وہ یہ سلام پڑھتے تھے تو لوگوں کے آنسو نکل آتے تھے اور پھر یہ حال ہوا کہ اسکول کی کوئی بھی محفل ان کے اس سلام کے بغیر اختتام پذیر نہ ہوتی تھی۔ وسیم کی ان خصوصیات نے انہیں اسکول میں نمایاں کر دیا۔ رامپور میں ہی پہلے پہل وسیم کو محبت کا تجربہ بھی ہوا جسے اس وقت وہ کوئی نام بھی دے سکنے سے قاصر تھے کیونکہ وہ کمسن تھے اور ان کا مشغلہ ناپختہ تھا۔ ان کے پڑوس میں دو لڑکیاں رہتی تھیں جو عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں وہ دونوں ہی وسیم سے بہت محبت کرتی تھیں، ان کا منہ دھلاتیں، بال سنوارتیں، سرمہ پاؤڈر وغیرہ لگا کر انہیں ہر وقت سجائے رہتیں۔ وسیم کو ان میں سے ایک بہت اچھی لگتی تھی اور وہ ہر وقت اس کا قرب چاہتے تھے کہ وہ اپنی اس خواہش کو کوئی نام دینے کا شعور نہ رکھتے تھے لیکن کوئی چیز تھی جو انہیں اس کی طرف کھینچے لئے جاتی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق بھی وسیم کو انہی دنوں پیدا ہوا۔ ان کے پڑوس میں افسر میاں نامی ایک صاحب رہا کرتے تھے جو شعر و شاعری کے بہت رسیا تھے۔ ان کے یہاں برابر شعرا کا آنا جانا رہتا اور شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں۔ وسیم نے سب سے پہلے ان کے یہاں ہی صبا افغانی کو سنا اور ان کے ترنم و کلام کے دلدادہ ہو گئے۔ انہی محفلوں میں بے تک رامپوری اور اس وقت کے دوسرے اساتذہ کو سننے کا موقع بھی ملا۔ اس زمانے میں شعری بھوپالی کی غزل کا بہت چرچا تھا جس کا ایک مصرعہ یوں تھا:

''ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی''

وسیم نے اس زمین میں ایک غزل لکھی جس کا ایک مصرعہ یوں تھا:

''عجب کچھ کشمکش میں پڑ گئی ہے زندگی اپنی''

یہ غزل وسیم کے پاس محفوظ نہیں اور ہزار کوشش کے باوجود اس غزل کا کوئی اور مصرعہ انہیں یاد نہ آ سکا۔ بہرحال وسیم نے یہ غزل اپنے والد صاحب کو دکھائی، وہ وسیم کو لے کر اپنے استاد جگر مرادآبادی کے پاس گئے۔ جگر صاحب نے وسیم کے اشعار سنے اور کافی حوصلہ افزائی فرمائی۔ یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کا ہے جبکہ وسیم کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ جگر ایسے استادِ وقت کی حوصلہ افزائی سے وسیم کو بہت سہارا ملا اور انہوں نے کچھ اور شعر بھی کہے مگر اپنی تعلیمی مصروفیات کے باعث یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

وہ دور وسیم کا نہایت تنگدستی کا دور تھا، والد صاحب کبھی کبھار آ جایا کرتے تھے، ان کی خود کوئی مستقل آمدنی نہ تھی لہٰذا وہ اپنے بیوی بچوں کی کفالت بھی نہ کر پاتے تھے۔ وسیم کے گھر کے سارے اخراجات ان کے نانا کی بھیجی ہوئی رقم سے پورے ہوا کرتے تھے۔ والدہ کی خودداری بار بار باپ کے سامنے دست طلب دراز کرنے سے گریز کرتی تھی لہٰذا جیسے تیسے بس گزر اوقات ہو رہی تھی۔ وسیم کو اس تنگدستی سے بڑے تلخ تجربات ہوئے۔ رامپور کے ایک بڑے مشہور ڈاکٹر کے فرزند سے وسیم کی اسکول میں دوستی ہو گئی۔ ایک روز وسیم اُسے اپنے گھر لے آئے۔ اس نے وسیم کا کچا گھر اور رہن سہن دیکھا تو وسیم کو اپنے برابر کا نہ پا کر ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور آئندہ کبھی وہ وسیم کے گھر نہ آیا۔ اس واقعہ سے وسیم کو بہت ٹھیس لگی اور ایک پرانے دوست کا بوجہ مفلسی کھو جانے کا بہت افسوس ہوا۔ وسیم اپنی اوائل عمری سے ہی بہت حساس تھے۔ اگر کوئی انہیں ذرا بھی ترچھی نظر سے دیکھتا تو وہ پھر اُدھر کا رخ نہ کرتے، اس کے برعکس جس جگہ ذرا سی بھی محبت ملتی وہ وہیں کے ہو

رہتے۔ان کے شدید احساس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے بچپن سے لے کرلڑکپن تک کتنے ہی سال انہوں نے عید کو نیا جوڑا صرف یہ سوچ کر نہ پہنا کہ دنیا میں جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو یہ نئے کپڑے نصیب نہیں ایسے میں انہیں بھی نئے کپڑے پہننے کا حق نہیں۔ بہرحال اسی کسمپرسی کے عالم میں وہ اپنی تعلیم جاری رکھے رہے اور رامپور میں ۱۹۵۰ء میں آٹھواں درجہ پاس کرلیا۔ وسیم کو رامپور سے آج بھی محبت ہے بچپن کی انگنت کھٹی میٹھی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔ وہ وہاں کے پانی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واقعی غالب نے رامپور کے پانی کے لیے ''پھیکا شربت'' کا نام بالکل صحیح استعمال کیا ہے۔

جب وسیم آٹھواں درجہ پاس کر چکے تو ایک روز ان کے نانا کا اپنی بیٹی کو حکم آیا کہ میں نے ساری جائیداد تمہارے نام لکھ دی ہے، تم سامان اور بچوں کو لے کر بریلی آجاؤ۔ حکم کی تعمیل میں وسیم اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ بریلی آگئے۔ یہاں آ کر انہوں نے گھر کے ماحول کو بے حد کشیدہ پایا۔ نانا اور ماموں میں بندوقیں کھنچی ہوئی تھیں۔ان کے ماموں اپنے والد کے اس غیر منصفانہ فیصلے سے سخت نالاں تھے۔ وسیم کی والدہ نہایت ایماندار اور صبر و قناعت والی خاتون تھیں۔انہوں نے اپنے بھائی کو تنہائی میں بلا کر کہا کہ بھیا میں خود بھی تمہارا حق مارنا نہیں چاہتی۔ شرعاً میرا جتنا حصہ بنتا ہو تم مجھے دے کر باقی جائیداد مجھ سے اپنے نام لکھا لو اور پھر ایک دن بغیر اپنے والد کو کچھ بتائے وہ کچہری جا کر اپنا حصہ لے کر باقی تمام جائیداد بھائی کے نام منتقل کرآئیں۔ جب اس بات کا پتہ ان کے والد کو چلا تو وہ بہت ناراض ہوئے لیکن بیٹی کے سمجھانے بجھانے سے آخرکار ان کی ناراضگی دور ہوگئی۔ وسیم کی والدہ کو حق دختری میں تحصیل نواب گنج کے مواضعات کریم اور رچھولا کفایت اللہ میں کچھ زمین اور گڑھیا محلہ میں واقع مکان کا بالائی حصہ ملا۔ وسیم اپنی والدہ کے ساتھ اسی مکان میں رہنے لگے۔ ان کی والدہ کے منصفانہ فیصلے اور بھائی سے محبت آمیز برتاؤ کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بھائی اپنی بہن اور اس کی اولادوں سے نہ صرف پدرانہ شفقت برتتے بلکہ ان کی سرپرستی بھی فرماتے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ وسیم کے پورے کنبے کی حیثیت اس گھر میں ثانوی رہی۔ ماموں ممانی اور ماموں زادوں کے ذریعہ وقت بے وقت بات بات پرانہیں ان کے کم مرتبہ اور ثانوی حیثیت کا احساس دلایا جاتا رہا جس کے باعث وسیم کے حساس ذہن میں یہ بات گھر کر گئی کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر پل رہے ہیں، ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کے ماموں زاد بھائی بہن اپنے باپ کے گھر میں رہ رہے تھے اس لیے وہ ہر چیز پر اپنا حق سمجھتے تھے جبکہ وسیم باپ کی سرپرستی سے دور تھے انہیں ہر وقت یہ احساس رہتا کہ یہ گھر ہمارے والد کا نہیں بلکہ نانا کا ہے۔ ان باتوں سے وسیم کا احساس اور بھی شدید ہوگیا۔ والد کے ہوتے ہوئے بھی جن بچوں کی پرورش ننہال کی چھت کے نیچے ہوتی ہے ان کے جو مسائل ہوتے ہیں وہ سب وسیم کو درپیش تھے۔ ان کی والدہ عظیم شخصیت کی مالک تھیں لہٰذا تمام تر خراب حالات کے باوجود وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر پورا دھیان دیتی رہیں اور ۱۹۵۱ء میں وسیم کو بریلی میں Boys Christian School میں نویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں وسیم نے اسی اسکول سے دسواں پاس کیا۔ اس اسکول میں دوران تعلیم وسیم نے گانوں اور ڈراموں وغیرہ میں بھی حصہ لیا، دراصل وہ کبھی بھی شرمیلے یا دبّو قسم کے لڑکوں میں نہیں رہے۔ جہاں بیٹھتے وہیں نمایاں ہو جاتے اور اپنے اوصاف سے اپنے اردگرد مداحوں کی تعداد بڑھا لیتے تھے۔ ان کے اردگرد رہنے والوں کو ان کی شخصیت کا لوہا ماننا ہی پڑتا تھا۔ جب وہ دسویں درجہ میں تھے تو ان کے والد کے کچھ شاگرد گھر پر پڑھنے آتے تھے۔ والد کے حکم سے وسیم ان لوگوں کو دسویں کا کورس پڑھاتے تھے۔ ان کے والد نے خود کو خدمت خلق کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ پندرہ بیس لڑکوں کا گروپ ڈرائنگ روم میں موجود رہتا، ان کے لیے کھانا گھر میں سے پک کر جاتا۔ وسیم کی والدہ جُز بُز بھی ہوتیں مگر وہ کہا کرتے، بیچارے غریب لڑکے ہیں، کہاں پڑھنے جائیں؟ وہ انہیں مفت پڑھاتے اور کھانا بھی کھلاتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں وسیم نے بریلی کے اسلامیہ انٹر کالج میں گیارھویں درجے میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۴ء میں یہیں سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد وہ بی اے میں بریلی کالج بریلی میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے بی اے پاس کیا۔ بی اے میں انگریزی میں انہوں نے بہت اچھے نمبر حاصل کیے لیکن جب وہ ایم۔اے۔ اردو میں داخل ہوئے تو انگریزی کے صدر شعبہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ انگریزی کا اتنا اچھا طالب علم اردو میں ایم۔اے کیونکر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ صدر شعبہ نے وسیم کو بہت سمجھایا اور کہا تم یہ کیا نادانی کر رہے ہو؟ اُردو کا اس ملک میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ انگریزی کا کنڈیڈیٹ اپنی ایک ایک جیب میں تین تین نوکریاں رکھے گھومتا ہے جبکہ اُردو والا نوکری کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور نوکری اس کے ہاتھ نہیں آتی۔ وسیم کے کچھ دوستوں نے بھی ان کا مذاق بنایا لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہے اور اُردو ہی پڑھتے رہے آخرکار جون ۱۹۵۸ء میں انہوں نے فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن میں ایم۔اے پاس کرلیا۔

بی۔اے سے ایم۔اے تک کا دور وسیم کے لیے نہایت صبر آزما دور تھا۔ نانا کا انتقال ہو چکا تھا، والد کی وہی درویشانہ روش تھی، ایسے میں وسیم خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔ کہیں سے کوئی امید دکھائی نہ دیتی تھی۔ نانی کے زمینداری کے کچھ بانڈ تھے جنہیں بھنا بھنا کر گھر کے اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے کیے جا رہے تھے۔ ان بانڈ کو بھنانے کے سلسلے میں ہی کچہری میں وسیم کی ملاقات انتقام الحسنین ایڈووکیٹ سے ہوئی، وہ کہنہ مشق اور استاد شاعر تھے۔ منتقم تخلص رکھتے تھے۔ آگے چل کر یہی ملاقات استادی شاگردی میں بدل گئی اور وسیم باقاعدہ منتقم صاحب کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ وسیم جب ایم۔اے فائنل کا امتحان دے رہے تھے تو ان کی مالی حالات اتنے خراب تھے کہ کالج میں ان کی فیس بھی جمع نہ ہو سکی تھی جس کے باعث امتحان میں بیٹھنے کا اجازت نامہ انہیں جاری نہ کیا جا سکا تھا، پیپر بانٹنے کی گھنٹی بج چکی تھی اور وہ کھڑے ہوئے بڑی

حسرت سے کلاس روم کو تک رہے تھے، اسی وقت ان کے اُردو کے استاد عثمان صاحب تشریف لائے اور جب وسیم کی پریشانی کا حال سنا تو دوڑے ہوئے پرنسپل کے پاس گئے، اپنی جیب سے فیس کی رقم جمع کر کے وسیم کو امتحان میں شامل کرایا۔ وسیم کبھی بھی عثمان صاحب کے اس احسان کو بھلا نہ سکے۔ بریلی کالج میں جب وہ شعبۂ اردو میں لکچرر بن کر آئے تو کئی مقامات پر عثمان صاحب صدر شعبہ کی رائے سے متفق نہ ہونے کے باوجود وہ کبھی ان کے سامنے زبان نہ ہلا سکے۔

ایم۔اے پاس کرنے کے ایک ماہ بعد ہی وسیم کا تقرر ٹیچر کی حیثیت سے سنبھل انٹر کالج سنبھل (مراد آباد) میں ہو گیا تھا۔ یہ تقرری بھی بڑی عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ کوئی غیبی طاقت تھی جس نے اٹھا کر انہیں سنبھل کالج میں بٹھا دیا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ درزی کے ہاں سے اپنی شرٹ سلوا کر لائے تھے یہ شرٹ جس اخبار میں لپیٹ کر دی تھی اُسی اخبار میں سنبھل کالج میں اردو ٹیچر کی جگہ کے لیے اشتہار تھا۔ وسیم نے اسے دیکھ کر اپنی درخواست وہاں بھیج دی اور انہیں انٹرویو میں بلا لیا گیا۔ انٹرویو سے پہلے ہی وہاں امیدوار طے ہو چکا تھا اور وہ امیدوار غالباً منصور سبزواری تھے۔ وہ مینجنگ کمیٹی کے ایک رکن کے قریبی رشتہ دار تھے۔ سنبھل اس وقت تک تحصیل تھا اور وہاں کے تحصیل دار و منصف مجسٹریٹ کو مینجنگ کمیٹی میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ انٹرویو میں وسیم کے علاوہ کوئی بھی امیدوار فرسٹ کلاس فرسٹ نہ تھا اور پھر انٹرویو میں وسیم نے جس اعتماد کے ساتھ سوالات کے صحیح صحیح جواب دئے اس نے منصف صاحب کو بہت متاثر کیا۔ نتیجہ یہ کہ سلیکشن کمیٹی کے دوسرے تمام افراد کی سخت مخالفت کے باوجود منصف صاحب اڑے رہے کہ اسی امیدوار کا تقرر ہونا چاہیے حالانکہ منصف صاحب غیر مسلم تھے، وسیم سے ان کی رشتہ داری کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا، شناسائی تک نہ تھی۔ لیکن وسیم کی قابلیت نے انہیں اس درجہ متاثر کیا کہ انہوں نے آخر میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس لڑکے کا تقرر نہ ہوا تو میں کمیٹی سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ منصف صاحب کے اس منصفانہ فیصلے کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور وسیم کا تقرر ہو گیا۔

سنبھل میں وسیم نویں کلاس کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے اور انہوں نے نویں کلاس کے نصاب میں شامل کئی انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اس وقت انہیں پچھتر روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس نوکری سے انہیں مالی فائدہ تو برائے نام ہی پہنچا لیکن ہاں ان کی شاعری میں نکھار سنبھل سے ہی شروع ہوا اور یہیں سے انہوں نے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت شروع کی۔ چونکہ وہ سنبھل میں ایک مقامی کنڈیڈیٹ کو مات دے کر آئے تھے لہٰذا کئی محاذوں پر انہیں آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان کے پائے استقلال میں کہیں بھی لغزش نہ آئی اور آخر کار انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ وہ سنبھل میں مقبول خاص و عام ہو گئے اور ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر رہنے لگے۔

اکتوبر ۱۹۵۹ء میں وسیم کا تقرر دہلی یونیورسٹی کے ہندو کالج میں ہو گیا۔ وہاں انہیں ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ ملا کرتا تھا جس میں انہیں دہلی ایسے شہر میں اپنے قیام و طعام کا انتظام بھی کرنا تھا اور گھر والوں کی کفالت بھی۔ اس سارے اخراجات کے لیے رقم ناکافی تھی، اس لیے وسیم سخت ذہنی الجھن کا شکار تھے۔ وہ صبح کو ناشتہ کر کے گھر سے نکلتے تھے اور پھر رات کو ہی کھانا کھاتے تھے۔ کرائے کے لیے پیسہ نہ ہونے کے سبب کئی میل پیدل چلا کرتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران ہی انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں Linguistic Course میں داخلہ لے لیا اور زبانوں کی تشکیل وارتقاء کے متعلق مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک سال تک مطالعہ کے باوجود وہ اپنی حاضری کم ہونے کے باعث اس کے امتحان میں نہ بیٹھ سکے اور سند حاصل نہ کر پائے لیکن ان کا یہ سال بیکار گیا ایسا بھی نہیں ہوا۔ انہیں اس مطالعہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ زبانوں کے متعلق ان کی معلومات میں بہت اضافہ ہو گیا جس نے انہیں شاعری میں بھی مدد کی۔ آج بھی وسیم مختلف زبانوں کی نمودِ اول سے صورتِ حال تک کی تاریخ پر بغیر رُکے بول سکتے ہیں۔ دہلی کی ملازمت کے دوران انہیں اس وقت کے مشہور و معروف شعراء جیسے جوش ملیح آبادی، گلزار دہلوی، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش وغیرہ سے نہ صرف ملاقات کا شرف حاصل ہوا بلکہ ان کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔

بریلی کالج بریلی کے شعبہ اردو میں تسنیم صاحب کے ریٹائر ہو جانے سے ایک جگہ خالی ہو گئی تھی جس کے لیے جون ۱۹۶۲ء میں انٹرویو ہوا۔ جس میں وسیم کا تقرر ہو گیا اور وہ ۱۶۔ جولائی ۱۹۶۲ء کو بحیثیت اردو لکچرر اس کالج کے شعبہ اردو سے جڑ گئے۔ ۱۹۷۹ء میں عثمان صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد وسیم کو شعبہ اردو کا صدر بنا دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی روہیل کھنڈ یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین مقرر کیے گئے اور اسی عہدے سے ۲۰۰۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

وسیم کی سوانح نامکمل رہے گی اگر اس میں ان جذباتی رشتوں کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے وسیم کی زندگی کو نت نئے حادثوں سے دوچار کر کے انہیں نئے نئے تجربات سے آشنا کیا۔ حسن پرستی وسیم کے مزاج میں شروع سے ہی شامل تھی۔ حسن انسانی ہو یا حسن فطرت وہ اس کے ہمیشہ سے شیدائی رہے ہیں جب اپنے بچپن میں وہ نانا کے گاؤں میں رہا کرتے تھے تو مناظر قدرت کا حسن انہیں بہت متاثر کرتا تھا۔ سورج کا نکلنا، چڑیوں کا چہچہانا، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی ہریالی، تالاب کا منظر وغیرہ انہیں سکون بخشا کرتے تھے۔ شام کو جب گاؤں کے گھروں میں گوبر کے کنڈے سلگتے تو ان سے اٹھنے والی ایک عجیب قسم کی مہک اُن پر بے نام سی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ وسیم جب رامپور منتقل ہو گئے تو وہاں اپنے پڑوس میں رہنے والی لڑکی کے محبت آمیز برتاؤ میں انہیں کشش محسوس ہوتی تھی لیکن اس وقت تک وہ عمر کے اس حصے میں تھے جہاں اس کشش کو سمجھ پانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جب وہ بریلی میں بوائز کرسچین اسکول میں داخل ہوئے تو یہاں انہیں ایک عیسائی لڑکی کے حسن نے اپنی طرف متوجہ کیا اس وقت ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی۔ یہ عمر بھی شعور کی پختگی کی عمر نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اس

محبت نے انہیں شعر کہنے پر مجبور کر دیا اور وہ شاعری میں اپنے دل کی بات بیان کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر چند کہ اس لڑکی سے ان کی کوئی تنہائی کی ملاقات نہ ہو سکی اور اگر ہوتی بھی تو اس وقت انہیں اتنا شعور کہاں تھا کہ محبت کرنے والوں کے لیے تنہائی کی ملاقات کتنی بڑی نعمت ہے ان کی یہ محبت یکطرفہ نہ تھی بلکہ وہ لڑکی بھی ان سے اتنی ہی محبت کرتی تھی لیکن کم عمری کے باعث اس محبت کے کوئی خاص اثرات ان کی شاعری پر نظر نہیں آتے۔ اس بچپن کی محبت کے بعد ایک دوسری لڑکی ان کی زندگی میں آئی اور یہ سلسلہ تقریباً تین برس تک چلا، اس وقت وسیم کی عمر ۱۵۔۱۶ کے درمیان تھی۔ یہ دورِ عمر کا نہایت نازک دور ہوتا ہے، بلوغت کی علامتیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور انسان میں نئے نئے ولولے جنم لے رہے ہوتے ہیں۔ وسیم بھی اس وقت محبت کے مفہوم سے واقف ہو چلے تھے اور ایک چہرہ ہر وقت ان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اسی دوران ان کی شاعری کی باقاعدہ شروعات ہوئی جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام ''تبسم غم'' کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ اس معاشقے نے انہیں ایک حوصلہ بخشا تھا اور اُن میں جینے کی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی محبت میں نہ ہی کسی رقیب کا تصور تھا اور نہ ہی ذات پات کی کوئی دیوار درمیان میں حائل تھی لیکن اچانک ہی ان کی محبوبہ کے گھر والوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر کے وسیم کی دنیائے سکوں خیز میں طوفان برپا کر دیا۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار تھے، دل کہتا تھا کہ بڑھ کر اپنی محبت کا ہاتھ تھام لیں لیکن ذہن سمجھاتا تھا کہ تم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اس وقت انٹر کے طالب علم تھے۔ نہ تو عمر شادی کی تھی اور نہ ہی گھر کے حالات ایسے تھے کہ ان کی امید بر آتی۔ بہرحال وہی ہوا جو روزِ اول سے محبت کرنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ ان کے دل سے زیادہ عزیز شے کو پڑوسی ملک کی سرحد نے اپنے اندر مقید کر لیا اور وسیم بے بسی سے اپنی دنیا لٹتی دیکھتے رہ گئے۔ ان کے اس معاشقہ کے اثرات کسی حد تک ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری میں اس محبت کے نقوش جابجا چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے پیار کی شکست سے دل شکستہ وسیم کی طرف جب ایک اور مہ جبیں نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا تو انہیں ان نگاہوں میں اپنی کھوئی ہوئی محبت کا نعم البدل نظر آنے لگا اور وہ بے اختیار اس جانب کھنچے چلے گئے۔ اس وقت تک وسیم کا شعور پختہ ہو چکا تھا اور وہ پیار کی ایک ایک ادا کے رمز آشنا ہو چکے تھے۔ ان کی یہ محبوبہ ان کے گھر بھی آتی تھی اور وسیم کی بہنوں سے اس کی دوستی تھی، اس لیے ملاقات میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ یہ محبت آنکھ سے دل میں اتر چکی تھی اور وسیم کے دل پر پوری طرح قابض ہو چکی تھی۔ آپس میں کتنے ہی عہد و پیمان ہو چکے تھے۔ اس معاشقے کی خاصی تفصیل وسیم کی نظم ''میری تصویر'' میں موجود ہے۔ یہ نظم اُسی دور کی تخلیق ہے اور وسیم کے پہلے مجموعہ کلام ''تبسم غم'' میں شامل ہے۔ وسیم کے اس معاشقے کا سلسلہ کافی طویل ہے۔ تقریباً آٹھ سال تک وہ اپنے اس پیار کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ بی۔ اے کی طالب علمی کے زمانے سے شروع ہو کر سنبھل کی نوکری تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اُس دور کی بیشتر غزلیات ان کے اسی پیار کے شب و روز کی ترجمان ہیں۔ آخر اس محبت کا انجام بھی ویسا ہی ہوا جیسا کہ عموماً ہوتا آیا ہے یعنی وسیم کی والدہ نے مختلف ذرائع سے وسیم تک یہ بات پہنچائی کہ وہ خاندان ہمارے برابر کا نہیں۔ اس خاندان میں کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کے باعث اپنے خاندان کی عزت پر بھی آنچ آئے گی، میری قطعی مرضی نہیں کہ تم اس گھر میں شادی کے متعلق خیال بھی کرو۔ وسیم کی والدہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں اور اگر وسیم اپنی ضد پر اڑ جاتے تو وہ اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے اس رشتہ پر رضامند بھی ہو سکتی تھیں لیکن وسیم نے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور اپنے خاندان کے وقار کو قائم رکھنے کی خاطر اپنی آرزوؤں کا خون گوارا کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہر چند کہ وہ ایسا کرنے میں بالکل ٹوٹ کر رہ گئے۔ ان کی شاعری کا ابتدائی حصہ زیادہ تر اسی محبت سے وابستہ حادثوں کی کہانی ہے۔ تقریباً سات برس تک یعنی ۱۹۶۷ء تک وسیم اپنی اسی لٹی ہوئی محبت کی یاد کو سینے سے لگائے اپنے دل کا سارا زہر شاعری کی شکل میں کاغذ پر انڈیلتے رہے۔ شاید قدرت کو ان پر ایک مرتبہ پھر رحم آ گیا اور اس نے کچھ عرصہ کے لیے انہیں ایک رفیق پھر عطا کر دیا۔ ۱۹۶۷ء میں ان کی ملاقات ایک غیر مسلم لڑکی سے ہوئی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور ایک بڑے آفیسر کی بیٹی تھی وہ وسیم کی شاعری کی دلدادہ تھی اور صرف ان کی شاعری کو سمجھنے کی غرض سے اس نے اردو سیکھی تھی۔ وسیم سے روز بروز اس کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ وہ سمجھدار، باشعور اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی حسن کا لاجواب شاہکار تھی۔ وسیم کو وہ دیوانگی کی حد تک پیار کرتی تھی، وسیم بھی اس کے پیار میں پچھلی محبتوں کی ساری تلخیاں بھول چکے تھے اور گلے گلے تک اس عشق میں ڈوبے ہوئے تھے کہ تقدیر کو ایک بار پھر شرارت سوجھی اور اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ کر دی گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے اپنے ماں باپ کی عزت کی خاطر ڈولی میں بیٹھنا ہی پڑا لیکن سسرال جا کر بھی وہ وسیم کو فراموش نہ کر سکی اور برابر اُن سے خط و کتابت کرتی رہی۔ وہ جب بھی کبھی اپنے میکے آتی تو وسیم سے ضرور ملتی۔ آخر کار اس کا یہ دیوانہ پن اس کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوا اور ایک سال کے اندر ہی شوہر سے طلاق لے کر وہ میکے چلی آئی۔ محبت ایثار چاہتی ہے اور اس نے اس ایثار کا مظاہرہ کر دیا تھا، اس مظاہرے نے عشق میں اور بھی گرمی پیدا کر دی اور اب اس سے ملنا وسیم کا روز کا معمول بن گیا۔ جب اس سے وسیم کا ہر روز مل کر بچھڑ جانا برداشت نہ ہوا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسلام قبول کر لے گی اور پھر کبھی نہ بچھڑنے کے لیے وسیم کے پاس چلی آئے گی۔ وسیم کی کشمکش کا عجیب عالم تھا۔ خاندان کی عزت کا پاس، والدہ کی خواہشات کا احترام، اپنی شاعرانہ شہرت کا احساس اور درس و تدریس کے باوقار پیشے سے جڑے ہونے کا خیال انہیں اس کام سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا تو دوسری طرف دل سارے اصول، سب مصلحتیں اور سماج کے سبھی بندھنوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی اس محبوبہ کو شریک زندگی بنا لینے پر بضد تھا۔ دونوں صورتوں میں شرمندگی ہی ان کا مقدر تھی۔ اگر خاندان و سماج کا خیال کر کے ترک تعلق کرتے تو عمر بھر اپنی

محبت سے پشیمان رہتے اور بے وفا کے نام سے پکارے جاتے اور اگر اپنی وفاؤں کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اپنی محبت کو اپنا لیتے تو عمر بھر خاندان اور سماج کے سامنے شرمسار رہنا پڑتا۔ قدرت کو شاید ان کی اس بیچارگی پر ترس آ گیا اور اُس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وسیم کو نہ ادھر شرمندہ ہونا پڑا اور نہ اُدھر بے وفائی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا۔ ہوا یوں کہ اپنی بیٹی کے مذہب تبدیل کرنے کے فیصلے کی خبر جب باپ کو ملی تو انہوں نے کچھ معتبر ذرائع سے وسیم کو کہلا بھیجا کہ سارے شہر میں یہ مشہور ہو چکا ہے کہ آپ کی وجہ سے میری بیٹی نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی، اب اگر اس نے مذہب تبدیل کر کے آپ کا ہاتھ تھام لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا اور پھر خودکشی کے علاوہ میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا۔ وہ نہایت سمجھ دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ دور رس نگاہ بھی رکھتی تھی۔ ایک روز اس نے وسیم سے کہا کہ میں تم سے زیادہ تمہارے اندر کے شاعر کو پیار کرتی ہوں اور اس شاعر کو کسی قیمت پر مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ اگر ہم دونوں نے شادی کر لی تو اس کے اثرات تمہاری شاعرانہ حیثیت پر بہت برے ہوں گے۔ پھر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ شاعر کو اگر اس کا محبوب ہمیشہ کے لیے مل جائے تو پھر اس کی شاعری میں وہ آگ نہیں رہتی۔ مجھے حاصل کرنے کے بعد تمہاری شاعری میں نہ یہ اثر باقی رہے گا اور نہ ہی سوز و گداز۔ تمہارے اندر کا شاعر ختم ہو جائے گا اور یہ مجھے قطعی گوارا نہیں، لہٰذا میں تمہاری شاعری کو جلا بخشنے کی خاطر اپنی محبت قربان کرنے کو تیار ہوں، میں تمہیں تا زندگی پیار کرتی رہوں گی لیکن آج کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ ملیں گے۔ اس دن کے بعد سے وسیم اپنی اس محبوبہ سے آج تک کبھی نہ ملے۔ یہ وسیم کا آخری عشق تھا۔ وسیم کی اس آخری محبت کے تذکرے میں کوئی جگہ عشق کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، دراصل میرے نزدیک محبت اور عشق ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ وسیم کے پہلے کے سبھی جذباتی رشتوں کو میں صرف محبت کا نام ہی دے سکتا ہوں لیکن یہ آخری فسانہ فسانۂ عشق کہنے جانے کا مستحق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاشقے میں جنون کی ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو صرف اور صرف عشق کا طرۂ امتیاز ہے۔ کسی لڑکی کی چاہت میں اس کی شادی ہو جانے کے بعد بھی کوئی کمی نہ آنا، وسیم ایسے خوددار شخص کا اپنی محبوبہ کے ایک برس تک دوسرے کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنے کے باوجود اسے اتنی ہی شدت سے پیار کرنا، اس بات کا غماز ہے کہ وہ اس سے محبت نہیں بلکہ عشق کرتے تھے۔ اگر یہ صرف محبت کا معاملہ ہوتا تو شادی کے ساتھ ہی دفن ہو چکا ہوتا۔ اس عشق نے وسیم کو مالی طور پر کافی نقصان بھی پہنچایا کیونکہ ان کی ہر شام اپنی معشوقہ کے ساتھ کسی نہ کسی ریستوران میں گزرتی تھی۔ وہ اس وقت بریلی کالج کی ملازمت میں آ چکے تھے۔ آمدنی معقول تھی۔ کالج کے علاوہ مشاعروں سے بھی مالی مدد مل رہی تھی، اس لیے بے دریغ خرچ کر رہے تھے۔ گولڈ فلیک ایسی مہنگی سگریٹ کے کئی کئی پیکٹ روز پی جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے دوسرے مشاغل پر بھی خرچ ہو رہا تھا۔ اس سے یہ مطلب نکالنا چاہیے کہ ان کی محبوبہ کی نظر ان کی جیب پر تھی اور اسی کے ایماء پر یہ سب اخراجات ہو رہے تھے۔ وہ تو خود باحیثیت تھی اور وسیم کے آنے سے قبل ہی ان کے لیے کھانے پینے کی دوسری اشیاء کے علاوہ سگریٹ کے پیکٹ بھی منگوا کر رکھ لیتی تھی اور حتی الامکان خود خرچ کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن پھر بھی سیر و تفریح پر وسیم کا خرچ تو ہوتا ہی تھا۔ وہ وسیم کے اشعار کی محض تعریف ہی نہیں کرتی تھی بلکہ اکثر ان کے اشعار کے کمزور پہلوؤں پر تنقید بھی کرتی تھی اور کہتی تھی فلاں خیال آپ کی شاعری کے رنگ سے میل نہیں کھاتا۔ یہ انداز آپ کو زیب نہیں دیتا وغیرہ وغیرہ۔ اس عشق سے بہرحال وسیم کی شاعری کو بہت فائدہ پہنچا لیکن کبھی کبھی یہی عشق ان کی شاعرانہ حیثیت کو مجروح کرنے کا باعث بھی بنا۔

ایک مرتبہ وسیم علی گڑھ یونیورسٹی کے مشاعرے میں جا رہے تھے۔ ان کی معشوقہ بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہو لیں۔ مشاعرہ گاہ میں یونیورسٹی کے لڑکوں نے وسیم اور ان کی معشوقہ کے رشتوں کی وہ کہانی پڑھ ڈالی جو ان دونوں کے چہروں پر لکھی تھی اور محض اسی وجہ سے وسیم کا کلام سنجیدگی کے ساتھ نہ سنا گیا، انہیں وہاں ہوٹ کیا گیا۔ وسیم کی یہ معشوقہ آج بھی بریلی شہر میں موجود ہے لیکن ملاقات کے مواقع میسر ہونے کے باوجود وسیم اس سے کبھی نہیں ملتے۔

غالباً اُس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ وسیم کے ذہن میں اب سے پہلے کا وہ حسین چہرہ محفوظ ہے جس کے نور سے ان کی شامیں روشن رہا کرتی تھیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس حسن میں وہ دلکشی باقی نہ رکھی ہوگی اور زمانے کے تغیرات اس چہرے پر ضرور عیاں ہوں گے۔ اگر اب وہ اپنی اس معشوقہ سے ملے تو وقت کے ہاتھوں اس کے حسن کا ڈھلتا ہوا روپ ان کے اس حسین تصور کو پاش پاش کر دے گا جو وہ برسوں سے اپنے دل، ذہن اور نگاہ میں لیے بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اس انکار کے پس پردہ یہ خوف بھی ہو کہ وہ اُس سے مل کر خود کو سنبھال نہ سکیں اور ملاقاتوں کا سلسلہ طول پکڑ جائے جو آج ان کی ازدواجی زندگی کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

یہاں تک تو وسیم کے ان معاشقوں کا ذکر تھا جن میں دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی۔ لیکن کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن سے وسیم کی حسن پرست طبیعت کا سراغ ملتا ہے۔ وسیم کا کہنا تو یہی ہے کہ ان کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کا کوئی بھی عشق صرف ان کی طرف سے رہا ہو اور دوسری طرف سے اس کا کوئی جواب نہ ملا ہو۔ لیکن میری اپنی تحقیق کے مطابق وسیم کی زندگی میں ایسے مقام بھی آئے ہیں جب جنس مخالف کے حسن نے ان کو اپنی طرف کھینچا ہے اور وہ اس سمت کو بڑھے ہیں لیکن دوسری طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی جس کے باعث وہ سلسلے ایک دو ملاقاتوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔

وسیم نے اپنے اس آخری عشق میں زخم کھانے کے بعد کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ۱۹۷۵ء میں ان کی والدہ سخت علیل ہو گئیں اور انہوں نے وسیم سے کہا کیا تم میری خواہش پوری نہ کرو گے کہ میں اپنی بہو کا منہ دیکھ

سکوں۔ وسیم نے ان کے حکم سے مجبور ہو کر شادی کے لیے ہاں کر دی۔ جب لڑکی کے متعلق ان کی پسند کے بارے میں پوچھا گیا اور کچھ لڑکیوں کے فوٹو انہیں دکھائے گئے تو انہوں نے کہا میں شادی اپنے لیے نہیں بلکہ امی کی خوشی کے لیے کر رہا ہوں، اس لیے یہ سارے معاملات مکمل طور پر اُن ہی پر چھوڑتا ہوں، وہ جہاں چاہیں شادی کر دیں۔ بالآخر ۱۹۷۵ء میں ۷۔نومبر کو ان کی شادی میرٹھ کے زبیری خاندان میں کر دی گئی۔ ان کی بیوی کا نام نکہت ہے۔ وہ جتنی خوبصورت ہیں سیرت میں بھی اتنی ہی اچھی ہیں۔ علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ انہیں نہ صرف شاعری کا شوق ہے بلکہ شعر فہمی بھی ان میں موجود ہے۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں انہوں نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں اور وسیم کو اپنے اوقات اپنے طور پر استعمال کرنے میں پوری پوری مدد دیتی ہیں۔ وسیم کے تین بچے ہیں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بیٹیوں کے نام ناصرہ وسیم اور منزہ وسیم ہیں اور بیٹے کا نام موزوں وسیم ہے۔ بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔ ان کے تینوں بچے فرماں بردار اور بااخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہیں۔ اپنے اپنے کالج میں اپنی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے نمایاں رہے ہیں۔ ان کے اخلاق حسنہ سے پتہ لگتا ہے کہ ان بچوں کی تربیت میں ایک سلیقہ مند ماں کا ہاتھ ہے۔

وسیم ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان میں اور ان کی اہلیہ میں بہت اچھی Understanding ہے۔ اپنی مشاعروں کی مصروفیات اور سماجی خدمات کی وجہ سے وسیم گھر میں بہت کم وقت دے پائے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہے۔ نہ صرف یہ کہ بچوں کے کالج میں ان کے اساتذہ سے بچوں کی تعلیم کے بارے میں معلومات کرتے رہتے تھے بلکہ گھر پر ٹیوٹر سے بھی بچوں کی تعلیمی کارکردگی کے متعلق اکثر بات کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ ان کا بیٹا ایک کامیاب انجینئر ہے بلکہ بیٹیاں بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایک کامیاب انسان، مشہور و معروف شاعر، ذمہ دار شوہر اور مثالی والد ہیں۔ ایک مثالی باپ کی ذمہ داریاں انہوں نے بخیر و خوبی نبھائی ہیں۔ اپنے تینوں بچوں کی شادیاں معزز اور باوقار خاندانوں میں کی ہیں۔ ان کے تینوں بچے اپنی ازدواجی زندگی سے خوش اور مطمئن ہیں۔ وسیم صاحب خیر سے نانا بن چکے ہیں لیکن انہوں نے خود کو اتنا سنبھال کر رکھا ہے کہ آج بھی مشاعرہ گاہ میں وزدیدہ نگاہیں ان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

نوٹ: وسیم صاحب صرف نانا ہی نہیں بلکہ دادا بھی ہو چکے ہیں۔

''زمانے کی گرد''

1992ء کی آخری تاریخوں کی کوئی رات تھی، کراچی کے مشہور ادب نواز صنعت کار کے گھر مشاعرہ تھا۔ جس میں پاکستان کے علاوہ بھارت سے آئے ہوئے شعراء بھی شریک تھے۔ ہمارا گروپ اس روز زیادہ ہی ترنگ میں تھا۔ کوئی بھی شاعر ہماری داد بے داد سے بچ نہیں پا رہا تھا۔ جب پروفیسر وسیم بریلوی پڑھنے آئے اور انہوں نے اپنی غزل شروع کی:

ملی ہواؤں میں اڑنے کی وہ سزا یارو
کہ میں زمین کے رشتوں سے کٹ گیا یارو

تو ہمارے گروپ کی داد نے گویا انہیں آسمان تک اڑا دیا۔ پھر انہوں نے میری طرف تخاطب کرتے ہوئے:

میرے قلم پہ زمانے کی گرد ایسی تھی
کہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہ لکھ سکا یارو

مجھے وسیم بریلوی کی اس غزل کے ہر شعر نے بہت متاثر کیا۔ اگلے دن میں نے انہیں فون کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے انٹرویو کے لیے وقت مانگا تو طے پایا کہ فوٹو گرافر کے ساتھ دوسرے دن ہم ان کے قیام گاہ پہنچ جائیں۔ انٹرویو سے پہلے ہم نے ثبوت کے طور پر وسیم صاحب کو ان کے کچھ اشعار سنائے تو وہ حیرانی سے بولے کہ ''اتنے عرصے سے آپ میری شاعری کے مداح ہیں اور انٹرویو کرنے اب آ رہی ہیں۔'' جواب میں مَیں نے کہا ''دراصل میں ہوم ورک کر رہی تھی'' میرا جواب سن کر پہلے وسیم صاحب حیران ہوئے پھر خوشی سے بولے آپ صحافتی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے چھان بین کے ساتھ انٹرویو کرتی ہیں جو واقعی قابلِ داد ہے۔

1992ء کا ہی ایک واقعہ ہے مشاعرے کے اختتام پر تاخیر بہت ہو گئی تھی سواری کا مسئلہ درپیش تھا۔ وسیم بریلوی صاحب نے میرے چہرے پر لکھی پریشانی پڑھ کر مجھے اور میرے ساتھی فوٹو گرافر کو یہ کہہ کر خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا کہ آپ دونوں میرے ساتھ چلئے۔ غرض وسیم سے جڑی ایسی بہت سی یادیں میرے لیے خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے میں بہت کچھ سیکھتی ہوں۔

حمیرا اطہر

عصرِ حاضر کے زخموں کی گواہی

پروفیسر محمد حسن
(•)

وسیم بریلوی کے مزاج کی پہچان ہے وارفتگی اور وارفتگی پیدا ہوتی ہے عرفانِ غم سے۔ وسیم شعر کہتے ہیں تو ڈوب کر اور لفظوں کو برتتے ہیں تو ترنم اور روانی کے پیشِ نظر، اسی لیے اُن کی شاعری تغزل کا لہجہ اختیار کرتی ہے جو ان کی ذات اور زمانے دونوں سے پیوست ہے۔ وہ روایت سے منحرف ہیں نہ منکر۔ اپنے ذاتی تجربات واحساسات کے لیے جب روایتی سانچوں کو ناکافی پاتے ہیں تو اُن کی توسیع بھی کرتے ہیں اور اُن میں مناسب اضافے بھی اور اس راہ میں بھی وارفتگی ہی اُن کی رہنما ہے۔

غم کو دولت بیدار سمجھنا ہماری شعری روایت ہے۔ بعض نے اس کا رشتہ تصوف سے جوڑ لیا۔ بعض نے قنوطیت کے فلسفے سے مگر وسیم نے غم کو نئے زاویے سے دیکھا ہے۔ یہ زاویہ شخصی اور ذاتی بھی ہے اور عصری بھی۔ اُن کے زمانے کا غم محض ''وجود'' سے متعلق ہے نہ محض ازلی گناہ کے تصور سے بلکہ انسان کے اُن کُہن سال ملالوں سے ابھرا ہے جو خواب اور شکست خواب کے دوہرے عمل میں مضمر ہیں۔

وہ خوابوں کی گزرگاہوں کے اُجڑنے کا غم ہے جس سے ہر حساس انسان گزر رہا ہے۔ ''تراشیدم، پرستیدم، شکستم'' کا دلدوز صدمہ ہے جو غزل میں زمزمہ بن کر پھوٹ بہتا ہے کہ اگر نغمہ نہ بنے تو زہر بن جائے۔ وسیم اس احساس محرومی اور شکست آرزو کے زہر کو شہد کی طرح پیتے ہیں اور اس سے انوکھے پھول اور البیلے ست رنگی ستارے بکھرتے جاتے ہیں۔

بیشک وسیم کے شعر تہہ دار ہیں اور اُن کی تشریحیں مختلف طرز میں کی جاسکتی ہیں۔ اُن کے ہاں اس قبیل کے شعر بھی ہیں جن پر اہل تصوف اپنا تصرف جمائیں گے۔ مثلاً:

جو تجھ میں مجھ میں چلا آرہا ہے برسوں سے
کہیں حیات اِسی فاصلے کا نام نہ ہو

ایسے اشعار کی تشریح بھی صوفیانہ کے علاوہ دوسرے پیرائے میں بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غزل کے رمز وایماء کو وسیم اس انداز سے برتتے ہیں کہ ہر علامت چوکھی ہو جاتی ہے اور اس کی تعبیر غم کی طرح مختلف زاویوں سے کی جاسکتی ہے بڑی بات یہی ہے کہ غزل کا شعر غم کے سہارے نئی بصیرتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور یہ محض خشک فلسفیانہ بصیرت نہیں بلکہ شعری کیف اور جمالیاتی نشاط کے وہ لمحے بخشتی ہے جو شاعری کا اصلی مقصد ہوتا ہے۔

وسیم کی شاعری عصر حاضر کے زخموں کی گواہی ہے ایسی آوازیں جو دل دوز بازگشت چھوڑ جاتی ہیں ان کے اندرون میں وہ روح کو پگھلانے والے حادثات اور احساسات ہیں جن میں دکھ اور دردمندی کے سمندر انگڑائیاں لیتے ہیں۔ غزل کے ست رنگی اظہار میں احساس وادراک کی چند جھلکیاں ہی کھل کر بیان ہو پاتی ہیں جو رہتا ہے وہ کیف سے بھرپور اور کیفیت سے بے خبر۔

اس شاعری کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں زندگی کو روشنی اور حرارت سے پیار مگر اسے حاصل کرنے کے وسائل محدود بلکہ مسدود ہیں اس اعتبار سے دیکھو تو یہ ہمارے دور کی سب سے بڑی محرومی ہے جو جینا اور سانس لینا تو چاہتی ہے تاکہ پورا معاشرہ ایک صحت مند وحدت کی طرح سانس لے سکے مگر اس پر ایسی محرومیوں اور نارسائیوں کا بوجھ ہے جو اسے غم کا ایسا عرفان بخش دیتی ہے جو شاید کامیابی اور کامرانی سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور جس کے ناآسودہ خواب مستقبل کی اساس ہیں۔ یہ دکھ وہ ہیں جن سے آنے والے دور کے خواب اور ارمان بنتے ہیں اور نئے تصورات جنم لیتے ہیں اور جن کے چراغ حساس فنکاروں کے خونِ جگر سے روشن ہوتے ہیں کیونکہ وہی اس بلیغ اور ان کہی خاموشیوں کو مبہم سی سہی مگر زبان دے سکتے ہیں۔ وسیم نے ان اَن دیکھے خوابوں کو جستہ جستہ بیان کرنے یا انہیں پانے کی جرأت کی ہے اور یہ جرأت محض شاعر کی ذات تک محدود نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شاعر محض اس کے لیے ایک وسیلۂ اظہار ہے اور یہ کیفیت وہ ہے جو اس کی ذات سے باہر آکر پورے دور کی حسیت کا احاطہ کرتی ہے۔

مبارک ہے وسیم بریلوی کی شاعری جس نے اپنی ذات کی دیواروں کو اتنا بلند نہیں کیا کہ چاروں طرف بکھری ہوئی زندگی کی آہ وفریاد، احساس وادراک، اس کے شاعرانہ وجود تک نہ پہنچ سکے بلکہ یہ قربانی بھی دے کر اپنی آواز کو عصر حاضر کے دکھ درد میں اس طرح سمو دیا ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ عصر کہاں اور کس حد تک اظہار پاتا ہے اور شاعر کی اپنی ذات اور اس کے داخل کی واردات کہاں اور کس حد تک دخیل ہوتی ہے اور یہی سچائی جہاں کامیاب ہوئی وہاں ان کی آواز کی دل گرفتگی اور خیال خیزی اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ کلام وسیم کا ہوتا ہے اور جذبہ اور کیفیت سننے اور پڑھنے والے کی اور یہی سچائی وسیم کے فکر وفن کی اساس ہے۔

وسیم کی شاعری کی تین پرتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے صرف اشارے میں ہی یہ بات کہی بھی جاسکتی ہے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ شاعری بلکہ اس کا تقریباً ہر مصرعہ وسیم کی اپنی سرگزشت ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس شاعری کے اکثر اشعار پر اس دور کی مہریں لگی ہوئی ہیں جو ملک پر انتہائی فرقہ پرست جماعتوں اور ان کے اقتدار میں رہنے بلکہ ان کے زیر فرمان رہنے سے گزری ہے اور اس بے زبانی کو وسیم کی شاعری نے شاعری ہی کی سہی مگر زبان دی ہے، وسیلۂ اظہار بخشا ہے اور گویا جبر سے دبے کچلے سینوں سے کچھ بوجھ کم ہوا ہے۔

فرقہ پرست جماعتوں نے اس زمانے میں جو ننگا ناچ دکھایا ہے اس

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ کیجیے

''دل کی اہمیت کیا ہے''

پروفیسر آفاق صدیقی
(کراچی)

وسیم بریلوی کربِ آ گہی کے شاعر ہیں مگر شعورِ آ گہی کو تو شاعری نہیں کہتے۔ یہ تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ ہزاروں لاکھوں شاعر شاعری کو اپناتے ہیں لیکن کیا شاعری بھی سبھی کو اپناتی ہے؟ اس سوال کا جواب فی الوقت نہ دے سکوں گا کیونکہ اپنی بے پناہ عدیم الفرصتی کے باوجود تھوڑا سا وقت ملا ہے اس میں چند معروضات وسیم کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں پیش کر رہا ہوں، جن سے نصف ملاقاتوں کا سلسلہ تو ادبی جریدوں کے حوالے سے خاصا پرانا ہے البتہ روبرو ملاقات شہر قائد کراچی کے عالمی مشاعرے میں قریب قریب پندرہ برس پہلے ہوئی پھر اسی حوالے سے ملاقاتوں کا تسلسل جاری ہوا اور دو ایک مرتبہ بیرون پاکستان بھی بڑے قریب سے دیکھنا اور سنا۔ شعری مجموعہ ''آنکھ آنسو ہوئی'' شاعر موصوف نے عطا کیا۔ مطالعہ میرا عشق بھی اور مجبوری بھی۔ یہ وبائے خاص ستر برسوں سے جان کو لگی ہوئی ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی یوپی کے شہر مین پوری میں جگر صاحب کو دیکھا اور سنا تھا۔ اس زمانے میں شاعر ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ موزوں طبع تو آغوشِ مادر سے تھا۔ نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ شعر کہنے لگا اور ۱۹۴۲ء میں شریک مشاعرہ ہوا۔ اچھی خاصی داد ملی اور پھر بڑے معرکے سر کیے۔ طالب علم شاعر کی حیثیت سے انعامات بھی پائے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے رابطہ ہوا۔ برطانوی حکومت کے ''وی فار وکٹری'' کے مشاعروں میں شہرت کے ساتھ چٹکی بھر دولت بھی ملی۔ آگے چل کر مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے پلیٹ فارم سے تحریک پاکستان کی پیش رفت میں منظومات کا جادو جگایا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں تن تنہا پاکستان کا رُخ کیا اور شاعری میں ادھر بھی خوب نام کمایا مگر پچھلے بتیس برسوں سے ترجیحات کچھ اور ہو گئیں۔ برقی ذرائع ابلاغ اور پرنٹ میڈیا کے لیے نثر نگاری کی ترغیب نے شاعری سے اور مشاعروں سے کافی حد تک بے نیاز کر دیا۔ اب شاعری پڑھتا بہت ہوں، سننا اور جانا کم ہوتا ہے وہ بھی کبھی کبھی۔

ذاتی حوالے سے جو کچھ عرض کیا اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وسیم فہمی کی فضا ہموار ہو جائے خصوصاً اس پیارے شاعر کے ان قارئین کو راقم الحروف کی بابت بھی کچھ معلوم ہو سکے جو بھارتی کہلاتے ہیں۔

وسیم بریلوی میرے نزدیک اچھے شاعر ہی نہیں اچھے آدمی بھی ہیں۔ عوائد رسمیہ سے بخوبی واقف، حفظ مراتب کے سلیقے سے برتنے والے اور متبسم چہرے مہرے سے خلوص و محبت کا اظہار کرنے والے، مشاعروں کے بڑے کامیاب شاعر جن کے ڈنکے دنیا کے ہر اس ملک میں بج رہے ہیں جہاں شاعر اور مشاعرے موجود ہیں۔ کہنے کو تو یہ گیت بھی بڑے من موہنے لکھتے ہیں اور بہت ہی سریلی آواز میں سناتے ہیں۔ پابند اور آزاد نظموں کے بھی شاعر ہیں تاہم یہ شعری مجموعہ جس کا ذکر آ چکا ہے بنیادی طور پر غزلوں کا ہے اس لیے بات اردو شاعری کی آبرو یعنی غزل اور غزل گوئی کے حوالے سے ہوگی اور اس سلسلے میں سب سے پہلے چند اپنی پسند کے اشعار پیش کر رہا ہوں۔

شرافتوں کی یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں
کسی کا کچھ نہ بگاڑو تو کون ڈرتا ہے

☆

اس زمانے کا بڑا کیسے بنوں
اتنا چھوٹا پن مرے بس میں نہیں

☆

اصولوں پر جہاں آنچ آئے ٹکرانا ضروری ہے
جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے

☆

اسے تو توڑنا آتا تھا اس نے توڑ دیا
وہ جانتا ہی نہیں دل کی اہمیت کیا ہے

☆

محبت کے یہ آنسو ہیں انہیں آنکھوں میں رہنے دو
شریفوں کے گھروں کا مسئلہ باہر نہیں جاتا

☆

جانے کیا ہو گئی اس کی معصومیت
اب یہ بچہ دھماکوں سے ڈرتا نہیں

☆

میں نے مدت سے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے
ہاتھ رکھ دے مری آنکھوں پہ کہ نیند آ جائے

☆

پتنگ جیسا یہ اڑنا بھی کوئی اڑنا ہے
کہ اڑ رہے ہیں مگر دوسروں کے ہاتھ میں ہیں

☆

خوشی کی آنکھ میں آنسو کی بھی جگہ رکھنا
برے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے

ان اشعار کے مجموعی تاثر کا اظہار کربِ آ گہی کا آئینہ دار اور جدید حسیت کی پیکار کا دلفگار ہے۔ فراق کے الفاظ میں آپ اسے ''آ گہی اور شعور کی تہوں کا جائزہ کہہ سکتے ہیں'' یا ڈاکٹر محمد حسن کی تائید کرتے ہوئے ''غم کے سہارے نئی بصیرتوں تک رسائی''۔

وسیم نے تخلیق کار کی حیثیت سے بذاتِ خود اپنی شاعری کی نوعیت کا

تعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سماجی ناہمواریوں کا تلخ تاثر تخلیقیت پر اس قدر حاوی ہے کہ پیار کی نغمگی پس پشت جا پڑی ہے۔ ایسے میں لفظی بازی گری سے ہٹ کر واقعیت کی زمین سے جڑے رہ کر اپنی ہی شرط اظہار کے ساتھ پیش کرنا خون تھوکنے سے کسی طرح کم نہیں۔''

واقعی وہ شرافتوں کے زمانے اب کہاں جب ہر طرف ہمارے معاشرے میں رواداری، باہمی ہمدردی اور آپس میں پیار محبت کے رشتے تھے وہ جگر اور حسرت موہانی جیسے غزل گو شاعروں کا دور تھا لیکن بیسویں صدی کے نصف سے اب تک جو انتشار کا دور دورہ رہا ہے اس میں جگر صاحب کا یہ کہنا درست محسوس ہوتا ہے کہ:

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

لیکن کیا صنف غزل کی نشو و نما اور ارتقائی عمل میں یہی روایتی بازگشت اور حسن و محبت کی والہانہ ایمائیت تمام تر رموز و نکات کے باوجود آشوب آگہی کا ساتھ دینے کی سکت رکھتی ہے؟ میرا خیال تو اس سلسلے میں فراق گھورکھپوری کے اس شعر کا ہم نوالہ ہے کہ:

عشق کی آزمائشیں ایسی فضاؤں میں ہوئیں

پاؤں تلے زمین نہ تھی سر پہ یہ آسماں نہ تھا

وسیم ادب لکھتے ہی نہیں اعلیٰ سطح پر ادب پڑھاتے بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب شہر قائد کراچی کے عالمی مشاعروں اور جہانِ تازہ کے بیشتر تہذیبی خطوں میں ان کی شخصیت اور شاعری کے قدرداں موجود ہیں تو اپنے دیس کے شائقین شعر و ادب کے ساتھ ساتھ شاگردانِ عزیز میں بھی بہت مقبول ہوں گے۔

مشاعروں کے حوالے سے بے پناہ شہرت و مقبولیت کا سبب کچھ یوں ہے کہ جب ان کی باری آتی ہے تو حاضرین کی تعداد چاہے سینکڑوں میں یا ہزاروں میں ہو یہ بڑی خندہ پیشانی سے مائک پر پہلے کچھ اشعار یا قطعات ایسے سناتے ہیں جو سادہ و عام فہم زبان میں ہوں اور جن کا نفسیاتی تعلق عمومی احساسات و جذبات سے ہو۔ مثال کے طور پر دو تین اشعار:

نئی عمروں کی خود مختاریوں کو کون سمجھائے

کہاں سے بچ کے چلنا ہے کہاں جانا ضروری ہے

بہت بیباک آنکھوں میں تعلق ٹک نہیں پاتا

محبت میں کشش رکھنے کو شرمانا ضروری ہے

تھکے ہارے پرندے جب بسیرے کے لیے لوٹیں

سلیقہ مند شاخوں کا لچک جانا ضروری ہے

☆

کیا بتاؤں کیسا خود کو دربدر میں نے کیا

عمر بھر کس کس کے حصے کا سفر میں نے کیا

تو تو نفرت بھی نہ کر پائے اس شدت کے ساتھ

جس بلا کا پیار تجھ سے بے خبر میں نے کیا

فرمائشیں زور پکڑتی ہیں کہ ترنم سے سنایئے تو بڑے مسحور کن انداز میں وہ غزلیں اور گیت بھی سریلی آواز میں گوش گزار کرتے ہیں جو بیس تیس ہزار سامعین و ناظرین کے دلوں کو موہ لیتی ہیں چاہے ان کی لفظیات اور نفس مضمون میں عمومیت نہ ہو بلکہ معنوی اعتبار سے گہرائی و گیرائی رکھتا ہو۔ یہ فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا کہ عصر حاضر کی اردو شاعری میں وسیم بریلوی کی شعریات کا کیا مقام ہے اور خصوصیات کلام میں فکری و فنی اعتبار سے زندہ رہنے والی خوبیاں کیا ہیں تاہم فی الوقت حضرت نشور واحدی اور فراق گورکھپوری جیسے مشاہیر اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے اسکالر کے تنقیدی تبصرے تو یہ تاثر دیتے ہیں کہ آنسو ہونے والی آنکھ مستقبل میں بھی ایک ایسی صدف ثابت ہوگی جس سے سچی آب و تاب رکھنے والے گہر ہائے آبدار برآمد ہوں گے۔

اپنی پسند کے جو اشعار پہلے عرض کر چکا ہوں ان میں فکر انگیز طنز کی نشتریت ہے، جدید حسیت کی جاذبیت ہے، ایجاز و ایمائیت ہے۔ عصری شعور و آگہی کی ایسی رمزیت جو شاعری کے شائقین کو اپنا گرویدہ بنانے کی خصوصیت رکھتی ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ ان کے غزلیہ اشعار میں ذوق سلیم رکھنے والوں کے لیے ''پیار کی نغمگی'' ہے یا اسلوب بیاں جدید غزل کی شرائط پوری کرتا ہے تو اس بارے میں میرا تجزیہ یہ ہے کہ وسیم کے لہجے میں پیار کی نغمگی ہے مگر اس کا رنگ و آہنگ روایتی غنائیت سے کچھ مختلف اور ان کی شاعری کے بنیادی مزاج کے مطابق ہے۔ انہوں نے جدید غزل کے تقاضوں کو عمدگی سے پورا کیا ہے۔ ان کی غزلوں کا مزاج نہ جارحانہ، نہ بلند آہنگ اور نہ خطیبانہ مزاحمت سے عبارت بلکہ ان کی مضمون آفرینی کا گہرا تعلق بڑھتی ہوئی سماجی ناہمواریوں اور آج کے زمینی حقائق سے ہے۔

بقیہ : عصر حاضر کے زخموں کی گواہی

کے جلوے ان اشعار میں جا بجا بے حجاب ہو گئے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان اشعار میں کوشش واقعات اور سرگزشت سے آگے بڑھ کر انسانی احساسات کے چند ایسے المیوں تک پہنچ گئی ہے جو ہمارے دور کی نہیں شاید ہر دور کی زندگی کو ایک عمومی المیے کا رنگ دیتی ہیں اور جس کے بارے میں کیٹس یا شیلی نے کہا تھا کہ ہمارے شیریں ترین نغمات وہی ہیں جو ہمارے دل دوز جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں۔

ان تینوں کیفیات کی اس انداز سے آمیزش کہ وہ وسیم کی اپنی آواز اور وہ بھی غزل کی آواز و آہنگ میں ڈھل جائے، یہی وسیم کا فن ہے۔

دور تک شعلے ہیں پھر بھی دل یہ کہتا ہے وسیم

کوئی آئے گا مرے گھر کو بچا لے جائے گا

جونہ شروع ہوسکا نہ ختم!

نصرت ظہیر
(سہارنپور، بھارت)

دوستو پروفیسر وسیم بریلوی کی شخصیت پر اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک حقیقت کا اعتراف کرلوں۔ اس خاص نمبر کے لیے جناب حبیب سوز نے مجھ سے مضمون کی فرمائش کئی ماہ پہلے کی تھی اور چونکہ وسیم صاحب سے میرا تعلق بچپن سے ہے (یہاں میں اپنے بچپن کی بات کررہا ہوں) اس لیے جوش میں آ کر ایک ہفتے میں مضمون لکھ لینے کا وعدہ کرلیا تھا۔ کمترین کی، یعنی میری ساری زندگی ہی چونکہ وعدے وفا کرنے میں گزری ہے اس لیے حسب عادت ہفتہ ختم ہونے سے کافی پہلے مضمون لکھنے کے لیے اس کا پہلا جملہ سوچنا شروع کردیا۔ دراصل کئی بڑے ادیبوں کی ایک ادا یہ بھی ہوتی ہے کہ مضمون ہو یا افسانہ، تب تک شروع نہیں کرتے جب تک انہیں کوئی اچھا سا جملہ نہ سوجھ جائے۔ بندہ بڑا ادیب تو خیر آپ حضرات کی خوش قسمتی سے نہیں بن سکا لیکن یہ عادت ضرور پڑ گئی کہ پہلا جملہ ملنے سے پہلے کچھ بھی نہیں لکھ پاتا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ اب یہ وسیم صاحب کی شخصیت کا رعب تھا یا کچھ اور کہ ایک دن گزرا دو دن گزرے بلکہ پورا ہفتہ نکل گیا مگر مجال ہے جو پہلا جملہ گرفت میں آیا ہو۔

خیر، حبیب صاحب حساب کتاب اور ایڈیٹری میں چونکہ گانٹھ کے پورے واقع ہوئے ہیں اس لیے گھڑی کے مطابق جیسے ہی ایک ہفتہ مکمل ہوا، فون پر تقاضے کی گھنٹی بج اٹھی اور کہا گیا کہ ایک منٹ پہلے ایک ہفتہ پورا ہوچکا ہے۔ میں نے احتیاطاً اصل بات چھپا کر ایک ہفتے کا ایکسٹنشن لے لیا اور پورے ہفتے پہلے جملے کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ تو اب بھی نہیں ملا مگر حبیب صاحب تقاضے کے لیے وقت پر موجود تھے۔ اس بار میں نے احتیاطاً پورے ایک مہینے کی مہلت لے لی اور ٹھیک دو مہینے بعد مضمون لکھنے بیٹھ گیا، حالانکہ پہلا جملہ ابھی تک روشن نہیں ہوا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر قلم ہاتھ میں لے کر میں نے آنکھیں بند کرلیں اور وسیم صاحب کو پوری یک سوئی کے ساتھ سوچنے لگا۔ یہاں تک کہ سوچتے سوچتے بریلی سے بھی کہیں آگے نکل گیا مگر آگے بڑھا تو تصور میں ان کے ساتھ دوبئی کناڈا اور امریکہ کے کئی عالمی مشاعرے پڑھ ڈالے مگر قلم سے کوئی ایسا جملہ نہ تراش سکا جو اُن پر لکھے جانے والے مضمون کے شایانِ شان ہو۔ کئی بار تو غیر مروجہ جملوں سے مضمون شروع کرنے کا بھی ارادہ کیا۔ مثال کے طور پر مضمون کا آغاز اس جملے سے کیا جائے کہ وسیم بریلوی ایک بڑے شاعر ہیں جن کا قد اندازاً چھ فٹ دو انچ ہے مگر پھر سوچا کہیں اس جملے سے وسیم صاحب ناراض نہ ہوجائیں اور ڈانٹنے نہ لگیں کہ میرا قد اتنا کم کیوں لکھا ہے۔ سوچا فون کرکے حبیب صاحب سے اصل پیمائش معلوم کرلوں۔ مگر خیال آیا کہ کہیں انہیں یہ بدگمانی نہ ہوجائے کہ میں مضمون کی بجائے وسیم صاحب پر شیروانی تیار کررہا ہوں اور۔۔۔ شیروانیاں چونکہ قلم سے نہیں قینچی سے لکھی جاتی ہیں اس لیے بات پھیلنے پر یہ مشہور نہ ہوجائے کہ نصرت ظہیر صاحب نے اردو کا درزی یعنی نقاد بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

یہ درزی اور نقاد والی بات میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہمارے شہر سہارنپور میں ایک ٹیلر ماسٹر ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے پیشے کی یکسانیت سے جھلا کر سوچنے لگے کہ بس، بہت ہوئیں یہ شیروانیاں اور تھری پیس سوٹ، کل سے ادب سیا کریں گے۔ اگلے ہی دن وہ کسی کباڑی کی دوکان سے اردو کی پرانی کتابیں اٹھالائے اور اپنی لمبی چوڑی میز سے کپڑوں کے پیس ہٹا کر وہاں کتابیں سجادیں۔ اس کے بعد موصوف نے گوند کی شیشی الماری سے نکالی، نشان لگانے والی رنگین پنسل کان میں لگائی اور فیتہ قینچی لے کر کتابوں پر پل پڑے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شام تک ان کی میز پر ایک تنقیدی کتاب کا مسودہ تیار تھا، جس کا عنوان تھا شمال مشرقی شعریات پر جنوب مغربی شعریات کا اثر از قلم و قینچی ماسٹر بھورے خاں اینڈ سنز۔ چند ہفتوں بعد کتاب چھپ کر آ گئی اور وہ دھوم مچی کہ ماسٹر بھورے خاں سنجیدگی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ تو بھلا ہو علاقے کی یونیورسٹی کا کہ اس نے اس کی درخواست مسترد کردی ورنہ آج اردو ادب کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوتا۔

☆

اسی طرح ایک جملہ مضمون شروع کرنے کے لیے یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وسیم بریلوی صاحب بریلی کے رہنے والے ہیں اور ہر سال ایک ہفتہ ضرور بریلی میں رہتے ہیں۔ لیکن خیال آیا کہیں بریلی والے برا نہ مان جائیں کہ ان کے محبوب شاعر کی عالمی مقبولیت اور مشاعروں میں مصروفیت کا اس طرح مذاق اڑایا جارہا ہے۔ دراصل بریلی والے وسیم صاحب سے بے حد محبت کرتے ہیں وہ شہر میں موجود ہوں تو آپس میں جھگڑا تک نہیں کرتے۔ کبھی کبھار یکسانیت سے بور ہوکر تفریح طبع کے لیے مقامی فرقہ وارانہ فساد اور بے مدت کرفیو کے شاندار اہتمام کا خیال آئے تو اسے عملی پاجامہ پہنانے سے پہلے یہ اطمینان ضرور کرلیتے ہیں کہ وسیم صاحب شہر میں تو نہیں ہیں۔ جب پوری طرح یقین ہوجائے کہ وہ کناڈا یا دوبئی میں مشاعروں کے لیے نکل چکے ہیں تب دونوں طرف کے لوگ اطمینان کی سیٹی بجاتے ہوئے چھری کانٹوں سے لیس ہوکر سڑکوں پر آتے اور سرخیاں بکھیرنا شروع کرتے ہیں۔

اگر دیوبندی اور بریلوی کے جھگڑے کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو وسیم بریلوی کے تعلق سے یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ دونوں میں کون زیادہ اہم ہے۔ وسیم صاحب یا بریلی شریف۔ یا یہ کہ وسیم صاحب کو بریلی کی وجہ سے شہرت ملی ہے یا بریلی شہر وسیم صاحب کی وجہ سے مشہور ہوا ہے۔ یوں تو بریلی ہمارے ذہنوں میں اس لیے بھی محفوظ ہے کہ کسی زمانے میں ایک خاتون کا جھمکا یہاں کسی بازار میں گر گیا تھا جسے مقامی شائقین سنا ہے کہ آج تک ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ

وہ موصوفہ بھی ہاتھ نہیں آئیں جنہیں ساری زندگی ایک جھمکے پر بسر اوقات کرنی پڑی ہوگی۔ تبھی سے لوگ اس بازار کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ یار لوگوں نے خاتون کا پتہ لگانے کے چکر میں بریلی کے سارے بازار کھنگال ڈالے لیکن نہ وہ جھمکا ملا نہ وہ بازار جہاں وہ مبینہ خاتون کے مبینہ کان سے گرا تھا۔ اکثر لوگ بریلی کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے ہی قلی سے پوچھنے لگتے ہیں، کیوں میاں یہ جھمکے والی ٹھمکا خاتون کہاں ملتی ہیں؟

اس کے علاوہ بریلی کا سرمہ بھی خاصا مشہور ہے۔ کہتے ہیں اس سرمے کو آنکھوں میں لگانے سے اندھے بھی پٹ پٹ دیکھنے لگتے ہیں اور اہل نظر اس کا استعمال کرلے تو زمین میں گڑے دفینے تک نظر آجاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک سرمہ دہلی سے سہارنپور جانے والی روداد بس میں ناچیز نے اپنی آنکھوں میں لگوالیا تھا۔ سرمہ بیچنے والا اسے کیکڑے کا مشہور سرمہ بتلا رہا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ بریلی کا سرمہ اس کے آگے طفل مکتب ہے۔ ایک سلائی لگوا کر دیکھو بریلی کیا بدایوں بھی صاف نظر آنے لگے گا اور اچھے برے کی پہچان ہوجائے گی سو الگ میں نے پوچھا کیا بریلی میں وسیم بریلوی بھی دکھائی دیں گے؟ وہ بھی کوئی پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ کہنے لگا اگر مشاعرہ پڑھنے امریکہ نہیں گئے ہوں گے تو ضرور دکھائی دیں گے۔ اس کے بعد اُس بزرگ باراں دیدہ نے سرمے کی ایسی سلائی دونوں آنکھوں میں لگائی کہ پورے چودہ دونی اٹھائیس طبق روشن ہوگئے۔ سلائی کیا کم بخت دیا سلائی تھی جس نے خرمنِ بصارت کو پھونک کر خاک کر ڈالا۔ پھر اس کی جگہ جو بصارت پردۂ چشم پر نمودار ہوئی اس میں دیوالی کی پھلجھڑیاں، شب برات کے پٹاخے اور بے گانی شادی کے آتشین گولے ایک ساتھ چھوٹ رہے تھے۔ یہ آتش بازی تھمی اور پانی کے ابلتے ہوئے چشمے میں تبدیل ہوجانے والی چشم ہائے پرنم کو ہاتھوں سے مسلا تو درد کی لکیریں بریلی اور بدایوں سے بھی اگے نکل گئیں جہاں وسیم صاحب بھی کہیں نظر نہیں آئے۔ رومال سے چہرہ صاف کرکے کسی طرح آنکھیں کھولیں تو واقعی سب کچھ صاف نظر آرہا تھا۔ درد تھمنے پر غصے کی لہریں تن بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ اسی عالم میں سرمے والے کا گریبان پکڑ لیا اور قریب تھا کہ نوبت ہاتھا پائی کی آجاتی کہ ایک بھلے مانس نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس کا گریبان پکڑا ہے وہ کوئی شریف مسافر تھا اور جس نے بیچ بچاؤ کرایا وہی اصلی کیکڑے والا تھا جس کی صورت اس وقت مجھے سرمے کی وجہ سے اصلی کیکڑے جیسی نظر آرہی تھی۔ کہہ رہا تھا، ''بھائی صاحب وسیم بریلوی نظر نہیں آئے تو کیا ہوا۔ میرے پاس دوسرا اس سے زیادہ طاقت ور سرمہ ہے جس کی مار امریکہ تک ہے۔ کسی نہ کسی مشاعرے میں نظر آجائیں گے۔''

کم بخت کے دونوں جملوں میں تین خطرے چھپے تھے۔ ایک وسیم صاحب کی خفگی کا دوسرا بریلویوں کے ناراض ہونے کا اور تیسرا امریکہ کا۔ آخر سوچتے سوچتے ایک اور ہی خیال آیا۔ کیوں نہ یہ مضمون پہلے جملے کے بغیر ہی لکھ دیا جائے۔ خیال اتنا زبردست تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے اچھل گیا اور گرتے گرتے بچا

☆

دل نے کہا، برخوردار یہ تمہارے لیے واقعی ایک نیا تجربہ ہوگا، اس لیے فوراً کر ڈالو۔ ویسے بھی نئے تجربوں کا تمہیں بچپن سے شوق ہے۔ دس سال کی عمر تک گھر کے تین ریڈیو سیٹ تمہارے تجربوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ پندرہ سال کے ہوئے تو ایک عدد دیوار گھڑی اور دو عدد ٹائم پیس تمہارے تجربوں کی بدولت پرزہ پرزہ ہوگئے۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو شاعر بننے کا تجربہ شروع کردیا۔ وہ تو خدا بھلا کرے تمہیں خود ہی عقل آگئی اور غزلوں سے بھری دو موٹی موٹی کاپیاں پھاڑ کر تم نے اپنے کمرے کے پیچھے آب چق میں پھینک دیں ورنہ فضول اور ناکام شاعروں میں آج تمہارا نام اسد رضا سے پہلے لیا جارہا ہوتا۔ اس کے بعد شاعری چھوڑی تو تم کامریڈ بن گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انقلاب نے ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔ حالانکہ یہ کریڈٹ سیدھا ہندوستانی کمیونسٹ پارٹیوں پر جاتا ہے کہ انہوں نے بڑی جاں فشانی سے انقلاب کو روک رکھا ہے۔ مگر دل کہہ رہا تھا میاں، مجھ سے زیادہ بہتر کون جانتا ہوگا کہ انقلاب کے اونٹ کی کمر پر تم اس آخری تنکے کی طرح تھے جس کے سوار ہوتے ہی بے چارے کی کمر بیٹھ گئی۔ صحافت اور کالم نگاری کے تجربوں کا بھی کچھ ایسا ہی حشر نکلا۔ لوگوں نے اردو کی صحافت میں کوٹھیاں کھڑی کرلیں، وزیروں کے ساتھ ڈنر کئے اور سفیروں کے ساتھ لنچ کے عادی بن گئے، راجیہ سبھا کی ممبریاں تک کھا پی گئے اور تم ہو کہ قسطوں پر لی ہوئی کار بھی ڈرائیور کی تنخواہ نہیں جٹا پانے کی وجہ سے بیچ دی اور یوں بے چاری اردو صحافت کے دامن پر ایک دھبہ بن گئے کہ نہ کار چلانا سیکھ سکے نہ کاروبار۔ لہٰذا اب پہلے جملے کے بغیر ایک مضمون لکھ لینا تمہارے لیے کون سی بڑی بات ہے؟ بلکہ میری مانو تو مضمون کا آخری جملہ بھی مت لکھنا۔ تجربہ دو آتشہ ہوجائے گا۔

حضرتِ دل کی یہ تقریر غیر دل پذیر سن کر میرا دماغ بھنّا گیا۔ بلکہ جناب وسیم بریلوی کی مہذب، شفیق اور مرعوب شخصیت بیچ میں نہ ہوتی تو شاید اس پر ہاتھ بھی اٹھ جاتا مگر کیا کیجیے۔ کم بخت کسی اور کا نہیں اپنا دل تھا۔ بد بخت کو کچھ ہو، ہوا جاتا تو نزدیکی فائیو اسٹار ہاسپٹل سے مردہ دل اور لمبے چوڑے زندہ بل کی صورت ڈسچارج ہوتا۔ لہٰذا چلیے اِدھر اُدھر کی باتیں چھوڑ کر اصل موضوع پر آتے ہیں اور پہلے جملے کے بغیر ہی وسیم صاحب پر مضمون شروع کرتے ہیں۔

☆

میں یعنی راقم الحروف اپنی زندگی کے پچھلے دو تین سال نظر انداز کردوں تو وسیم صاحب کے بارے میں میری واقفیت بس اتنی تھی جتنی ایک اوسط سامع کی مشاعرے کے اسٹیج پر بیٹھے شاعر کے بارے میں ہوسکتی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دیکھنے سننے میں خوب صورت ہیں، پانچ وقت کی نماز کی عادت ہے اس لیے شراب بالکل نہیں پیتے، سیدھی سادی دھیمی دھیمی رومانی شاعری کرتے ہیں۔ تحت اللفظ اور ردھم میں شعر پڑھتے ہیں، گھن گرج اور توڑ دو پھوڑ دو، اُن کی شاعری میں بالکل نہیں ہے۔ مشاعرے میں واہ واہ کا بے ہنگم شور مچوانے اور تالیاں پٹوانے کے لیے مذہبی تعصب کے زہر سے لبریز اشعار بالکل نہیں پڑھتے، مائک پر آنے

کے بعد چیختے چلاتے نہیں، شعر پڑھتے ہوئے اداکاری نہیں کرتے، اسے جھنجھوڑتے نہیں، نیز ترنم میں شعر پڑھتے ہیں تو منہ سے دانت نہیں سریلے نغمے نکالتے ہیں، اس سب کے باوجود پچھلی نصف صدی سے مشاعروں میں ان کا کریز Craze اور شرافت کے جامے کی کریز Crease دونوں قائم ہیں۔

وسیم صاحب کو میں جب بھی دیکھتا یا ان سے ملتا ہوں تو اردو مشاعروں کا ایک پورا دور آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔ لڑکپن کا وہ زمانہ جب شاعری اور مشاعروں کو الگ الگ دیکھنے کی عقل نہیں تھی۔۔۔ سمجھ میں آنے والے شعر پر داد دینے کی بجائے سمجھ میں نہ آنے والے شعر پر ہوٹنگ اور ہنگامہ کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔۔۔ تب شاعروں کی ایک زمرہ بندی پکّے ذہنوں میں اپنے آپ ہوگئی تھی کہ انہیں پسند کرنا ہے اور انہیں ہوٹ کرنا ہے اور ان میں ترنم اور تحت میں پڑھنے والے دونوں طرح کے شاعر تھے۔ ترنم والے کچھ زیادہ تھے جن میں صرف سلیم کھتولوی اور فنا نظامی کانپوری کے نام ذہن میں ہیں باقی حافظے سے اتر چکے ہیں۔

سلیم صاحب نابینا تھے سو جیسے ہی ان کے موذن نما پاٹ دار اور کرخت ترنم پر ہوٹنگ کرتے بزرگ سامعین کی ڈانٹ ہمیں ہوٹ کر دیتی۔ فنا نظامی کا انداز یہ تھا کہ ہر لفظ پر پاؤں کے پنجوں پر اچکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا ترنم بھی اچکتا پھدکتا رہتا تھا۔ جب بھی ان کی ہوٹنگ ہوتی وہ ہم لڑکوں کو مائک پر ہی سے اسی طرح اچک اچک کر سخت قسم کی ڈانٹ ضرور پلاتے تھے۔

تحت اللفظ والوں نے گلزار دہلوی اور علامہ انور صابری ہمارے محبوب ترین شاعر تھے، جنہیں ہوٹ کرنا فرائضِ اولین میں داخل تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دور میں کوئی مشاعرہ تب تک کامیاب ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک ان شعرائے کرام کی جم کر ہوٹنگ نہ کرلی جائے۔ خود ہمیں بھی ایسے مشاعرے میں لطف نہیں آتا تھا جس میں ان حضرات کو نہ بلایا گیا ہو۔ برسوں بعد دہلی میں گلزار صاحب کی شفقت وصحبت نصیب ہوئی اور یہ اندازہ ہوا کہ آج کے دور میں اردو تہذیب کی کوئی تصویر پنڈت ڈاکٹر آنندموہن زتشی گلزار دہلوی کی تصویر سے مختلف نہیں ہوسکتی تو اپنے کیے پر ملال ہوا۔ اسی طرح جب جب علامہ انور صابری کی یاد آتی تو لڑکپن کی نادانیوں پر شرم بھی ساتھ لاتی کہ وہ جو بھی تھے اردو والے تھے اور یہی زبان ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔

وسیم بریلوی تب نئے نئے مشاعروں میں آئے تھے۔ زبیر رضوی کے بعد یہ دوسرا خوب صورت چہرہ تھا جو مشاعروں کے اسٹیج پر نمودار ہوا تھا۔ زبیر اُن دنوں اتنے خوب صورت ہوا کرتے تھے (ماشاء اللہ اب بھی ہیں) کہ ہم دوستوں کی منڈلی جو اُن سے عمر میں کم از کم دس سال چھوٹی تھی، ان کی ہم جنس ہوکر بھی باجماعت ان پر فدا تھی۔ کچھ کچھ، تیرے کُل خاندان پر عاشق، میرا کُل خاندان ہے پیارے والا معاملہ تھا۔ انہیں دیکھ کر بڑے زور کی آہ دل سے نکلا کرتی تھی کہ یا خدا، یا تو انہیں لڑکی بنادے یا ہمیں مونث کردے کہ کچھ تو معاملہ آگے بڑھے۔ جب وہ فلم یہودی کے گانے سے ملتی جلتی دھن پر لہک لہک کر ''یہ ہے میرا ہندوستان، میرے سپنوں کا جہان۔۔۔'' پڑھتے تو سنا ہے لڑکیوں کے دل دھڑکنے لگتے اور ہمیں ہندوستان سے زیادہ اُن پر پیار آجاتا تھا۔

لیکن وسیم صاحب بھی کچھ کم نہیں تھے۔ شیروانی کے لیے نہایت موزوں ومناسب دراز قد، چھریرا بدن، سرخ سفید رنگت، لہراتے ہوئے بال، بھینی بھینی اگربتی کی طرح سلگتی ہوئی رومانی غزلیں، اپنے انداز کا الگ ترنم گونجتی ہوئی سی masculine آواز، ہر انداز میں سلیقہ، ہر تکلم میں شائستگی۔۔۔ یہ سب لڑکیوں کو پاگل کردینے کے لیے کافی تھا۔ زبیر نہ ہوتے تو یاروں کے مشترکہ معشوق بھی وہی تھے۔ البتہ ترنم جو وسیم صاحب کا تھا وہ زبیر صاحب سے بھی زبردست تھا۔ اب بھی ہے۔ اس جداگانہ انداز ترنم سے جب وہ شعر سناتے تھے تو شاعروں کی سانسیں رک جاتیں۔ غزل کی دھن کوئی بھی ہو، شعر کے پہلے مصرعے کو دوہراتے وقت وہ ایک لفظ کو اتنا کشید کردیتے تھے کہ کبھی کبھی تو مجھے گھبراہٹ ہوجاتی۔ اردو مشاعرے کو اتنا سانس لیتے ہوئے نہ وسیم صاحب سے پہلے کسی نے سنا تھا نہ میرا خیال ہے ان کے بعد سنا جائے گا۔ میرا ایک بےسُرا اور موسیقی سے بےزار دوست وسیم صاحب کے ترنم کا مذاق اڑانے کے لیے کہا کرتا، یار جب تب یہ دوسرے مصرعے پر آئیں میں باہر جاکر چائے پی آتا ہوں ایک بار اس نے وسیم صاحب کو ہوٹ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جیسے ہی انہوں نے کسی لفظ کو کشید کیا اُس نے بھی بلند آواز میں اپنی تان ملادی مگر چند لمحوں کے بعد ہی ہانپنے اور کھانسنے لگا۔ ایک دفعہ کے بعد اس نے پھر سینہ پھلا کر یہی حرکت دوہرائی تو اس بار سامعین کے ہاتھوں پٹتے پٹتے بچا۔

☆

میری اور ان کی باقاعدہ پہلی ملاقات دراصل سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہوئی جہاں ایک سرکاری مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا اور مشاعرہ والوں نے اپنی شومئی قسمت سے مجھے بھی مدعو کرلیا تھا۔ مرحوم شہریار بھی ساتھ تھے۔ ہم لوگ کوئی پندرہ روز ہم سفر رہے۔ ان سے ملتے ہی بچپن کے (یہاں بھی میں اپنے بچپن کی بات کر رہا ہوں) مشاعرے یادوں کے پردے پر ٹیلی کاسٹ ہونے لگے۔ وہی لامبا قد، چہرے پر بزرگی کے اثرات کے باوجود ہی پہلے کی سی ملاحت، مصافحہ کرنے اور ہم کلام ہونے سے نشست و برخاست تک میں وہی نفاست، گفتگو میں وہی غیر مصنوعی قرینہ اور سلیقہ اور چہرے پر ایک خاص طرح کی چمک اور اجلا پن۔ مکہ گئے تو عمرے کے دوران سعی کے مرحلے میں ان کی رفتار دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اور میری بیٹی نے ان سے کچھ پہلے ہی سعی کا آغاز کیا تھا لیکن سات دورے مکمل کرنے کے بعد میں ہانپتا ہوا مقام آغاز پر پہنچا تو وسیم صاحب اپنی گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ وہاں پہلے سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ دل ہی دل میں اپنی کم عمری پر شرم آگئی۔ اس کے بعد سعودی دارالحکومت ریاض میں ہونے والے مشاعرے تک اور پھر دہلی واپسی تک ان کی قربت حاصل رہی اور وسیم بھائی کی صورت میں ایک ایسے بڑے شخص کو قریب

سے دیکھنے جاننے کا موقع ملا جسے ابھی تک بس میں دیکھا تھا۔

ان دنوں میں قومی اردو کونسل سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اس وقت کے ڈائریکٹر حمید اللہ صاحب مجھے سہارا گروپ کے عالمی سہارا ٹی وی اور میگزین سے لگ بھگ گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے اور میں نے تقریباً ایک سال کی ''سہارا گروپ'' کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ بلکہ ایک نہیں دو بار، کیونکہ وہاں راشٹریہ سہارا کو مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچا دینے والے ڈاکٹر برنی مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ سعودی عرب کے دورے سے واپسی کے بعد ایک دن ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے باتوں باتوں میں پوچھا ''مجھے یہ بتاؤ کہ وسیم بریلوی کیا چیز ہیں۔ ان کا نام کونسل کی وائس چیئرمین شپ کے لیے لیا جارہا ہے اور مجھ سے رائے مانگی گئی ہے۔'' میں نے جو کچھ میرے علم میں تھا بتا دیا کہ پوری طرح نان کنٹروورشیل، شریف، شائستہ اور پارلیمنٹ و اسمبلیوں کے علاوہ مشاعروں کی دنیا کے سب سے مشہور شاعر ہیں۔ پارلیمنٹ کے لفظ پر وہ چونکے۔ پوچھا کیا راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔ میں نے کہا ابھی تو نہیں ہیں لیکن کبھی نہ کبھی بنیں گے ضرور۔ پوچھا، تو پھر پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے شاعر کیسے ہو گئے۔ میں نے بتا دیا کہ غالب اقبال اور فیض کے بعد ہمارے سیاست داں جن موجودہ شاعروں کے شعروں کو غلط پڑھ کر جمہوریت کے ایوانوں میں جوش پیدا کرتے ہیں ان میں وسیم بریلوی کا نام سب سے اوپر ہے۔

پھر ایک دن سنا کہ واقعی انہیں وائس چیئرمین بنا دیا گیا ہے۔ کونسل میں سب خوش تھے کہ چلو اور کچھ نہ سہی تین سال کے لیے ایک سلیبریٹی Celebrity تو مفت ہاتھ آ گئی۔ کونسل کا کام کیا خاک کریں گے۔ جب بھی دفتر آیا کریں گے سلام کر کے ان سے تازہ اشعار سن لیں گے۔ پھر یہ بھی ایک عام تاثر تھا کہ شاعر ہیں، دنیا بھر کے مشاعروں میں مصروف رہتے ہیں، کونسل کے لیے وقت ہی نہیں نکال سکیں گے چنانچہ کونسل بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد حمید اللہ بھٹ سے پہلے کے زمانے کی اداؤں اور مستانہ چال پر واپس آ جائے گی۔ مگر کونسل کو پہلا جھٹکا تب لگا جب وسیم صاحب نے کونسل کے کام کاج کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کے بعد اس کے ہر چھوٹے موٹے کام میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور دوسرا اس سے شدید جھٹکا تب آیا جب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین جیسے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی تہذیب میں ڈھلے ہوئے تیز رفتار اور تیز دماغ شخص کو ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کونسل کی شراب دو آتشہ ہو گئی۔ نشہ اور دوبالا ہو گیا۔ حمید اللہ بھٹ صاحب نے کونسل کو جس اونچے مقام پر چھوڑا تھا ان کی محنت اسے وہاں سے اور اوپر لے آئی۔ وہ بھی بہت تھوڑے سے وقت میں۔ بھٹ صاحب کے ہاتھوں کیے ہوئے پراجیکٹوں کی تکمیل تو ہوئی ہی، نئے پراجیکٹوں کی تشکیل، سالانہ بجٹ میں اضافہ اور اردو کانفرنس کے انعقاد، بچوں کے لیے دنیائے اردو کے سب سے خوبصورت رسالے کی شروعات، موبائل فون اور ای پوڈ وغیرہ سے اردو رسم الخط کو جوڑنے جیسے کاموں نے کونسل کے عمل اور امیج کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔

یہاں ایک بات بتاؤں؟ کبھی کبھی شائستگی کی سطحوں سے نیچے اتر کر بھی زیادہ تر معاملات میں اختلاف رائے کا بے خوف اظہار کر دینے والے میرے منہ پھٹ دوست اور دوست شکن قلم کار ڈاکٹر اطہر فاروقی نے جب کھل کر وسیم بریلوی اور خواجہ اکرام الدین کی ستائش میں انجمن ترقی اردو کے رسالے ''ہماری زبان'' کا اداریہ تحریر کیا تو پڑھ کر بڑا عجیب سا لگا۔ میں نے اطہر سے کہا بھی کہ یار اسے پڑھ کر لوگ کہیں تمہیں خوشامدی نہ کہنے لگیں۔ بولے کہیں تو کہتے رہیں۔ سچ تو سچ ہے۔ اس کی دھار دونوں طرف کاٹتی ہے۔ اس حقیقت کو آپ کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ وسیم بریلوی بہرحال ایک وسیع حلقے میں پسند کیے جانے والے شاعر ہیں اور ان حلقوں میں سیاسی رہنما اور سرکاری افسر بھی شامل ہیں۔ ان حلقوں میں اپنے ادبی رسوخ کا استعمال اگر انہوں نے اپنے فائدے یا خواجہ اکرام کی تنخواہ بڑھانے کے لیے نہیں بلکہ اردو کونسل کے بجٹ کو ساٹھ کروڑ تک پہنچانے کے لیے کیا ہے تو کیا میں صرف اس لیے تعریف نہ کروں لوگ مجھے خوشامدی سمجھیں گے۔ خواجہ اکرام اور پروفیسر وسیم دونوں اپنی ذات میں خود کفیل ہیں اردو میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ ایک کو انٹرنیٹ پر تعلیم و تدریس کے لیے خطیر معاوضہ ملتا رہا ہے، دوسرے کی دنیا بھر کی اردو بستیوں میں زبردست مانگ ہے۔ کونسل انہیں اس سے زیادہ کیا دے سکے گی؟ بات اردو کی ہے۔ اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی ہے۔ ان دونوں کی بدولت اردو کونسل پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقت ور ادارہ بن کر ابھری ہے اور اس صداقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے تو کر کے تو دکھائے۔

☆

یہاں مشاعروں اور ان میں ہونے والی شاعری پر بھی ایک دو باتیں ہو جائیں۔ میری کمزور معلومات کے مطابق دنیا کی کسی بھی بڑی یا اہم زبان میں شاعر کو براہِ راست عوام سے مخاطب کرنے والا ایسا کوئی ادارہ یا پلیٹ فارم موجود نہیں ہے جیسا اردو زبان کو مشاعروں کی صورت میں نظر آیا ہے۔ کہنے کو مغرب میں آپیرا اور تھیٹر ہیں اور مشرق کی زبانوں میں بھی ادبی تخلیقات کو آج سیدھے طور سے آدمی کے سامنے لانے کا رواج مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کی ادبی تقریب کا اہتمام کسی زبان میں نہیں ہوتا کہ بہت سے شاعر ایک ہی جگہ موجود ہیں۔ ایک بڑا مجمع انہیں سننے کے لیے سامنے بیٹھا ہے اور ایک ایک کر کے ہر شاعر ان کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی میں کوی سمّیلن اور پنجابی میں کوی دربار کی جو روایت ہے وہ بھی دراصل اردو مشاعروں کی ہی دین ہے، اور مشاعروں کی مقبولیت نے ہی ان زبانوں کے اکابرین کو اپنے یہاں اپنی زبان کے مشاعرے شروع کرنے پر مجبور کیا تھا۔ بہرحال مشاعروں کی ساخت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اس میں ہر فنکار سیدھے طور سے عوام کی پسند و ناپسند کی دھار پر رہتا ہے۔ کئی بار اچھا کلام ہوٹنگ کی نذر ہو جاتا ہے اور کئی بار معمولی شعر کہنے والے کی زندہ باد ہونے لگتی ہے۔ ترنم کے تحت خوش نغمگی اور تحت اللفظ کے تحت ڈرامائیت یا گھن گرج شعر کے عیب کو ڈھک کر قابل قبول بنا دیتی ہے۔ چنانچہ یہ صحیح ہے کہ مشاعروں کی مقبولیت کو شاعر کے ادبی قد یا معیار کو ناپنے کا پیمانہ

نہیں بنایا جا سکتا۔ وسیم صاحب بھی شاعری کے لیے مقبول خواص وعام ہیں وہ بھی اس پیمانے سے باہر نہیں ہے۔ یعنی اس کی قدر و قیمت کو آپ مشاعروں کی واہ واہ سے نہیں ناپ سکتے۔ اس کا ادبی معیار تب سامنے آتا ہے جب وہ آپ کے حافظے میں سما جاتی ہے۔ جب آپ اسے کچی یا پکی روشنائی میں پڑھتے ہیں، تب بھی وہ ویسا ہی لطف وعرفان عطا کرتی جیسا مشاعرے میں سنتے وقت تجربے میں آیا تھا۔ یا جب ان کے شعر کسی خاص صورت حال کی بہتر تفہیم کے لیے خود بخود آپ کے لبوں پر اتر آتے ہیں اور اقتدار کے ایوانوں میں ان کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

وسیم صاحب کے کئی شعری مجموعے سامنے آ چکے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی، کئی رسالوں نے ان پر خاص نمبر نکالے ہیں۔۔۔ یونیورسٹیوں میں ان کے فن اور شخصیت پر کام ہو رہا ہے۔ تو یہ سب یوں ہی تو نہیں ہے۔ وسیم صاحب کی شاعری میں جذبے کی جو دھیمی دھیمی لو اور فکر کی جو آنچ ملتی ہے وہ ان کے کلام کو ایک دم اس طرح کی مشاعرہ بازی کی شاعری سے الگ کر دیتی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ صرف تالی بجوانے کی نیت سے کہے گئے وہ شعر بھی وسیم صاحب کے یہاں نہیں ملتے جو ایک خاص ڈھب سے کہے جاتے ہیں۔ ان میں فلموں والی ''باکس آفس اپیل'' تو بہت ہوتی ہے لیکن آفاقیت کے ادبی تقاضوں اور لفظی در وبست کے فنکارانہ قرینے وسلیقے سے وہ بہت دور ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وسیم صاحب کی شاعری کا اس زاویے سے جائزہ لیا جانا بہت ضروری ہے کہ انہوں نے ساٹھ برسوں پر محیط اپنا سارا تخلیقی سفر مشاعروں کی دنیا میں رہ کر طے کیا مگر شاعری کے ادبی وقار کو بہر صورت قائم رکھا۔ کسی مشاعرے میں انہوں نے سامعین سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ میاں آپ زندگی میں اتنا سوئے نہیں ہوں گے جتنا ہم مشاعروں کے لیے جاگے ہیں۔ اس معنی خیز جملے میں مشاعروں کے تعلق سے جس شعری بیداری کی طرف ایک لطیف سا اشارہ انہوں نے کیا ہے وہ ان کے شعور میں بھی ہے اور شاعری میں بھی۔

☆

ایک روز دفتر میں دورانِ گفتگو نہ جانے کیا سوجھی کہ میں وسیم صاحب سے پوچھ بیٹھا۔ یہ جو آپ کے چہرے پر ہر وقت بنا وضو کیے بھی ایک طرح کی ملاحت، چمک اور روشنی سی دکھائی دیتی رہتی ہے یہ کس فیس کریم کی موئسچرائزر کی دین ہے؟

سن کر مسکرائے، بولے ''یہ آپ کا وہم ہے یا حسن نظر ہے۔ ورنہ میں تو ویسا ہی ہوں جیسا اللہ نے بنایا ہے۔''

''پھر بھی کوئی ٹوٹکا تو ہے کہ قریب سے بھی اتنے ہی اچھے لگتے ہیں جتنے دور سے۔ ورنہ بالعموم ہر شے قریب آ کر اپنی کشش کھو دیتی ہے! ٹالیے نہیں۔ اصلی بھید بتایئے۔ یہ کیسی نظر بندی ہے؟ یا تو یہ عشق کی چمک ہے یا عرفانِ ذات کی!''

ہنسنے لگے۔ ''اماں کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ عشق کی میری عمر نہیں اور عرفانِ ذات بڑے بڑے رشی منیوں کو نہ ہو سکا۔ میری بھلا کیا اوقات! ہاں ایک بات سنجیدگی سے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ضرور کہہ سکتا ہوں۔۔۔''

''بتایئے بتایئے، وہی سننے کی تو بے صبری ہے!''

''بات یہ ہے ظہیر میاں کہ Positiveness یا Positivity سب سے مقوی ذہنی غذا اور سب سے اچھی فیس کریم ہے۔ آپ کا نظریہ، مذہب، مسلک، فرقہ، قومیت، وطنیت کچھ بھی ہو۔۔۔ اگر آپ کا عمل مثبت نہیں۔۔۔ Positive نہیں۔۔۔ تو سب بے کار ہے۔ انسان اپنی ہر سوچ اور ہر کام کو Positive بنالے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ لوگ اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ انہیں اس کے چہرے پر اجالا نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ہر لمحے اور ہر عمل کو اثباتیت کے دائرے میں لانے کی کوشش کی ہے، چہرے کو اجلا بنانے کے لیے نہیں بلکہ سکون قلب کے لیے۔ یہ نعمت مجھے میرے پروردگار نے عطا کی ہے۔ آپ اسے چہرے کی چمک کہیے، میں اسے سکونِ قلب مانتا ہوں! میں تو ہر شخص سے کہتا ہوں اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ جو بھی Positiveness کو زندگی کا شعار بنائے گا وہ اپنے آپ خوبصورت ہو جائے گا۔۔۔ چمکنے لگے گا!''

اس کے بعد وہ اور میں کئی لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے!

اور یہاں میں سمجھتا ہوں میرا مضمون بھی تمام ہو جانا چاہیے۔ باوجود اس کے کہ جس طرح اسے شروع کرنے کے لیے کوئی موزوں جملہ نہیں ملا تھا اسی طرح خاتمے کے لیے بھی ڈھنگ کے لفظ نہیں سوجھ رہے ہیں۔

تو چلیے، وسیم صاحب پر ایک مضمون ایسا بھی سہی جو نہ ٹھیک سے شروع ہو پایا نہ ختم!

پُرنور اُفق

ہماری شاعری میں میؔر کا غم داخلی غم ہے۔ فانؔی کے یہاں یہ غم پرستی اور بھی داخلیت اختیار کر لیتی ہے۔ وسیم بریلوی اس داخلی غم سے سماجی اور انسانی غموں کا نشاطیہ درماں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ فنکار غم ہے جو انسانی حیات کے اس حزنیہ پہلو کو بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہے اور ایک انبساط انگیز اور حوصلہ افزا مستقبل کو جنم دینے کی سعی کر رہی ہے۔ وسیم بریلوی کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کے داخلی اور خارجی مسائلِ غم کو پیش کر کے چھوڑتے نہیں بلکہ ایسا راستہ بھی بناتے ہیں جس پر چل کر غمزدہ انسان دائمی مسرت، پُرنور اُفق کو چھو لے۔

شمیم کرمانی

اپنی رُت کا شاعر

پروفیسر علی احمد فاطمی
(الٰہ آباد)

زندہ زبانیں اپنی تہذیب وتخلیق سے زندہ رہتی ہیں (تنقید سے نہیں) دائرہ فکروعمل میں اضافے کرتی ہیں اور شعروادب میں فکری وتخلیقی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ فن میں کلاسک کا درجہ اُسے ہی ملتا ہے جو خواص اور عوام میں یکساں طور پر مقبول ہوتا ہے۔ کوئی تخلیق صرف خواص یا نقاد کے درمیان قبولیت کا درجہ پا کر بقائے دوام نہیں حاصل کرتی۔ دنیا کا کوئی بھی ادب اپنی عوامی اور ثقافتی بنیادوں کے بغیر زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ عوامی زبان، عوامی کلچر اور عوامی مسائل کو جو شاعر وفنکار اپنے تخلیقی تجربات اور اس کے بعد وجدان میں تحلیل وتجسیم کرتا ہے اور اسے دردمندانہ وفنکارانہ طور پر پیش کرتا ہے وہ دور تک جاتا ہے اس لیے کہ وہ سماج کے بڑے حصہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اس کی بہترین مثال ہیں جن کو ابتداً اشرفائے ادب ومعیارِ نقد نے منہ نہیں لگایا کہ وہ بقول شیفتہ بازاری شاعر ہیں لیکن ان بازار کے لوگوں نے ہی نظیر کو زندہ رکھا۔ آج یہ صورت ہے کہ نظیر کا درجہ میر اور کبیر کے ہم پلہ ہے۔ میر نے بھی کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اس مقالہ میں میں ایک ایسے شاعر کی شاعری پر گفتگو کروں گا جو زندگی بھر عوام سے گفتگو کرتا رہا آج بھی کر رہا ہے۔ عوام کے درمیان شاعری پیش کرتا رہا۔ اس کی زندگی کا مقصد، مشن اردو زبان کو فروغ دینا، حلقۂ شاعری کو وسیع تر کرنا کہ یہ حلقہ جس قدر وسیع وبسیط ہوگا، زبان وادب کے فروغ اور ارتقا کے امکانات اتنے ہی روشن ہوں گے۔ اس نے کبھی تنقید یا نقاد کو ذہن میں رکھ کر شاعری نہیں کی۔ اس نے شعروادب کو کئی شعری مجموعے تو دیے لیکن اُس سے زیادہ مشاعرے کے اسٹیج سے اپنی شاعری کا بگل بجایا، نعرۂ حق وصداقت بلند کیا جہاں عوام وخواص دونوں موجود رہتے ہیں۔ جس نے کتاب سے زیادہ دلوں میں جگہ بنائی، ذہن میں مقام حاصل کیا، عوام کو مہذب کیا، سماعت اور بصیرت کی تطہیر کی اور ان کو شعورِ انسانیت کے مفاہیم سے آگاہ کیا، یہ ہیں حضرت وسیم بریلوی۔۔۔ جو ان دنوں اردو شاعری کے بالعموم اور اُردو مشاعرے کے بالخصوص غیر معمولی مشہور ومقبول شاعر ہیں کہ جن کی شہرت کے ڈنکے اردو کی عالمی دنیا میں بج رہے ہیں۔

وسیم بریلوی راتوں رات اچانک مقبول شاعر نہیں ہو گئے۔ اس کے پیچھے ان کا خاندانی پس منظر، نوجوانی میں فکروفن کی ریاضت شعروشاعری کی مشق ومزاولت، اساتذہ کا مطالعہ، دواوین کی ورق گردانی اور ایک نوع کی خاموش اور بے لوث عبادت گزاری۔ ان تمام صبر آزما اور توجہ شکن منزلوں سے گزرنے کے بعد وسیم بریلوی نے شاعری شروع کی اور مشاعرے کے اُس اسٹیج پر جا پہنچے جہاں فراقؔ گورکھپوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، نذیر بنارسی جیسے اساتذہ کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن اگر آپ کے پاس زندگی کا حوصلہ ہے شعروادب کے تئیں ایک نظریہ اور یہ سب کچھ آپ کا اپنا ہے اس کے ساتھ ساتھ دل گداختہ بھی۔۔۔ تو پھر از خود شاعری ایک فطری رنگ اختیار کرے گی۔ ایک فکری آہنگ بھی اور وسیم بریلوی کے پاس یہ سرمایہ ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ عام سامعین اپنی بساطِ سماعت کے مطابق وسیم بریلوی کے ترنم کو تو پسند کرتے ہیں لیکن اس ترنم کے پیچھے جو تکلم ہے، تفکر ہے، اضطراب واحتجاج ہے اُس پر نظر کم کم ہی جاتی ہے۔ خوش الحانی کبھی کبھی خوش فکری کو اپنی لپیٹ میں لے کر تھوڑی دیر کے لیے کم کر دیتی ہے۔ ترنم کے کچھ فائدے ہیں تو کچھ نقصانات بھی۔ لیکن سنجیدہ سامعین وقارئین جانتے ہیں کہ ترنم صرف آواز کے زیر وبم کا نام نہیں بلکہ فکر کے پیچ وخم اور خیال کے کیف وکم کا بھی نام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جگرؔ، مجروحؔ، خمارؔ وغیرہ کا ترنم الگ تھا اور آج کے گلے باز شاعروں کا انداز کچھ اور ہے۔ غزل کے روایتی وتہذیبی ترنم کی بات ہی کچھ اور ہے جو تغزل کے بغیر مکمل نہیں۔ آیئے اب براہِ راست وسیم کی شاعری پر گفتگو کریں لیکن پہلے اُن کی گفتگو سنتے چلیں:

''گذشتہ دس سال عجیب بکھراؤ کے سال رہے۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی پس منظر کے لحاظ سے بڑے پُرآشوب دور سے گزرے ہیں ہم لوگ۔ دولت کی ہوس لطیف احساسات کو بہائے لیے جاتی ہے کہ انسانی دردمندیاں بے معنی سی ہو گئی ہیں۔ بے حسی کا عالم یہ ہے کہ حادثوں کے خوف سے لکھے جانے والے اخبارات ناشتے کی میز پر پڑھے جاتے ہیں تو ٹوسٹ لگے مکھن میں کمی نہیں آنے پاتی، اجتماعی درد بے احساس ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر کوئی خود میں یوں گم ہے کہ خود سے بھی بیگانہ ہوا جاتا ہے۔'' (میرا کیا، ص ۱۰، ۲۰۰۷ء)

اور پھر یہ سوال بھی:

''وہ کسک وہ چبھن کہاں گئی جو خیالی داستانوں میں حقیقت کا رنگ بھر دینے کا ہنر جانتی تھی۔ وہ وسیع القلب سوزِ دروں کیا ہوا جو دوسروں کے درد میں آنسو آنسو ہو جاتا تھا، پھر کالی داس، پریم چند کیونکر جنمیں؟ میرؔ وغالبؔ کیسے پیدا ہوں؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاعری تو دردمندیوں کے حسن کا نام ہے جب سبھی کچھ لذت عریاں کے عذاب میں مبتلا ہے تو اشاریت کہاں، ایمائیت کیسی؟'' (ص: ۱۲۔۱۱)

ہر سنجیدہ دردمند شاعر حیات وکائنات سے متعلق سوال ہی قائم کرتا ہے۔ غالب کے دیوان کا پہلا مصرعہ سوال ہی ہے۔ ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا؟'' اقبال نے تو قدم قدم پر سوال کیا۔ ''زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟'' اوروں نے بھی سوال کیے اور تلاشِ جواب میں مصروف رہے، جواب ملے یا نہ ملے لیکن اس بہانے دنیا تو دیکھ لی، انسانوں کو تو سمجھ لیا، کہ زندگی کی

بوالعجبی اور انسانی ذہن کی کرشمہ سازی کا عرفان بھی ایک انمول عطیہ ہے کہ اسی سے عرفانِ ذات بھی ہوتا ہے اور عرفانِ کائنات بھی۔ جو لوگ عرفانِ ذات کو کائنات سے الگ کر کے دیکھتے ہیں وہ خود بھی فریب کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس نوع کی سنجیدہ و بالیدہ شاعری میں ذات ایک علامت بن جاتی ہے۔ اس کے پردہ میں کائنات ہی بولتی نظر آتی ہے۔ وسیم کی شاعری کا اولین وصف جو مجھے نظر آیا وہ یہی ہے کہ ان کے یہاں غم، درد، آنسو سب کچھ اپنے ہوتے ہوئے بھی محض اپنے نہیں ہیں۔ یہ دو شعر دیکھئے:

تمہیں غموں کا سمجھنا اگر نہ آئے گا
تو میری آنکھ میں آنسو نظر نہ آئے گا
یہ زندگی کا مسافر یہ بے وفا لمحے
چلا گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آئے گا

اُردو شاعری میں غم کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ارسطو نے بوطیقا میں جس قدر ٹریجڈی پر بحث کی ہے کامیڈی پر نہیں۔ میؔر نے غم میں ہی ڈوب کر بے مثال شعر کہے اور غم کو نشاطِ غم میں بدل دیا، غالبؔ نے غم کو فلسفۂ غم میں بدل دیا اس کے علاوہ اقبالؔ، اصغؔر، فانؔی وغیرہ کے یہاں بھی غم کی بے شمار جہتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جگؔر نے تو یہاں تک کہہ دیا:

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

لیکن نئی شاعری میں غم کی وہ سوغاتیں نہیں اور نہ ہی وہ قدیمی و کلاسیکی صورت و شدت نظر نہیں آئے گی، لیکن وسیؔم کے یہاں غم ہے، کلاسیکی روایت کے ساتھ اور زندگی کی حرارت کے ساتھ بھی اور یہ حوصلہ بھی:

بھلا غموں سے کہاں ہار جانے والے تھے
ہم آنسوؤں کی طرح مسکرانے والے تھے

☆

ہماری آنکھ کے آنسو کی اپنی دنیا ہے
کسی فقیر کو شاہوں کا ڈر نہیں ہوتا

☆

جنہیں سلیقہ ہے تہذیبِ غم سمجھنے کا
انہیں کے رونے میں آنسو نظر نہیں آتے

غم کو تہذیبِ غم بننے میں اک عمر لگتی ہے اس کے لیے ہزار آنسو کی ضرورت نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے غموں کو اپنانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ سب کے رنج و غم میں شریک ہو کر ہی تزکیۂ نفس کی یہ منزل آتی ہے کہ زندگی میں جتنے غم ہوتے ہیں غنچۂ حیات اسی قدر تبسم اختیار کرتا ہے اور یہ شعر خلق ہوتا ہے:

زندگی کتنے زخم کھائے ہے
پھر بھی کیا شے ہے مسکرائے ہے

دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ زندگی، غم اور انسان کی تثلیث کو سمجھے بغیر ایسے اشعار تفہیم کس طرح ممکن ہے، اسی سے وسیؔم کی کائناتِ غزل کی تشکیل ہوتی ہے۔

وسیم کی شاعری کا ایک اور وصف جو انہیں آج کا مقبول شاعر بناتی ہے وہ ہے ان کی عصری حسیت یعنی اپنے عہد سے والہانہ وابستگی اور سپردگی۔ عہد سے مراد تاریخ یا جغرافیہ نہیں بلکہ تہذیب، معاشرت، اخلاق انسانیت وغیرہ۔ سب جانتے ہیں کہ عصرِ حاضر اپنی تمام تر مادی ضرورتوں کے باوجود تہذیبِ انسانی کو بری طرح متاثر کر چکا ہے۔ مال و دولت، صارفیت، یاسیت وغیرہ نے آج کے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے جس سے سماج تو متاثر ہوا ہی ہے فنونِ لطیفہ اور شعر و ادب بھی متاثر ہوئے ہیں۔ وسیم مشرقی یو۔پی کے باشندے ہیں، مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور پروردہ، یہی ان کا اثاثہ ہے اور توشہ بھی۔ لیکن دور وہ ملا جہاں مشرق و مغرب متصادم ہیں، قدیم و جدید کا ٹکراؤ ہے، ہر طرح کی شکست و ریخت ہو رہی ہے، انسانیت پامال ہو رہی ہے، قدروں کا زوال ہے، ان سب کو دیکھ کر وسیم کو ملال ہے۔ ایک کرب ہے جو قطرہ قطرہ ان کے احساس و شعور میں جذب و پیوست ہو رہا ہے اور تحلیل ہو کر ان کے رومان و وجدان کا لاشعوری حصہ بن رہا ہے، اپنے وجدانی عمل سے خیالات کی تجسیم ہو رہی ہے، شاعری کی تخلیق ہو رہی ہے۔ یہ کرب وسیؔم کا فکر انگیز اور معنی خیز اثاثہ ہے۔ ہر شخص و شاعر کے اپنے ذاتی تجربات ہوتے ہیں، ہر دور کے ہوتے ہیں اور پھر اجتماعی دور اور انفرادی ذوق ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، ایک وحدت کی تعمیر ہوتی ہے، یہ حدت بصیرت میں تبدیل ہوتی ہے، وجدان کے قالب میں ڈھلتی ہے، یہ ایک غیر شعوری اور باطنی عمل ہوا کرتا ہے لیکن اس کی تعمیر و تشکیل میں خارجی عوامل ہی کام کرتے ہیں۔ جو لوگ اسے الہامی یا باطنی وغیرہ کا نام دیتے ہیں وہ دراصل ادب کے سماجی کردار سے واقف نہیں ہوتے اور انجانے میں وہ ادب کے سماجی کردار کو چھین لیتے ہیں، اس مختصر گفتگو کی روشنی میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اچھا ہے جو ملا وہ کہیں چھوٹتا گیا
مُڑ مُڑ کے زندگی کی طرف دیکھتا گیا

☆

ذرا سا قطرہ کہیں آج اگر اُبھرتا ہے
سمندروں ہی کے لہجے میں بات کرتا ہے

☆

ہر شخص دوڑتا ہے یہاں بھیڑ کی طرف
پھر بھی یہ چاہتا ہے اسے راستہ ملے
گھر سجانے کا تصور تو بہت بعد کا ہے
پہلے یہ طے ہو کہ اس گھر کو بچائیں کیسے

☆

اسی کو جینے کا حق ہے جو اس زمانے میں
اِدھر کا لگتا رہے اور اُدھر کا ہو جائے

☆

آواز کا لبوں سے بہت فاصلہ نہ تھا
لیکن وہ خوف تھا کہ کوئی بولتا نہ تھا

☆

جب اپنے لوگ ہی آئینگے لوٹنے کے لیے
تو دوستی کا تقاضا ہے گھر کھلا رکھنا

ایسے نہ جانے کتنے اشعار ہیں جن میں عہد حاضر کی نرم گرم کیفیت، عصری حسیت بولتی نظر آتی ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ وسیم نے اسے زندگی کی حرکت وحرارت کے طور پر لیا ہے، اسی لیے اس میں جلال ہے اور کمال بھی، طنز بھی ہے اور ملال بھی، لیکن شاعری کا جمال کہیں الگ نہیں ہوتا۔ مشاعرے کے دیگر جلالی شاعروں کو یہ اندازہ نہیں ہوتا، شاید انہیں علم بھی نہیں کہ جلال، غصہ، احتجاج یہ سب انسانی واخلاقی اوصاف ہیں، اگر انہیں سلیقہ، مناسب راستہ اور ایک نظریہ مل جائے تو اسے کبھی جوشؔ کا مرتبہ ملتا ہے، کبھی فیضؔ وسردارؔ کا، وسیمؔ کا امتیاز یہی ہے کہ وہ ان سب کو ایک جمالیاتی احساس سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ہے کہ جمالیات اب محض سبک وروایتی تصورِ حسن سے منسوب نہیں رہ گئی بلکہ ایک اچھی دنیا کا خواب ،صحت مند معاشرہ اور خوش حال انسان سے رشتہ استوار کر چکی ہے۔ وسیمؔ نے دنیا دیکھی ہے، اک عمر گزاری ہے، ہر طبقہ کے انسانوں سے یاری کی ہے، علم وشعور بھی حاصل کیا ہے، اس لیے وہ اپنے تمام مشاہدات وتجربات کو اسی دنیا کو لوٹا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے فکر ونظر کے ساتھ شاعرانہ تیور کے ساتھ سنجیدہ جمالیات کے ساتھ اسی لیے ان کی شاعری میں سادگی ہے، تاثیر بھی اور پیغام بھی۔ چند شعر اور دیکھئے:

کبھی لہو سے بھی تاریخ لکھنی پڑتی ہے
ہر ایک معرکہ باتوں سے سر نہیں ہوتا

☆

دنیا کو دوسروں کی نظر سے نہ دیکھئے
چہرے نہ پڑھ سکے تو کتابوں سے کیا ملے

''کبھی لہو سے بھی تاریخ لکھنی پڑتی ہے''، ''چہرے نہ پڑھ سکے تو کتابوں میں کیا ملے'' یہ مصرعے نہیں محاورے ہیں اور محاورے زندگی کے تجربات اور جدوجہد کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ شاعر کا تصور تخیل رومان ووجدان انسان اور انسانی معاشرے سے وابستہ ہو اور اسے بہتر سے بہتر کی خواہش اور کوشش تو مشاہدہ کو تجربہ اور تجربہ کو فلسفہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ دنیا کے تمام بڑے شعرا کی بلند پروازی اسی وقت دکھائی دیتی ہے جب وہ انسانی معاشرے سے تخلیقی طاقت حاصل کرتے ہیں، عوام سے بصیرت حاصل کرتے ہیں کہ عوام خواص سے زیادہ متنوع، کار رنگ اور عقل وفراست سے بھرے ہوتے ہیں۔ فردوسیؔ، کالی داسؔ، کبیرؔ، نظیرؔ، میرؔ، غالبؔ، جوشؔ، فیضؔ وغیرہ سب کے سب عوام کے شاعر ہیں اور عوام نے ہی انہیں زندہ بھی رکھا ہے۔ اسی قبیل کے شاعر ہیں وسیم بریلوی، جنہوں نے کبھی خواص کی پرواہ نہ کی۔ نقادوں کو خاطر میں نہیں لائے کہ انہیں اپنے عوامی مشاہدات، تخلیقی تجربات اور مخلصانہ وابستگی پر اس قدر اعتماد ویقین ہے اور ان کے تئیں ان کی شاعری کا جو مشن ہے اور مقصد ہے بس وہ پورا ہوتا دکھائی دے اور وسیم نے اپنے تئیں اسے پورا کر کے دکھایا بھی۔ یہ الگ بات کہ دنیا اتنی بدل چکی ہے یا بگڑ چکی ہے کہ بظاہر ایک اکیلا شاعر کیا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شاعری نے زمانے بدلے ہیں، سماج کو بلا ہے یا بدلنے کے لیے حالات تیار کیے ہیں۔ کوئی تو بات ہے کہ وسیم کی شاعری میں عوام کے دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہے، رات رات بھر جاگ کر ان کی شاعری سنی اور پسند کی جاتی ہے، محض تفریح کے لیے نہیں، محض آواز کے لیے بھی نہیں بلکہ اُس سوز وگداز کے لیے اُن جذبات کے لیے جو عوام ایک شاعر سے توقع رکھتے ہیں، ایک سیاسی لیڈر یا مذہبی پیشوا کی بات بھی اتنی محبت اور توجہ سے نہیں سنی جاتی جتنی کہ ایک سادہ لوح مخلص اور سچے عوامی شاعر کی شاعری سنی جاتی ہے، وسیم جس کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ عقل ونقد کی عیاریاں ہزاروں بھیس بدلتی ہیں کبھی تغزل کے نام پر کبھی شعریت وادبیت اور کبھی ادب عالیہ کے نام پر لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی بھی شعریت وادبیت انسانیت سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ شاعری ہو، مصوری یا فنونِ لطیفہ کی کوئی قسم، سب کا محور ومرکز انسان ہے۔ اس کی سلامتی بہبودی، بہتر انسانی معاشرہ کا خواب دیکھنا ہی اپنے آپ میں شاعری کا کمال ہے اور معاشرہ کا جمال۔ یہیں سے شعریت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور جڑوں تک پہنچتی ہے، خواہ وہ راستہ تصوف کا ہو، رومان کا یا اشتراک کا یا کل ملا کر انسانی دوستی کا، مشکل بات کو مشکل انداز میں کہنا بھی بڑی شاعری نہیں ہوتی، مشکل کو آسانی سے پیش کرنا وہ مشکل فن ہوا کرتا ہے۔ استعارہ سازی، صنعت گری سب شاعری کے زیور ہو سکتے ہیں کہ شاعری بہرحال عام گفتگو نہیں ہے لیکن یہ سارے قواعد صرف اس لیے کہ خیال میں تاثیر اور کشش پیدا ہو لیکن یہ ساری چیزیں اگر پیچیدگی پیدا کر رہی ہیں تو قارئین وسامعین اُدھر کا ہی رُخ کریں گے جہاں بقول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیا وجہ ہے کہ ان دنوں ادب کے قارئین کی تعداد جتنی گھٹ رہی ہے مشاعروں کے سامعین کی اتنی ہی بڑھ رہی ہے؟ وسیمؔ کی شاعری کی عالمی مقبولیت وشہرت کو دیکھتے ہوئے اس سوال پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں حبیب جالبؔ کی شاعری کو سننے کے لیے لاکھوں کا مجمع پلٹ آتا تھا اور افتخار جالب کو خواص بھی ٹھیک سے نہیں پڑھتے۔ ہندوستان میں کم وبیش یہی کیفیت کل کیفی اعظمی، وامق جونپوری، نازش پرتا پگڑھی وغیرہ کی تھی آج وسیمؔ بریلوی کی ہے۔

یہ اعتراف کہ عمدہ پُر اثر شاعری کے لیے فنی شعور سے واقف ہونا ضروری ہے لیکن بڑی شاعری کے لیے صرف اتنا کافی نہیں اس کے لیے تو گہری سماجی بصیرت اور پختہ تہذیبی شعور کی زیادہ ضرورت ہے۔ جس شاعر کی نظر تاریخ، تہذیب، معاشرہ پر نہیں ہے وہ تھوڑی دیر کے لیے طوطے مینا تو اُڑا سکتا ہے گل کو مہکا اور بلبل کو چہکا سکتا ہے لیکن بڑی اور بامقصد شاعری سے وہ کوسوں دور ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ وسیم نے مشاعرے کے عام شائقین اور کم پڑھے سامعین کے لیے سپاٹ اور معمولی شاعری کی ہے۔ مشاعروں کے شاعروں پر ان دنوں یہ تہمت لگا دی جاتی ہے لیکن میں وسیم صاحب کو صرف مشاعرے کا شاعر نہیں مانتا اور اگر ہیں بھی تو بھی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اپنے خول میں بند رہ کر شعریت اور جدیدیت کے نام پر الجھے اور الجھائے رکھنے سے بہتر ہے عام سامعین کی تربیت کرنا، انہیں بند کمرے (ٹی۔وی) کے اندھیرے سے نکال کر کھلے آسمان کے نیچے لانا اور شعرو ادب کی روشنی پھیلانا اور شاعری کو عام کرنا اور زبان وادب کی خدمت کرنا، وہ کام جو کبیر نے کیا، نظیر نے کیا، بہت بعد کے دور میں بیکل اور نذیر نے عوامی شاعری کی ایک تاریخ رقم کر دی۔ نظیر اکبر آبادی نے نذیر بنارسی تک۔ اس کی شہرت و مقبولیت اور غیر معمولی خدمت سے انکار کرنے کی کون ہمت کر سکتا ہے۔

ادب وتنقید کے لیے کتاب یا شعری مجموعوں کی شرط ہے تو وسیم کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ انہیں مشاعرے کے اسٹیج سے اُتار کر ان کے شعری مجموعوں میں تلاش کیجیے۔ ادبی خلوص، تنقیدی دیانت داری کے ساتھ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کیجیے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پُر کاری، استعارہ سازی اور صنعت گری کے بجائے سادگی اور شفاف بیانی پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ کچھ نام نہاد نقاد اسے شاعری کا معیار نہیں مانیں گے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ اس نوع کی شاعری میں مشکلات اور خطرے زیادہ ہیں اس لیے کہ اگر جذبہ یا تجربہ سادگی میں سنجیدگی یا کوئی نیا پہلو نہیں نکالتا، نیا درد، نیا احساس، نیا ادراک و شعور پیش نہیں کرتا تو سفر دور تک نہیں جا سکتا۔ سہل ممتنع کے ہی ایک شاعر پر لکھتے ہوئے ممتاز جدید ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ''شاعری جب تک آپ کو تجربہ کا کوئی نیا پہلو نہ دکھائے، معنی کا کوئی مزید امکان نہیں پیدا کرے تب تک اسے تفریح کا ذریعہ تو شاید قرار دے سکتے ہیں لیکن ہر تفریح کی طرح یہ تفریح بھی وقتی ثابت ہوگی'' اور یہ بالکل سچ ہے کہ سہل سادہ مزاج کا شعر اگر زندگی کا مشاہدہ، تجربہ یا عرفان یا اس کی ایک جھلک بھی پیش نہیں کرتا تو اس کے کمزور، ناکام ہو جانے کے امکان بنے رہتے ہیں۔

وسیم بریلوی نے ایک دنیا دیکھی ہے، ایک جُگ جیا ہے، ایک مخصوص شعری وتہذیبی پس منظر میں آنکھیں کھولی ہیں۔ اساتذہ کے قدموں میں بیٹھے ہیں، تجربات کا انبار ہے، اسفار کی کثرت، زبان وبیان پر قدرت ہے، وہ چاہتے تو رعب علم سے نقادوں کو متوجہ کر لیتے، تنقیدی مضامین لکھوا لیتے، لیکن تا بہ کے۔۔۔ یقیناً یہ سفر مختصر ہوتا، عارضی زندگی ہوتی، ناکامی اور بدنامی کے خطرے بھی لاحق رہتے، اس لیے انہوں نے پوری سادگی اور ایمانداری کے ساتھ کسی قسم کا دعویٰ کیے بغیر سادہ اور فطری انداز میں اپنے شعری سفر کو جاری رکھا۔ سہل ممتنع کے دائرے میں ہی اپنی تخلیق کو محصور رکھا۔ اس لیے کہ ان کا خطاب چند ناقدین و قارئین سے نہ تھا بلکہ اردو کے عام سامعین اور شائقین سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس شعوری اور جمالیاتی عمل کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے اور سہل ممتنع کی سب وسادہ شاعری میں سنجیدگی و بالیدگی بھر دی۔ آسان لہجہ، زبان سادہ لیکن بات گہری اور آج کی۔ چند اشعار دیکھئے:

زندگی پھول سی نازک ہے، مگر خوابوں کی
آنکھ سے دیکھ تو کانٹا سی نظر آئے ہے

☆

لہو نہ ہو تو قلم ترجماں نہیں ہوتا
ہمارے دور میں آنسو زباں نہیں ہوتا

☆

زندگی ہے اور دلِ ناداں ہے
کیا سفر ہے اور کیا سامان ہے

☆

سب اندھیروں سے کوئی وعدہ کئے بیٹھے ہیں
کون ایسے میں مجھے شمع جلانے دے گا

☆

مرے چراغ الگ ہیں تیرے چراغ الگ
مگر اُجالا تو پھر بھی جدا نہیں ہوتا

پتہ نہیں کب اور کیسے مشاعرے کی شاعری اور کتب و رسائل کی شاعری الگ ہوگئی، جب کہ دونوں ہی چراغ ہیں اور دونوں کے اُجالے الگ الگ نہیں ہیں مگر جن کی ہتھیلیوں میں دیے ہیں، انہیں کے نیچے اندھیرا ہے یعنی چراغ تلے اندھیرا۔ وسیم بریلوی نے مشاعرے میں جیسی بھی مقبولیت حاصل کی ہو مشاعرے کا معیار اب کیا سے کیا ہوگیا۔ یہاں یہ سب میرے مسائل نہیں ہیں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ جن مشاعروں میں میں نے انہیں سنا ہے، میں نے کبھی انہیں معیار سے نیچے اُترتے نہیں دیکھا بلکہ جو لوگ اُترے تو انہیں عالمِ کرب میں دیکھا۔ شاید ایسے ہی شاعروں کے لیے انہوں نے کہا:

کبھی لفظوں سے غداری نہ کرنا
غزل پڑھنا اداکاری نہ کرنا
عمر ساری تماشوں میں گزری مگر
میں نے خود کو تماشا بنایا نہیں

اب میں ان کی ایک مکمل غزل پیش کرتا ہوں، ذرا اس کا آہنگ دیکھئے اور کسی بھی جدید غزل کو سامنے بھی رکھ کر دیکھئے۔

کیا دُکھ ہے سمندر کو بتا بھی نہیں سکتا
آنسو کی طرح آنکھ تک آ بھی نہیں سکتا
تو چھوڑ رہا ہے تو خطا اس میں تری کیا
ہر شخص مرا ساتھ نبھا بھی نہیں سکتا
اُسے ڈسے جاتے ہیں زمانے کے سوالات
کس کے لیے زندہ ہوں بتا بھی نہیں سکتا
گھر ڈھونڈ رہے ہیں مرا راتوں کے پجاری
میں ہوں کہ چراغوں کو بجھا بھی نہیں سکتا
دیکھنے کو اک آنسو ہی بہا کر مجھے لے جائے
ایسے کوئی طوفان بلا بھی نہیں سکتا

سمندر، آنسو، دُکھ، خطا، سوال، چراغ، طوفان ان سب نے مل کر صرف اس غزل کا ہی نہیں وسیم نے پوری غزلیہ شاعری کا ہیولیٰ تیار کیا ہے۔ اس میں دکھ ہے اور سوز وگداز بھی، کہیں سوال، ملال اور کہیں جلال بھی۔ انہیں عناصر سے وسیم کی شعری جمالیات کی تشکیل ہوئی ہے جو مشاعرے اور شاعری کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری اور دھند کی وجہ سے اُردو تنقید کو نظر نہیں آتی۔ کچھ وسیم نے بھی تنقید کو منہ نہیں لگایا لیکن عمدہ شاعری، عوامی شاعری تنقید کی بیساکھی کی محتاج نہیں ہوتی وہ وقت کا سینہ چیر کر اپنا مقام بنا ہی لیتی ہے، ہمیں وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

وسیم بریلوی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور گیت بھی کہے ہیں اور وہ بیحد مقبول بھی ہوئے ہیں لیکن ان پر گفتگو پھر کبھی کہ نظم اور گیت ایسی غیر معمولی اصناف ہیں جن پر تنقید نے انصاف نہیں کیا۔ یہاں میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ ان کی نظموں میں انسان بولتے ہیں اور گیتوں میں ہندوستان اور غزلوں میں ان دونوں کی دھڑکنیں۔ جذبات واحساسات اور شاعر کے ذاتی مشاہدات وتجربات جس سے ان کی مکمل شاعری کی تشکیل ہوئی ہے۔ وسیم کے جملوں پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں۔

''غزل میری ذاتی جذباتی، تربیتی مجبوری رہی تو نظم تہذیبی دائروں میں رہ کر خود سے بے تکلف ہونے کی آرزو اور گیت بچپن کے گاؤں کی خفیہ آنکھ مچولیوں کی دھما چوکڑی کے کبھی نہ بھلائے جانے والے بے ضرر لمحات کی رومان انگیز، رومانی بازیافت۔ کل ملا کر زندگی کے ہلکے گہرے رنگ کسی نہ کسی فارم میں آپ سے میری اپنی زبان اور اپنے انداز میں بات کرتے نظر آنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی بھی تجربہ ارزاں یا بے وقعت نہیں بس پیش کرنے کا سلیقہ ضروری ہے۔ فارم میرے لیے مسئلہ نہیں رہا، ہاں کنٹینٹ ضرور میری اولیت ہے اور رہے گا لہٰذا جو بات غزل نہ کہہ سکی، اس کے لیے نظم کا سہارا لینے میں تامل نہیں کیا۔ جو کیفیت دونوں کے دائرہ اختیار سے باہر دِکھی اُسے گیت میں ڈھالا۔''

''ہوا میں اُڑنے کی دُھن''

شاعری میں وسیم بریلوی کی آواز ایک نئی آواز ہے۔ اپنے معاصرین سے الگ، ان کی شاعری نکھری ہوئی اور ستھری شاعری ہے اور صحت مند عناصر سے لبریز ہے۔ علائم اس شاعری میں مزید حسن پیدا کرتے ہیں۔ زبان میں فصاحت اور شائستگی ہے اور بیان میں ندرت اور شگفتگی۔ وسیم نے فنی لوازم کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے تخیل سے ان کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔

اس فنی محاسن کے علاوہ ان کے کلام میں فکری اعتبار سے احتجاج، مزاحمت اور انقلاب کی ایسی کیفیتیں نظر آتی ہیں جو ان کے فن میں ڈھل کر خوبصورتی کا مظہر بھی بنتی ہیں اور سماج کو اُس کی خرابیوں سے آگاہ بھی کرتی ہیں۔ وسیم بریلوی کا کمال فن یہ ہے کہ احتجاج اور مزاحمت کی کیفیت شعر کے حسن بیان سے کٹ کر الگ طور پر اپنا اظہار نہیں کرتی بلکہ شاعری کے ساتھ یک جان ہو کر ایک دلکش فن پارے کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ایک ایسی معراجِ فن ہے جو ہر شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اوپر کی چند سطروں میں جو کچھ میں نے کہا ہے یہ فکر کو جذبے میں تحلیل کرنے کے عمل کی بات کی ہے یہ فکر محسوس بنانے کا عمل ہے اور یہی وہ عمل ہے جس سے ہمارے اُردو کے اکثر شعراء بے خبر ہیں۔ اس فکری انداز کو وسیم نے شعریت کے پیکر میں بہت خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔

لوگ کچھ بھی کہیں اور میں چپ رہوں
یہ سلیقہ مجھے جانے کب آئے گا

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (●)

رومان وحقیقت کا شاعر

ڈاکٹر سحر انصاری (کراچی)

اس زمانے میں ایسے شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں جو بیک وقت ادبی حلقوں اور مشاعروں میں یکساں طور پر پسند کیے جاتے ہیں۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قبولیت سخن کے ان دونوں معیارات کا یکجا ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ادب کی دنیا میں شاعری کے محاسن کو پرکھنے کے پیمانے الگ ہیں۔مشاعروں میں مقبولیت کے اسرار و رموز مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اچھے خاصے مقبول شعراء نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ مشاعرہ پڑھنے اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کا تعلق پرفارمنگ آرٹ (Performing Art) سے ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں جب میں پروفیسر وسیم بریلوی کے بارے میں سوچتا اور محسوس کرتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ان شاعروں کی محدود صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کو کاغذ اور فرشِ مشاعرہ پر یکساں مقبولیت حاصل ہے۔اس غیر معمولی کامیابی میں وسیم بریلوی کی شخصیت کا بھی بڑا دخل ہے۔یہ الگ بات ہے، بیسویں صدی کی تنقید و شاعری پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے شاعر اور نقاد ٹی ایس ایلیٹ شخصیت کے اظہار کا قائل ہی نہیں۔وہ کہتا ہے کہ شاعری شخصیت سے گریز بلکہ بتدریج شخصیت کو معدوم کر دینے کا نام ہے۔اس کے بعد ہم خیال شاعر و نقاد ہمارے یہاں بھی اس نقطۂ نگاہ کو قدر سے دیکھتے ہیں تاہم یہ بات طے ہے کہ کوئی شاعرانہ اظہار بھی مکمل طور سے غیر شخصی (Impersonal) نہیں ہو سکتا۔ہمارے مشرقی شاعروں کا موقف تو یہی رہا ہے:

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اور ایک منزل پر غالبؔ جیسے شاعر کو بھی کہنا پڑتا ہے:

اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

تو شاید ساری بات اور کامیابی کا سارا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ شاعر اپنی زندگی کے کتنے تجربات اس طرح ادا کر سکتا ہے کہ وہ سامع یا قاری کے دل کی آواز معلوم ہو۔اس ضمن میں دو شرطیں تو غالباً وہی ہیں جو یونان کے قدیم نقادوں نے متعین کر دی تھیں۔ایک یہ کہ کلام صداقت پر مبنی ہو، دوسرے وہ حظ و مسرت کا ذریعہ بنے۔

وسیم بریلوی کے کلام میں یہ دونوں عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد مفروضات اور رسمیات پر رکھی ہے بلکہ وہ بعض اوقات سفاکانہ حد تک صداقت پرست اور حقیقت پسند ہو جاتے ہیں۔اس عہد کے منافقانہ رویوں اور سیاست چمکانے کے حربوں کو ان اشعار میں کس طرح بے نقاب کیا ہے۔

مرے بچوں کے آنسو پونچھ دینا　　لفافے کا ٹکٹ جاری نہ کرنا

اس شاعری کے پردے میں کتنی سچی اور ان کہی کہانیاں پوشیدہ ہیں۔سوچتے جائیے اور وسیم بریلوی کی قدرت اظہار کی داد دیتے جائیے کہ کیسے Crude مضمون کو سہل ممتنع میں ڈھال کر شاعری بنا دیا اور شاعری بھی ایسی کہ سنتے ہی شعر دل میں ترازو ہو جائیں۔

یہ تو وسیم بریلوی کی شاعری کا ایک رُخ ہے جس کی معنویت گرد و پیش کے حالات کی نسبت سے واضح ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ حسن و عشق کی دھوپ چھاؤں اور زندگی کی جمالیات بھی شاعری کی دنیا کا ایک بڑا اور اہم حصہ ہے۔اس زاویے سے بھی وسیم بریلوی کی شاعری اپنا ایک مختلف اور دلکش رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔سچائی اور کبھی کبھی سفاکی یہاں بھی کم نہیں ہے لیکن وسیم بریلوی شاخ گل اور تلوار میں فرق کرنا جانتے ہیں۔

وسیم بریلوی نے اس دور میں غزل کی روایت کو پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے اور لطف یہ کہ اُن کی غزل کہیں بھی روایتی نہیں ہونے پاتی۔روایت کو وہ شاعری کے تہذیبی ورثے کے طور پر اپناتے ہیں اور اس میں اپنی تخلیقی انفرادیت کے رنگ اجاگر کرتے جاتے ہیں۔

وسیم بریلوی کے یہاں لسانی رویے میں بھی ایک نوع کی لچک اور گنجائش ملتی ہے یہ ہندوستان کی مخصوص لسانی فضا کے لیے ضروری بھی ہے۔وسیم بریلوی کے کلام میں موسیقیت اور غنائیت تخلیقی طور پر موجود ہوتی ہے تاہم ہندی کے بعض مترجم اور سجل الفاظ کی آمیزش سے اُن کے اشعار اور بھی اثر انگیز ہو جاتے ہیں۔یہ صنف وسیم بریلوی میں ایک فطری اور تخلیقی جوہر کے طور پر ہے اسی لیے اُن کے گیت بھی بہت خوبصورت اور رس سے بھرے ہوتے ہیں۔گیتوں کی سی غنائیت اور ڈرامائی کیفیت وسیم بریلوی کی غزل میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔اکثر اُن کے اشعار کا دوسرا مصرعہ غیر متوقع ڈرامائی انداز میں ادا ہوتا ہے۔اس میں اکثر ایک قسم کا Paradox در آتا ہے جو وسیم بریلوی کے اسلوب کی خاص پہچان بن چکا ہے۔

اردو دنیا میں جہاں کہیں بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوتے ہیں وہاں وسیم بریلوی کو بطور خاص مدعو کیا جاتا ہے۔اُن کی شرکت عالمی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔اسی طرح وسیم بریلوی کے شعری مجموعے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور ان کے کلام کے شائقین کسی نئے مجموعے کے انتظار میں رہتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں ہی کہا ہے کہ وسیم بریلوی کی شاعری اُن کی شخصیت کا پرتو رکھتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وسیم بریلوی ایک مخلص، کھرے سچے، خوش اخلاق اور کمٹمنٹ کے آدمی ہیں۔ان سے مل کر آپ محسوس کریں گے کہ وسیم بریلوی ہمہ محبت کا نام ہے۔اُن کے لہجے کی حلاوت، اظہار کا خلوص اور زیرِ لب تبسم پوری شخصیت کو ایک تہذیبی شخصیت میں ڈھال دیتا ہے اور آپ اُن کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام کی کونپلیں پھوٹتی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ اس مشینی اور صنعتی دور میں آپ وسیم بریلوی سے مل کر تہذیب اور شائستگی کے کسی سائبان تلے آ بیٹھے ہیں۔یہ وصف کتنے شعراء میں ہے؟ یہی سبب ہے کہ وسیم بریلوی کو ایوانِ ادب اور مشاعرے کے پنڈال میں یکساں پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔

چراغ کا مکاں

عشرت ظفر
(کانپور، بھارت)

ادب نہ تو کسی تحریک کے زنداں میں اسیر ہوتا ہے نہ کسی رجحان کے دشت میں رنج مسافرت برداشت کرتا ہے۔ کسی عہد کی فصیلوں میں قید نہیں ہوتا۔ کسی زمانے کی زنجیر کو اپنے پیروں آنے نہیں دیتا۔ سال و ماہ، لمحات سب اس کی گرفت میں ہوتے ہیں، وہ کسی کی گرفت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تو نیلگوں بیکراں خلاؤں میں ایک ایسے آزاد توانا پرندے کے مانند ہے جس کے شہپروں میں بے کنار وسعتیں ایک منظرِ بے رنگ کی طرح پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں۔ ایک ایسا آئینہ جو اپنے گرد و پیش کے دُھندآلود مناظر کو سمیٹ کر رکھتا ہے، اُسے لفظوں کی شریانوں میں خونِ گرم کی طرح بہنے پر مجبور کرتا ہے۔

چنانچہ جب تخلیق کی صورت حال یہ ہے تو اُس کے تخلیق کار کا مزاج بھی سچائی، بے نیازی، آزادی اور حرمت جیسے عناصر سے بنتا ہے، پھر جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ اسی قدر اشرافیت سے بلند و عظیم منصب پر فائز ہوتا ہے، جس قدر کہ فنکار یا تخلیق کار۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو نقوش ہم دیکھتے ہیں وہ اپنے آپ میں غیر فانی ہیں، جمالیات کا آمیزہ ہیں، وہ وقت کے بے کنار صحرا میں اس طرح سفر کرتے ہیں کہ ان کے نقوشِ قدم کی تہوں سے ہزاروں آفتاب اُبھرتے ہیں، گویا ایک سلسلۂ نور ہے جو زمان و مکان پر محیط ہوتا ہے۔ نہ کسی کا پابند نہ کسی کا اسیر۔ خوش خرامی کے سحر میں ملفوف، خود میں مکمل۔

ان سطور کے سپردِ قلم کرنے کی ضرورت مجھے اس لیے محسوس ہوئی کہ وسیم بریلوی کا شعری منفرد "مزاج" میرے پیشِ نگاہ ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ کچھ اس قسم کے ہیں، اس شعری مجموعے کی غزلیں پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ وسیم کی انگلیاں نگارِ عوام کی نبض پر ہیں اور اس متحرک عمل سے وہ اس کے دل کی توانا دھڑکنوں تک بخوبی پہنچ رہے ہیں اور وہی رقم کر رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش ظہور پذیر ہو رہا ہے یعنی اُن کا آئینۂ احساس سارے مناظر کو سمیٹ رہا ہے انہیں آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ کر رہا ہے۔

وسیم بریلوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اس شعری مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ حالانکہ اس کتاب میں ایک بے عنوان نظم بھی ہے۔ اس نظم کا تاثر اس قدر گہرا ہے کہ یہ احساس چمک اُٹھتا ہے کہ آخر شاعر نے مزید نظمیں کیوں نہیں لکھیں اور اگر لکھیں تو اس کتاب میں شامل کیوں نہیں کیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر شعلہ تاثیر نظم کے تخلیق کار سے یہ امید نہیں رکھنا چاہیے کہ اس نے مزید نظمیں نہیں لکھی ہوں گی، دیکھیے۔

یہ عارض ترے
جیسے بوسیدہ قبریں
یہ عارض ترے
بوسہ گاہِ حوادث
جو شاداب رہتے
تو اوراقِ دوراں
ہزاروں فسانوں سے محروم رہتے

اس نظم میں انسانی زندگی کی صباحت، لطافت، شکستگی، بوسیدگی کی ایک عظیم تاریخ بیان کی گئی ہے، چند الفاظ پر مشتمل یہ نظم بے انتہا تاثر کی حامل ہے۔ عارض کو جس خوبصورتی سے بوسہ گاہ حوادث کہا گیا ہے وہ شاعری کی فکر کے لیے حد و دو بے سمت جہانوں کا سراغ دیتا ہے۔

اس صورت میں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ آخر وسیم نے غزل ہی کو اپنے اظہار فن کا وسیلہ کیوں بنایا تو اس کا جواب یہ ہے کہ غزل میں اتنی سکت اور توانائی ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے زمانوں کو اپنے اندر سمیٹتی ہے اور اس طرح سمیٹتی ہے کہ جیسے سمندر بادی النظر میں تو پُرسکون نظر آتا ہے مگر اس کی تہوں میں سیماب صفت موجوں کا ایک جہانِ بسیط پوشیدہ ہوتا ہے۔ وسیم نے اپنی غزل کے ذریعہ صرف اپنے ہی پورے عہد کو نہیں سمیٹا ہے بلکہ ماضی کے گرد تلے دفن ساعتوں کے شہروں کی جلوہ نمائی بھی کی ہے اور مستقبل کے ان لمحوں کی آہٹوں کو بھی طلوع ہونے پر مجبور کیا ہے جو ابھی نا ہیں اور ان کی شکلیں ابھی کچھ نہیں ہیں، ان کے خد و خال اُجاگر نہیں ہیں بلکہ ان کے وجود کی آہٹیں باصرہ سے زیادہ سامعہ کی گرفت میں رہتی ہیں۔

اس طرح اگر میں اپنی بات یوں شروع کروں کہ جب میں وسیم کی غزل کے مطالعہ کی ساعتِ اول کی گرفت میں آیا تو اس ساعتِ اولیں کو ان کے حسنِ کلام سے شادابیت کا اکتساب کرتے ہوئے پایا۔ میں نے ایک خاص قسم کی قوسِ قزحی پھوار اپنے دل پر گرتی ہوئی محسوس کی۔ اس ساعتِ اول نے مجھے صرف سرشار ہی نہیں کیا بلکہ مجھے ایک ایسے قافلے کے گزرنے کی خبر دی جو نشاط و نور میں بھیگی ہوئی فضاؤں کا امانت دار تھا۔ میں نے اُن ستارہ خیز غزلوں کے مطالعہ کے دوران شگفتہ الفاظ میں معنی کی تہہ داریوں کے ایک جہانِ ہوش ربا کے وجود کا احساس کیا۔ اس طرح کہ جیسے عصرِ رواں کے زندہ متحرک لمحے میرے سامنے قطار در قطار آئینے لیے ہوئے ایستادہ ہوں اور مجھے ان عکسوں کا نظارہ کرا رہے ہوں جن کے رگ و پے میں شاعر کے افکار گہر ریز کے جاوداں لمحے رنگ و بو بن کر رواں ہیں۔ خوبصورت الفاظ میں معانی کی ایک بسیط و بے کراں اور عظیم الشان دنیا آباد ہے۔ یہ اشعار پیش ہیں:

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

دُور تک ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا
پھر بھی ہم جانے کیوں سر بچاتے رہے

☆

میں تجھ سے ملتاہوں تفصیل میں نہیں جاتا
مری طرف سے ترے دل میں جانے کیا نکلے

☆

بہت قریب ہوئے جا رہے ہو سوچو تو
کہ اتنی قربتیں جسموں سے کب سنبھلتی ہیں

☆

کہیں بھی جائے مری ہم سفر سی لگتی ہے
وہ راہ جس میں کوئی نقشِ پا نہیں ہوتا

ان پانچ اشعار میں ہر ایک کی بہجت آفرینی ایک نئے جہان کا دروازہ وا کرتی ہے، ایک نئی شاہراہ پرلے جاتی ہے، جہاں سنگِ میل نہیں ہوتے، یعنی یہ احساس معدوم ہوتا ہے کہ کس قدر سفر کرنا ہے یا پھر کس قدر سفر ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک خاص تازگی ہے پہلا شعر اپنی معنوی دنیا میں انتہائی کثیر الافقی حیثیت کا حامل ہے اور یہ تصور پیش کرتا ہے کہ روشنی ہی ایک حقیقت ہے کہ جس کے سامنے اندھیرا کسی بھی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ گویا یہ ایک عمل ہے کہ باطل کو مسلسل حق سے شکستِ فاش ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں چراغ یعنی روشنی کا مخزن زمانی ومکانی قید سے آزاد ہے۔ اس کا کام روشنی بکھیرنا ہے سووہ بکھیرتا ہے۔ اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ وہ کس جگہ ہے گویا وہ اس امتیاز سے آزاد ہے کہ وہ کس کے دستِ سفاک میں ہے یا پھر اس کے ساتھ جذبۂ ترحم وابستہ ہے۔ وہ اپنی فطرت کا قیدی ہے اور سرتاپا ابتہاج وسرخوشی کی علامت ہے اس کی درخشانی تو پھول کی کھلاوٹ سے سرشار ہے جس کا کام خوشبو پھیلانا ہے خواہ وہ ویرانے میں ہو یا پھر کسی گلشن میں بودوباش رکھتا ہو۔ اسی طرح یہ شعر ازل سے ابد تک پھیلی اس انسانی تاریخ کو واضح کرتا ہے جہاں مسلسل خیروشر میں شیریں جنگ جاری ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے سر بچانے کے ایک فطری عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہے کہ کسی ہاتھ میں پتھر نہیں ہے لیکن وہ سر بچا رہا ہے۔ اس عہد کو واضح طور پر بیان کرنا ہے جہاں خوف ودہشت شکوک وشبہات قدم قدم پر ہمارے راستوں میں حائل ہیں۔ ہر آہٹ ہمیں چونکا دیتی ہے، ہر نظر ہمیں اندر سے تھرّا دیتی ہے۔ ہم خوف ودہشت کے ماحول میں جی رہے ہیں یعنی ہم مسلسل اس انتباہ کے عمل سے گزر رہے ہیں کہ کسی بھی ہاتھ میں چھپا ہوا پتھر ہو سکتا ہے اس لیے ہم احتیاط سے زندگی گزار رہے ہیں یعنی ایک ایسی چیز سے خائف ہیں بادی النظر میں تو نہیں ہے مگر اس کے وجود کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

تیسرے شعر میں بھی اس قسم کا احساس موجود ہے۔ دوست کی قربت اس قدر عزیز ہے کہ اس بات کا خوف رہتا ہے کہ اگر یہ انکشاف ہو جائے کہ وہ دوست نہیں دشمن ہے تو سارا طلسم ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ چنانچہ شاعر ملتا تو ہے مگر تفصیل سے گریز کرتا ہے۔ اس شعر میں بھی دور حاضر کے احساسات کو پیش کیا گیا ہے کہ اس عہد میں انسان ایک ایسی زندگی جی رہا ہے جس کے ظاہر و باطن میں بے حد فرق ہے۔

چوتھا شعر جنس کی خوشبو سے لبریز ہے۔ یہ ایک خاص کیفیت کو واضح کرتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ بہت قربت بہتر نہیں ہے کیونکہ اس قدر قربتیں جسم برداشت نہیں کر سکیں گے، شوخیوں پر آمادہ ہو جائیں گے اور شوخیاں جنس کی مقدس خوشبو کو داغ دار کر دیں گی۔ اگر اس شعر میں پوشیدہ اعماق کی طرف جائیں کچھ شناوری کریں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان کس قدر اشرافیت کے درجات پر فائز ہے کیونکہ عشق تو بہرحال گناہِ آدم ہے اور گناہ بھی آدم کے عوامل سے ایک اہم چیز ہے۔ چنانچہ آب وخاک وبادہ آتش کے اس آمیزہ میں خاص بات یہی ہے کہ یہ جسم جب ایک دوسرے کے قریب ہوں گے تو پھر اتصال کا وہ لمحہ نمودار ہوگا جس سے تمام عناصر تروتازہ ہو جائیں گے، نکھر جائیں گے، انہیں ایک نئی شادابی ملے گی یعنی کہ ان عناصر کی تحویل میں جولذتیں اور اسرار ہیں وہ دونوں جسم ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کو تفویض کریں گے۔ اس طرح خاک شاداب ہوگی، شعلہ نکھرے گا، پانی کی آہستہ خرامی امواج کی شکل اختیار کرے گی۔ ہوا موجِ نسیم کے پیکر سے نکل کر ان آندھیوں میں شکل پذیر ہوگی جو جنگلوں کا سرتوڑ دیتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ انسان کے اشرف ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان عناصر کے اجتماع سے وہ وجود میں آتا ہے پھر اس کی ہر سانس ان عناصر کو حیات تازہ عطا کرتی ہے اور ان عناصر کے انتشار سے ہی اس کا اختتام ہوتا ہے گویا وہ ایک ایسے گہوارے میں ہے جہاں رنگ گل کاریاں مار رہے ہیں اور یہ غیر مختتم دائرہ ہی زندگی کے سفر بے نہایت سے عبارت ہے۔

پانچواں شعر جس میں ایک پُرسکوتِ بصری تجربہ بھی ہے، معانی کی سطح پر بہت بلند ہے یعنی یہ ایک انسان کے مزاج کا اکتسابی نہیں بلکہ وہبی عمل ہے کہ وہ راہ جس پر کسی نے سفر نہ کیا ہو کس کو راس آتی ہے۔ اسی پر چل کر وہ تمام مناظر سے مانوس ہوتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جن راہوں پر نقوش پا ہیں وہ دلیل ہیں اس بات کی کہ یہاں سے بہت لوگ گزرے ہیں، پھر یہ کہ نقوشِ پا سنگ میل کی شکل اختیار کر گئے ہیں کیونکہ نقوشِ پا ہی بتاتے ہیں کہ کس قدر سفر کیا گیا ہے لیکن ایک ایسی راہ جہاں نقوشِ پا نہ ہوں دوطرح کے تجربوں کی غماز ہے یعنی ایک تو مسافر کی نکہت سفر اور دوسری وہ لمسی کیفیت جو راہ کو پیر کے تلووں سے حاصل ہو رہی ہے یعنی قدم برابر نشانات ثبت کرتے جا رہے ہیں، ایک ایسی شاہ راہ جس پر اس سے پہلے کوئی نہیں چلا تھا یعنی یہ تمام تر کائنات ناتمام ہے اور اس میں مسلسل تغیر وتبدل کا عمل واقع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وسیم بریلوی کا فکری سرمایہ بڑی حد تک اکتسابی نہیں ہے۔ جو ان عناصر سے مملو ہے جو تجربوں، مشاہدوں، زندگی کی کربناکیوں، مسرتوں اور

سرشاریوں سے مخروج ہیں۔ان کے افکار کا دریا بہت عمیق ہے جس میں ہزاروں کشتیاں محوِ سفر ہیں۔لیکن یہ کشتیاں طوفانوں کی لذتون اور ذائقے سے واقف ہیں۔انہیں طوفانِ ناچشیدہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔یہ قدم قدم پر طوفانوں سے دو چار ہیں۔وسیم کی غزلوں میں بدیعیات کی فضا ہے جو صرف اپنے عہد کی اسیر نہیں ہے بلکہ ان کے جسموں پر ان لمحات کے سائے بھی ہیں جو ابھی وقت کے گہرے سیاہ سمندر سے طلوع ہونے والے ہیں۔

ہمارے عہد میں ایسے غزل گو شعراء ہیں جنہوں نے جدید لہجے کو براہِ راست قبول نہیں کیا ہے لیکن ان کے اشعار میں کہیں نہ کہیں جدیدیت در آئی ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ ادب کسی خاص تحریک ور جحان کے صحرا میں اسیر نہیں ہے۔وسیم بھی اِن میں سے ایک ہیں جن کے یہاں جدیدیت کا وہ خاص آہنگ تو نہیں ہے لیکن جو شگفتگی ان کے یہاں ہے وہ ایک آمیزہ ہے جو جدید قدیم لہجے سے مل کر سامنے آتا ہے اور یہی آمیزہ اُن کے یہاں ایک منفرد اسلوب تراشنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔اُن کے یہاں ایک تقسیم و ترسیل کی پیچیدگی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایک ابہام ہے جس میں ایک طرح کی غیر فانی گھلاوٹ ہے اور یہ گھلاوٹ بالکل اس طرح کی ہے کہ بادی النظر میں سمندر ساکت ہے مگر زیرِ سطح ایک اضطراب ایک کلبلاہٹ کا احساس موجود ہے۔

نئے عہد کی تخلیقیت کے صحت پیما نظام صدیقی نے اپنے ایک خیال افروز مقالہ ساخت شکن تنقید کا ایک اور تنقیدی مطالعہ مطبوعہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ اپریل ۱۹۹۲ء میں شعری اظہاریہ کے بارے میں یوں خیال ظاہر کیا ہے:

''کوئی شعری اظہاریہ فنکار کے فنطاسیہ،فکریہ جذبہ اور ارادہ سے ماورا نہیں ہوتا۔وہ صرف حواس خمسۂ ظاہری نہیں، حواس خمسۂ باطنہ کا بھی امین ہوتا ہے۔شعری ساخت کی بنیادی اکائی اشاریہ یا نشان ہے۔اشاریہ میں اشاریہ کنندہ اور اشاریہ کناں ہم آہنگ ہوتے ہیں۔''

وسیم کے یہاں شعری اظہاریوں کی یہی کیفیت ہے۔ وہ ایسی جدیدیت کی طرف نہیں بھاگتے جہاں فراریت کا نقطہ آغاز طلوع ہوتا ہے۔انہوں نے جدیدیت کو قبول کیا ہے مگر انتہائی سہل نگاری کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں بوجھل تراکیب، استعارات نہیں، دیکھئے:

غریب لہروں پہ پہرے بٹھائے جاتے ہیں
سمندروں کی تلاشی کوئی نہیں لیتا

☆

میں اس سے نظریں ملاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کہ آنکھوں آنکھوں میں وہ ذہن پڑھنے لگتا ہے

☆

تمام کھڑکیاں دروازے کھول ڈالے مگر
گھٹا ہوا تھا جو گھر میں دھواں وہ کم نہ ہوا
جہاں گلاب سا کھلتا کوئی نظر آئے
میں ایک شاخ کی مانند کانپ جاتا ہوں

ان اشعار میں شعری اظہاریہ پوری طرح نمودار ہوا ہے اور اشاریہ کنندہ اشاریہ کناں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، علاوہ ازیں بہت سے الفاظ حواس خمسۂ باطنہ کو متحرک و متاثر کرتے ہیں لیکن کانپ جانا، آنکھوں سے ذہن کا پڑھنا، نظر ملانا یہ سارے افعال بھی حواس پر اپنا پرتو تو ڈالتے ہیں، ایسا پرتو جس کے عقب میں رنگوں کی ایک قطار جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس طرح یہ احساس ابھرتا ہے کہ وسیم کی شاعری جدیدیت و ترقی پسندیت کی زنجیروں سے پاک ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک سچی کیفیت و لذت سے ہم آہنگ ہے۔

''مشاعرے کی آبروٗ''

دورِ حاضر کے شعراء میں پروفیسر وسیم بریلوی اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔غزل کا محور و مرکز لامحدود ہے۔وسیم صاحب کی شاعری اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ان کی غزلیں جہاں جمالیاتی تجزیہ پیش کرتی ہیں وہیں عصری حسیت، اجتماعی احساس اور جذباتی رشتوں و زندگی کے حادثوں کو منفرد انداز میں منظوم کرتی ہیں۔وسیم صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مشاعروں میں اپنی غزلیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مشاعرے کی تہذیب مجروح نہیں ہوتی بلکہ اپنی نرم آواز، سحر آگیں ترنم سے مشاعرے کی فضا کو مہکا دیتے ہیں۔وہ شور و غل مچانے والے شاعر نہیں ہیں بلکہ اپنی بات سادگی سے پیش کرنے کے قائل ہیں۔یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت بن جاتی ہے لیکن مشاعرے میں اِن کی شرکت اشد ضروری بھی گردانی جاتی ہے۔شاید اسی لیے پروفیسر وسیم بریلوی کو اردو مشاعرے کی آبرو بھی کہا جاتا ہے۔

صبا فردوس

قطرہ قطرہ لہو

عبدالاحد ساز
(ممبئی، بھارت)

پروفیسر وسیم بریلوی کو ہم ایک عرصۂ دراز سے اُن کی غزلوں کے حوالے سے جانتے اور پسند کرتے ہیں۔ ہندو پاک اور بیرونی ممالک کے مشاعروں میں اُن کی بے حد مقبولیت ہمیں اس لیے قابلِ تحسین لگتی ہے کہ اس مقبولیت میں اُن کی شخصیت، طرزِ ادا اور ترنم کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام کا ادبی و علمی سیاق بھی شامل ہوتا ہے۔ برعکس مشاعروں کے کئی مشہور شاعروں کے جن کی مقبولیت محض سامعین کی سطحِ سمعی ترجیحات تک محدود ہوتی ہے وسیم صاحب کتب و رسائل کی دنیا سے وابستہ قارئین کے ذہن و دل تک بھی رسوخ و رسائی رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشاعرے میں سنانے کے لیے بھی وہ اپنے جس نسبتاً عام فہم کلام کا انتخاب کرتے ہیں اس میں اُن کا تاریخی، تہذیبی، عصری شعور، شعری جمالیاتی ذوق کا رچاؤ اور زبان و بیان کی چاشنی خاصے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو مشاعروں میں اُن کا اس قدر پسند کیا جانا بجائے خود مشاعروں کے معیار کے تئیں ہنوز کچھ خوش آئند توقعات کا جواز فراہم کرتا ہے۔ مشاعرے کی شہرت اور ادبی قدر کا یہ خوش وقار توازن فی زمانہ معدودے چند شعرا ہی کو میسر ہے۔

جس شاعر کے کلام سے ہم ایک مانوسیت اور قربت رکھتے ہیں اُن کی ابتدائی تخلیقات کے مطالعے کا لامحالہ ایک خاص اشتیاق دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب برادرم حسیب سوز نے وسیم صاحب کی ابتدائی تخلیقات جو اُن کے عرصۂ قبل شائع شدہ مجموعے ''تبسمِ غم'' میں شامل ہیں، دستیاب کروائیں تو اک دلی طمانیت کا احساس ہوا۔ خاص طور پر یہ دیکھ کر کہ غزل کے اس البیلے متوالے شاعر کے آغازِ سخن میں نظم گوئی بھی ایک وافر تناسب رکھتی ہے۔ گزشتہ دو تین دہائیوں سے اردو نظم بہ اعتبار ہیئت آزاد نظم ہی تک مختص ہو کر رہ گئی ہے۔ پابند اصناف نظم میں بہت کم طبع آزمائی کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اگر غور کریں تو پابند نظم میں اب بھی امکانات اور انہیں از سرِ نو برتنے کی فنی گنجائش باقی ہیں۔ پھر پابند نظم کا لطف و حظ بھی اپنی جگہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اچھی آزاد نظم بھی فن پر بڑی قدرت و دسترس چاہتی ہے لیکن پابند نظم تو معنویت اور برتاؤ کے علاوہ تکنیکی سطح پر بھی قدرتِ کلام اور شعری قواعد کے التزام کی سوا متقاضی ہوتی ہے۔

''تبسمِ غم'' میں شامل نظموں کا ایک بڑا رقبہ عشقیہ نظموں پر محیط ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ آغازِ سخن اور ایامِ شباب کا باہمی رشتہ مسلم ہے۔ جو بات زیادہ جاذبِ توجہ ہے وہ یہ کہ ان نظموں میں رومانیت اور جذباتیت کے فطری انضمام کے ساتھ ساتھ زندگی کی واقعاتی حقیقتوں کی تدریج اور اُن کے ناگزیر ہونے کا احساس جا بجا ہے۔ لہٰذا یہ نظمیں دلکش اور خوبصورت تو ہیں مگر خیالی یا افسانوی نہیں بلکہ انفرادی تجربے کی صداقت سے مملو ہیں۔ شاید اسی لیے ان میں لفظیات اور پیرایۂ اظہار کی سطح پر ایک شخصی تازگی پنپتی ہے۔ مثلاً ایک قدرے طویل نظم ''میری تصویر'' ہے جو عشق کے جذبے اور تجربے کو بیان کرتی ہوئی محبت کے معاملات میں پیش آنے والے پیچیدہ سماجی معاشرتی اور تعلقاتی مراحل سے گزرتی ہوئی دائمی مفارقت کی منزل کو پہنچتی ہے اور حسرتِ ناکام کا ایک کامیاب شعری مرقع بنتی ہے۔ اس کی مثال میں یوں تو پوری نظم ہی پیش کرنی پڑے گی تاہم چند درمیانی کڑیاں شاید اس پروسس کی نشاندہی کے لیے ممد ہوں۔ یہ چار بند ملاحظہ کیجیے:

تمہاری پاک محبت پہ بدگماں نظریں
اٹھی ہوئی تھیں، مگر پھر بھی آ رہی تھیں تم
تمہارے آنے میں وہ بے تکلفی نہ رہی
اب ایک رسم تھی، جس کو نبھا رہی تھیں تم
بنی ہوئی تھیں محبت کا امتحاں نظریں
کس احتیاط سے اٹھتی تھیں بے زباں نظریں

☆

یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی
نئے سفر کو نیا دل بنا لیا تم نے
ان اعتبار فروشوں کی بستیوں سے دور
چراغِ شام غریباں سجا لیا تم نے
سحر کی نو مزاجی سپرد شام ہوئی
یہ مختصر سی کہانی چلو تمام ہوئی

☆

اُدھر شباب مرا شاعری میں ڈھلنے لگا
ادھر طبیب کے ہاتھوں سے نبض چھوٹ گئی
اُدھر میں شعروں میں دل کا لہو اُگلنے لگا
ادھر تمہاری جوانی کی شام آ پہنچی
جمی ہوئی تھیں نگاہیں فراز ساحل پر
اب اپنے پاؤں سفر میں تھے، آنکھ منزل پر

☆

غبار جس نے تمہیں دُور کر دیا مجھ سے
نگاہ بھر کے تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتا
تمہیں بھی میرے خد و خال کیا نظر آئیں
نہ جانے کب تک اُٹھے گا یہ خاک کا پردہ
وہ خاک جس نے تمہیں دُور کر دیا مجھ سے
غبار جس نے مرا خواب لے لیا مجھ سے

وسیم بریلوی کی نظم گوئی کا یہ زمانہ، وہ زمانہ ہے جب ادب میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر رومانیت میں سماجی حقیقت نگاری کی آمیزش ابھی پوری طرح مروج تھی، چنانچہ ان کے یہاں بھی اپنے پیش رو معاصرین کی طرح یہ امتزاج کئی جگہ نظر آتا ہے لیکن اپنے مشاہدے اور تجربے کی انفرادی شباہتوں کے ساتھ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وسیم کی بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے اختر شیرانی، مجاز، ساحر، جاں نثار اختر وغیرہ دُور دُور سے یاد آتے ہیں مگر اول تو اپنے پیش رو پسندیدہ شعرا کا اثر قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ دراصل ادبی روایت کے تسلسل ہی کا حصہ ہوتا ہے اور خود نمائندہ ہم عصر شعراء کے کلام میں بھی ایک دوسرے کا اثر بہ آسانی نظر آ جاتا ہے۔ دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ یہ معاملہ تقلید کا نہیں بلکہ فضائے عصر میں گشت کرتے ہوئے اثرات و کیفیات کے انفرادی انجذاب و انعکاس اپنے تجربے احساس اور خیال کی روشنی ہی میں ممکن ہے۔ وسیم بریلوی ان معاصر رجحانات اور وسیلہ ہائے اظہار کو قبول کرتے ہوئے بھی کہیں اپنے لہجے کے ٹھہراؤ، کہیں لفظی ترجیحات اور کہیں مصرعہ آرائی کے طریقے میں اپنی پہچان الگ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کی ایک اچھی مثال نظم ''بنجارن'' کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

لیکن اتنی رات ہونے آئی اور لوٹی نہیں
جانے بیچاری پہ کیا گزری، یہ سب کو فکر ہے
ایک بنجارن، قبیلہ بھر کی عزت کا سوال
وہ بڑی خود دار تھی، یہ ہر زباں پر ذکر ہے

☆

ایک کہتا ہے ''چلو تھانے میں چل کر بول دیں''
دوسرا کہتا ہے ''پہلے بھی گئے تھے کیا ہوا''
سیٹھ بھی شہروں کے ہیں، شہروں کے تھانہ دار بھی
سب کو آتا ہے ہماری آبرو سے کھیلنا

☆

صبح کو اخبار کی سرخی پہ نظریں جم گئیں
''سیٹھ دامودر کی کوٹھی پر بھیانک مشغلے''
ایک بنجارن تحفظ کرتے کرتے جسم کا
اوپری منزل سے گر کر مر گئی کل چھ بجے

اسی تناظر میں نظم ''فنکار'' کا یہ غیر متوقع اور بلیغ کلائمکس بھی دیکھتے چلئے۔

یہ لمحہ تاریخ ہی کو دے دو، کہ اس کا ماضی سے سلسلہ ہے
ہر ایسے لمحے کو اک امانت بنا کے تاریخ نے لکھا ہے
مگر امانت بنا کے رکھنے کا سلسلہ کب تلک رہے گا؟
رگوں سے فن کار کی کہاں تک یہ قطرہ قطرہ لہو بہے گا؟

وسیم صاحب کی نظموں کو جو وصف ترقی پسند نظم سے الگ کرتا ہے وہ یہ بھی ہے کہ ان میں سماج کے ساتھ فرد کے نفسیاتی و جذباتی تصادم کا مسئلہ تو ہے لیکن اس کے تصفیے کے طور پر کوئی نظریاتی نتیجہ خیز یا کسی ''اِزم'' پر اصرار نہیں ہے۔ اس طرح یہ نظمیں مبلغانہ رویہ اختیار کرنے سے بچ گئی ہیں۔ فنکارانہ حسن کی رو سے دیکھا جائے تو کئی جگہ انوکھی تشبیہیں اور امیجری نظمیہ اظہار کی چمک کو افزوں کرتی ہیں۔ قصبے کی سوئی ہوئی آنکھیں، انگیٹھی میں جلتا ہوا ماضی، تیز نبضوں میں ملاقات کے آثار، بے وفائی کی طرح پھیلی ہوئی راہیں، نئی تہذیب کے آباد بیاباں، اجنبی فکر میں بوجھل ہوتے ہوئے پاؤں، نقوش پاس ے گلی کی مانگ کا روشن ہونا، کسی کی نگاہوں میں اپنی نوعمری کو ڈبونا اور اس طرح کے کئی امیجز (Images)۔ تھوڑے سے تحمل اور بازدید کے ساتھ غور کریں تو ان بصری، سمعی اور حسی پیکر تراشی کے پیچھے شاعر کا مشاہدۂ فطرت بھی ہے، جمال پرست طبیعت بھی، غنائیت پسندی بھی، اُردو کی روایتی شاعری سے اکتساب اور تربیت یافتگی بھی ہے اور اپنے تخلیقی عمل میں شخصی انہماک بھی۔ شاید انہی اوصاف نے آگے چل کر وسیم بریلوی کی غزل کو بھی مختلف پہلوؤں سے انگیز کیا ہے اور متنوع پیرایوں میں معاونت کی ہے۔ اس پر بہر حال ایک سیر حاصل بحث الگ سے کی جا سکتی ہے۔

☆

''شاعری کی آبرو''

وسیم بریلوی نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور کلیدی شاعری سے ہٹ کر Committed نظریہ سے بچ کر دہرائے جانے کی لہر سے نکل کر، ذاتی تجربات، احساسات و کیفیات کو لفظوں کے خوبصورت سانچوں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان پر کسی جدیدیت، ترقی پسندی یا عزم یا الزام نہیں ہے۔ اُردو غزل جو اردو شاعری کی آبرو میں بھی ہے وہ میر سے لے کر اب تک نئے نئے تجربات، نئے نئے احساسات، جذبات و کیفیات کو بڑے سلیقے سے برتتی رہی ہے۔ وسیم بریلوی نے بھی کوہ کن کی طرح جوئے شیر لانے کا کام اپنے محبوب کے حاصل ہونے کی ناکام حسرت میں کیا ہے۔ ان کی شاعری الگ نہج کی شاعری ہے۔ اس میں زندگی بھی ہے، خوشی کے لمحاتی پہلو میں ہیں اور نشاطِ حرماں بھی ہیں۔ اس کو محسوس کرنے کے لیے ایک شاعر کا دل چاہیے اور ہر آدمی کے پاس وسیم بریلوی کی طرح دل نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو احساس نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر امام اعظم

''کلیوں کی مہک''

(پروفیسر وسیم بریلوی کی نظمیہ کلام سے بصد اہتمام)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

دیوانے دو

صرف احساسِ جدائی سے بہلتے رہنا
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سنبھلتے رہنا
بیکسی اور یہ اُترا ہوا چہرا شب کا
میں اکیلا ہوں مرے ساتھ میں چلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغوں! ابھی جلتے رہنا

ابھی امیدوں کی نظروں میں چمک باقی ہے
ابھی ان بیلے کی کلیوں میں مہک باقی ہے
اُن کے آنے کی توقع تو نہیں ہے پھر بھی
سوچنے کے لیے گنجائشِ شک باقی ہے
سیکھ لوں تم سے ہی ممکن ہے سنبھلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغوں! ابھی جلتے رہنا
سوچتا ہوں کئی امیدِ سحر میں ہوں گے
کتنے ہی میری طرح اور سفر میں ہوں گے
اپنی منزل کی تمنائیں لیے حسرت سے
کتنے افسانے ابھی راہ گذر میں ہوں گے
تم ہواؤں کے ارادوں کو بدلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغوں ابھی جلتے رہنا

ڈھل چکی رات، ہوئے بند لبِ زخمِ جگر
رہ گئی دل میں اندھیروں کے تمنائے سحر
کوئی آیا نہ اِدھر رات کے سنّاٹوں میں
منتظر ہو رہی معصوم دعاؤں کی نظر
اب کس امید پہ کہہ دوں کہ بہلتے رہنا
اور کچھ دیر چراغوں ابھی جلتے رہنا
تھک گیا درد ٹھہرنے لگے سانسوں کے قدم
غم کے احساس سے گھٹنے لگا امید کا دم
نا اُمیدی نے امیدوں کو کہاں چھوڑ دیا؟
کھل نہ جائے مری خاموش محبت کا بھرم
عمر بھر میری طرح آگ میں جلتے رہنا
راس آیا نہ تمہیں بھی یہ پگھلتے رہنا
تم بھی بجھ جاؤ مرے دل کو بھی بجھ جانے دو
آخری بار مری آنکھوں کو بھر آنے دو
آج کی رات محبت پہ گراں گزرے گی
ختم ہو جائیں گے اک ساتھ ہی دیوانے دو

○

بنجارن

چند خیمے نصب ہیں اک سردیوں کی رات ہے
شہر سے کچھ دور ہے خانہ بدوشوں کا پڑاؤ
ٹمٹماتے ہیں دیئے خیموں کے اندر شام سے
مفلسوں کے تنگ حلقے میں سسکتے ہیں الاؤ
چند بنجارے ،خلافِ شرع جسموں کو چرائے
آگ حلقے میں لئے بیٹھے ہیں اس ترکیب سے
پھول کے چاروں طرف اخذۂ حرارت کے لیے
جیسے کچھ کانٹے نکیلے اور بے ترتیب سے
دن کی محنت کا نتیجہ رات کاٹنے کا سوال
اُٹھ رہا ہے بنکے اُن چولہوں کے سینے سے دھواں
جن کی صحبت میں قبیلے کی کنواری لڑکیاں
تجربے دن بھر کے کرتی ہیں نگاہوں سے بیاں
لیکن آج اُن کی زبانیں بند، سرغم سے نگوں
ہر نظر دل میں لیے بیٹھی ہوئی ہے اک سوال
عورتیں خاموش، مردوں کی زبانیں لاجواب
حادثہ ہے ایک لیکن مختلف سے ہیں خیال
اس قبیلے کی کوئی نو عمر لڑکی صبح سے
قینچیاں لے کر گئی تھی بیچنے کے واسطے
شہر کی اُن کوٹھیوں، اونچے مکانوں کی طرف
سنتری روکے کھڑے رہتے ہیں جن کے راستے
کوٹھیاں وہ جن کے چہرے گرد سے واقف نہیں
جن کے سینوں میں جوانی کی اُٹھانیں دفن ہیں
ظاہرہ یہ کوٹھیاں خاموش رہتی ہیں مگر
اُن کے کمروں میں ہزاروں داستانیں دفن ہیں

لیکن اتنی رات ہونے آئی اور لوٹی نہیں
جانے بیچاری پہ کیا گزری؟ یہ سب کو فکر ہے
ایک بنجارن،قبیلہ بھر کی عزت کا سوال
وہ بڑی خود دار تھی، یہ ہر زباں پہ ذکر ہے
ایک کہتا ہے''چلو تھانے میں چل کر بول دیں''
دوسرا کہتا ہے''پہلے بھی گئے تھے، کیا ہوا''
سیٹھ بھی شہروں کے ہیں،شہروں کے تھانہ دار بھی
سب کو آتا ہے ہماری آبرو سے کھیلنا
مفلسی میں جو ہر ناموس کی قیمت نہیں
چیتھڑوں میں ہوا گر عصمت ،تو پھر عصمت نہیں
شہر کے تہذیب داروں کی نظر میں بھائیوں
اک غریب انسان کی عزت کوئی عزت نہیں
قمقموں کی دسترس میں جگمگاتی کوٹھیاں
چھن رہی ہے جنکے پردوں سے اندھیری روشنی
ہم غریب انسان گھبراتے ہیں اس احساس سے
بڑھ کے خیموں تک نہ آجائے، یہ ان کی روشنی
بوڑھے بنجارے کی یہ تقریر اور یہ حادثہ
شہر کے کم ظرف انسانوں پہ دل رونے لگا
کس قدر غمگین تھا میں گھر پہنچنے پر وسیم
جانے کتنے مسئلے پہلو میں لے کر سو گیا
صبح کو اخبار کی سرخی پہ نظریں جم گئیں
''سیٹھ دامودر کی کوٹھی پر بھیانک مشغلے
ایک بنجارن تحفظ کرتے کرتے جسم کا
اوپری منزل سے گر کر مر گئی کل چھ بجے''

○

گیت

میں کس بیری کے دوار گئی
من جیت ہوئی تن ہار گئی
میں کس بیری کے دوار گئی

اپماؤں سے سمبندھوں کے نام مرا احساس
دھرتی سے امبر تک میں ہوں اور مری اک پیاس
ایک نجر کی لہر اٹھی میں سات سمندر پار گئی
میں کس بیری کے دوار گئی

نینوں میں اک بات لئے پھرنے کی ایک امنگ
کوئی نہ جانے کوئی تو جانے من ہی من میں جنگ
آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے ہاتھوں سے پتوار گئی
میں کس بیری کے دوار گئی

رنگوں کے معنی بدلے معنی کے بدلے رنگ
ایک کھلے آکاش سے رشتہ جوڑے ایک پتنگ
اپنی چھوٹی سی انگنائی چھوڑ کے میں بیکار گئی
میں کس بیری کے دوار گئی

○

تیری ایک نجر ہی مجھ کو دھوپ سے کر گئی چھاؤں
سجن یہ بات کسے بتلاؤں

تن کی تپتی ریت پہ جیسے پھوار گرے شبنم کی
کیسی لجّا ہین جھون پاپی تیرے موسم کی
بدرا بدرا سیج سجاؤں دھوپ دھوپ شرماؤں
سجن یہ بات کسے بتلاؤں

کل تک جس درپن میں میں تھی اور مرے ویرانے
آج اسی درپن میں تو ہی تو ہے تو کیا جانے
میرے اندر چور چھپا ہے جانے کب چُر جاؤں
سجن یہ بات کسے بتلاؤں

روز کے دیکھے بھالے منظر آج کچھ اور کہیں ہیں
دنیا بھر کی ندیاں جیسے میرے ساتھ بہیں ہیں
کیسا کنارہ ہاتھ میں آیا ہے کہ ڈوبی جاؤں
سجن یہ بات کسے بتلاؤں

○

گیت

تو امبر کی آنکھ کا تارا میرے چھوٹے ہاتھ
سجن میں بھول گئی یہ بات

تجھ کو سارے من سے چاہا چاہا سارے تن سے
اپنے پورے پن سے چاہا اور ادھورے پن سے
پانی کی اک بوند کہاں اور کہاں بھری برسات
سجن میں بھول گئی یہ بات

جنم جنم مانگوں گی تجھ کو تو مجھ کو ٹھکرانا
میں ماٹی میں مل جاؤں گی تو ماٹی ہو جانا
لہر کے آگے کیا اک چھوٹے تنکے کی اوقات
سجن میں بھول گئی یہ بات

تیری اُور ہی دیکھا میں نے اپنی اُور نہ دیکھا
جب جب بڑھنا چاہا پاؤں سے لپٹی لچھمن ریکھا
میں اپنے بھی ساتھ نہیں تھی تیرے دنیا ساتھ
سجن میں بھول گئی یہ بات

○

قطعات

ہر ایک پھول کے دل میں گھٹا گھٹا سا دھواں
بہار ایسی کسی کی نظر سے گذری ہے؟
یہ سوگوارئ گلشن بتا رہی ہے وسیم
کوئی اُداس حسینہ اِدھر سے گذری ہے

ختم کب ہو یہ کچھ نہیں معلوم
ہر نفس پر ہے موت کا خطرہ
زندگی اس طرح ہے دنیا میں
جیسے کانٹے پہ اوس کا قطرہ

منزلیں دور ہوتی جاتی ہیں
فاصلے ہیں کہ کم نہیں ہوتے
ہائے قسمت کہ اب شریکِ سفر
میرے اپنے قدم نہیں ہوتے

بہت دنوں میں جو دیکھا تو دیکھ کر تم کو
خموش ہے دلِ شاعر کی اس طرح دھڑکن
گذشتہ شب کی تصور فروشیوں کے بعد
سہاگ رات کو جیسے تھکی ہوئی دلہن

میرے شعروں کو تیری دنیا میں
میرے دل کا غبار لایا ہے
میرے شعروں کو غور سے مت سن
اِن میں تیرا بھی ذکر آیا ہے

اُن سے وابستگی نہیں جاتی
زندگی کیسے کاٹ پاؤں گا
جتنی باتیں ہیں اُتنی یادیں ہیں
کیسے کیسے اِنہیں بھلاؤں گا

○

''کتاب سیرت وکردار''

نعتِ رسول کریمؐ

مشکل میں جب سے اُمّتِ بیمار ہے بہت
ہم کو کرم حضورﷺ کا درکار ہے بہت

اُن کی کتابِ سیرت و کردار ہے بہت
جینے کے واسطے یہی معیار ہے بہت

باہر بھی ہُوں حرم سے، تو مشکل ہے کیا مجھے !
مجھ پر تو اُس کا سایۂ دیوار ہے بہت

کون اَور ایسے کرتا ہے دلداریاں مِری
میرے لیے مدینے کا دِلدار ہے بہت

طیبہ کی سمت پھول بچھے ہیں بہر قدم
بہرِ سفر یہ راستہ ہموار ہے بہت؟

لازم ہے، ہم حضورﷺ کے رستے پہ ہی چلیں
ورنہ جو راستہ بھی ہے، دُشوار ہے بہت

دربارِ شاہِ وقت سے لینا ہے کیا مجھے؟
مجھ کو چٹائی والے کا دربار ہے بہت

مجھ کو یقین ہے، مِری بخشش کے واسطے
لکھی جو مَیں نے مدحتِ سرکارﷺ، ہے بہت

طیبہ میں دھوپ کا کوئی احساس ہی نہیں
یعنی وہاں پہ سایۂ اشجار ہے بہت

دِل پر مرے حضورﷺ، نگاہِ کرم کریں !
دنیا کے مسئلوں میں گرفتار ہے بہت

کھلتا ہے جو دریچہ مدینے کی سمت میں
گھر کا وہی دریچہ ہوادار ہے بہت

شیرینیاں گھلی ہیں وہاں کی فضاؤں میں ا
طیبہ کا ہر شجر ہی ثمر دار ہے بہت

ہم تیسری طرف تو نہیں دیکھتے، ہمیں
کعبہ بہت ہے، روضۂ سرکار ہے بہت

تاجِ شہی سے کم نہیں نعلینِ مصطفیٰﷺ
پیاری مجھے مری یہی دستار ہے بہت !

آنکھیں بھی کہہ رہی ہیں مدینہ چلو نسیم
دل کا بھی کچھ دنوں سے یہ اصرار ہے بہت

نسیم سحر (راولپنڈی)

چراغِ کربلا

زیست داہنوں میں دمکتا ہے چراغِ کربلا
ہر ستارے میں جھلکتا ہے چراغِ کربلا

جب مسافر ڈوبتا تشنگی میں دشت کی
پھول کی صورت مہکتا ہے چراغِ کربلا

وقت خود تبدیل کر دیتا ہے حر کی منزلیں
سرخ اشکوں میں ہمکتا ہے چراغِ کربلا

تیز کتنا ہی یہاں بادِ مخالف چل پڑے
کب زمانے میں بھٹکتا ہے چراغِ کربلا

جھانک کر دیکھو تو سینے میں ہم اہلِ درد کے
دل نہیں کوئی دھڑکتا ہے چراغِ کربلا

ظلمتوں میں وحشتوں کی جو ہوا روشن عدیلؔ
ہر طرف اب تو چمکتا ہے چراغِ کربلا

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

بددُعا

انل ٹھکّر

(دہلی، بھارت)

شہروں میں شہر تھا۔ ویسے وجود تو آج بھی ہے اس کا مگر وہ نظروں سے بہت دور ہے۔ اب تو نام بھی بدل گیا ہے اس کا۔ رب آباد رکھے اسے۔ میں نے جس دن اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے اس کا نام بدلا گیا ہے تو اس دن میں ساحرؔ کی نظم ''تاج محل'' کا شعر گنگناتا رہا اور میرا دل اس لیے رو رہا تھا کہ میری آنکھیں رونا بھول گئی ہیں۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں آتا کہ یہ آخری بار کب نم ہوئی تھیں۔ مان بھی لیا جائے کہ ہم اُن کے دشمن ہیں پھر بھی نام بدلنے سے پہلے ہمارے جذبے کا خیال تو کیا ہوتا۔ سونپ تو ہم ہی آئے تھے وہ شہر ان کو، پھر چاہے مجبوری کے عالم میں ہی سہی۔۔۔ افسوس، اب اس جہاں میں دشمن کے جذبے کی قدر کرنے والے دشمن بھی نہیں رہے۔

وہ سڑک کے ایک طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ آیئے۔

وہ ایک پٹیا پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے قریب بیٹھ کر دیکھا۔ وہ خلا میں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے خاموش رہ کر آہ بھرتے ہوئے کہا۔

کیا شہر تھا۔ شہر کے ٹھیک بیچوں بیچ گھنٹا گھر۔ اس کے اطراف بچھی ہوئی سڑکیں، گلیاں۔ کہیں بھی چلے جایئے گھنٹا گھر نظر آئے گا۔ کسی گلی میں ایک جگہ سے چلنا شروع کیجیے۔ گھنٹا گھر کا طواف کر کے آپ واپس وہیں پہنچیں گے جہاں سے آپ چلے تھے۔ لوگ کہتے تھے شہر کا نقشہ دیکھیں تو لگتا ہے جیسے شہر نہیں مکڑی کا جالا ہے۔ بیچ میں مکڑی بیٹھی ہے اور اطراف تانے بانے بُن کر جالا پھیلایا گیا ہے مگر مجھے ایسا نہیں لگتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی پیر یا ولی تلقین کر رہا ہے اور چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ احترام سے ٹھہر کر سُن رہی ہے۔ اور وہ کہہ رہا ہے۔۔۔ آپ کہیں سے بھی شروع کیجیے، آپ اپنے رب کا طواف کر کے وہیں پہنچیں گے۔ سب کا رب ایک ہے۔ اس کے اطراف طواف کرنے کی گلیاں الگ الگ ہیں۔

شہر کی سڑکیں لوگوں کی آمد و رفت سے ہر وقت چھلکتی رہتی تھیں اور جب اس چھلکتی بھیڑ سے کوئی ٹانگا، گڑی گوجرا، گڑی لاہور کی صدا دیتا ہوا گزرتا تو۔۔۔ ہائے ہائے! کیا زبان ہوا کرتی تھی ان تانگے والوں کی۔ شاید صبح گھر سے نکلتے وقت زبان پر شہد مل کر نکلا کرتے تھے۔ اَے ہٹ جا، ویراں والیے، کر ماں والیے، پُتراں والیے۔۔۔ اور اگر مرد بیچ میں آ جاتا تو جھٹ سے کہتا۔۔۔ اوہٹ کر بادشاہو۔۔

میرا باپ سردار پریتم سنگھ بھی تانگا چلاتا تھا۔ چھ فٹ کا قد، اس پر کلف کیا ہوا فٹ بھر پگڑی کا طرّہ۔ چہرے پر اصلی گھی سے پالی ہوئی مونچھیں اور سرسوں کا تیل پلا کر نرم کیے چُرمراتے جوتے۔ سامنے سے چلا آ رہا ہو تو معلوم ہوتا جیسے پنجاب کا نقشہ آ رہا ہے۔ ماں میری ساڑھے پانچ فُٹ اونچی۔ دریائے راوی سا بھرا بھرا جسم، وہ گُرتی کی بانہیں چڑھا کر گھوڑی پر سوار پنڈ کی پگڈنڈی پر سے گزرتی تو کیا مجال ہے کوئی مائی کا جنا اس دی گھوڑی دی لگام پکڑ اکر راستہ روکنے کا حوصلہ کرے۔

جسم و صحت سے مالا مال میرے ماں باپ کے ہاتھوں میں اولاد کی لکیر شاید بہت ہی کمزور تھی۔ تین بچے تو پیدا ہوتے ہی چل بسے تھے۔ بچوں کی موت سے دونوں اُداس رہنے لگے تو کسی نے صلاح دی کہ دیوی کی منّت مان لو، سب چنگا ہو جائے گا۔ ماں نے منّت مانی، میں پیدا ہوا، زندہ بھی رہا تو ماں کی منّت پوری کرنے میرے بالوں کا چڑھاوا چڑھایا گیا۔ میں سردار سے مونا بنا۔ میرے بعد پھر ایک لڑکی ہوئی۔ میری بہن ستونت کور نے میرے سر کے بال کاٹ کر مجھے مونا بنا دیا مگر میں اپنی تہذیب کی دھارا میں بہتا رہا۔ میں روزانہ اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر گرودوارے جاتا وائے گُرو۔۔۔ کیا گُرودوارا تھا ہمارے شہر کا۔ روزانہ گُروبانی میرے کانوں میں امرت گھولتی تھی۔ اور۔۔۔ ہائے ے ے ے اس کے لنگر کی روٹیاں اور چھولے دی سبزی۔۔۔ وہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو اس بڑھاپے میں بھی انگلیاں چاٹنے کو جی چاہتا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی ذائقے کو اپنی زبان پر محسوس کر کے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ جمع شدہ لعاب کو نگلتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔

کچھ ذائقے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ کبھی نہیں بھُلائے جا سکتے۔ میں نے بھی ایک چیز چکھی تھی وہ اتنی لذیذ تھی کہ اس کا ذائقہ میری رگوں میں اُتر گیا۔

سردیوں کی دوپہر تھی۔ پاپا جی اس وقت سواریاں تانگے میں بٹھا کر اسٹیشن گئے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ گڑی گوجرا کا وقت تھا۔ ماں رضائی میں دُبکی سو رہی تھی۔ میں چھوٹا بچہ مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ بوریت سے بچنے میں اس کے گھر گیا۔ گھر میں داخل ہوا، میں نے دیکھا۔۔۔ اس کا ننگا، گورا پستان۔ میری نظریں وہیں ٹھہر گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرائی۔ اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پیار سے اپنی بغل میں لیا۔ میں نے دیکھا اس کے سرِ پستان پر ایک قطرۂ شبنم سا جھلملا رہا تھا۔ میں نے جھلملاتے قطرے کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔۔۔ یہ کیا ہے مَوسی؟ سوال سُن کر وہ ہنس دی تھی۔ رب دی سوں، اس کے بعد ویسی سُنتا نصیب نہیں ہوئی۔ اس نے میرے گال پر چٹکی لیتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔۔۔ یہ دُدھ ہے۔

تب تک میری بہن پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں نے آخری بار ماں کا دودھ کب پیا تھا وہ بھی یاد نہیں تھا۔ بعد میں جب چھوٹی بہن ہوئی تھی تب تک میں آٹھ نو سال کا ہو چلا تھا اور عورت کے سینے سے نظریں چُرانا سکھ گیا تھا۔ ماں بھی میری موجودگی میں بہن کو دودھ پلاتے وقت دوپٹے سے سینہ ڈھانپ لیتی تھی۔

اس روز جب مَوسی کے سرِ پستان میں نے دودھ کے قطرے کو

جھلملاتے دیکھا تو میرے ذہن میں۔۔۔ذہن میں یا دل میں یا میری رگ رگ میں میرے وجود میں الہام ہوا۔۔۔اور میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اتفاقاً میرے پنجے کی چار انگلیاں میرے طرف مڑی ہوئی تھیں۔اور ایک انگلی مَوسی کے پستان کی جانب۔۔۔عموماً رہبرانِ قوم بطور نصیحت کہتے ہیں۔۔۔دوسروں کی برائی کی طرف اُنگلی اٹھانے سے پہلے یہ یاد رہے کہ تمہاری چار انگلیاں تمہاری طرف مڑی ہوئی ہیں مگر میری انگلی کسی برائی کی طرف نہیں اٹھی تھی۔وہ تو خدا کی خدائی کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے مَوسی کے پستان پر جھلمل کرتے دودھ کے قطرے کو اپنی انگلی کے سرے پر لیا اور زبان پر رکھ لیا۔دنیا بھر کے مذاہب میرے جسم میں اُتر گئے۔میری مَوسی، فاطمہ مَوسی، غلام حسین چودھری کی اہلیہ میری ماں کی منہ بولی بہن تھی۔۔۔وہ دونوں ایک دوسرے کی منہ بولی بہنیں تھیں۔اس زمانے میں منہ سے کہی گئی بات پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔منہ بولے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ سُرخ ہوا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ وقت بدلتا گیا۔وقت کے ساتھ حالات بدلے۔حالات کے ساتھ زمانہ بدلا، لوگ بدلے، نظریات بدلے، قدریں بدلیں، ارے سب کچھ بدل گیا مگر میری مَوسی نہیں بدلی۔اس کا منہ بولا رشتہ نہیں بدلا۔رب سب دا بھلا کرے۔اگر وہ آج زندہ ہوتی تو اب بھی اُس کا سینہ نم ہوگا۔جہاں میں سر رکھ کر آخری بار رویا تھا۔

گرما کا موسم تھا۔بھری دوپہر، تپتی سڑکیں، دھوپ ایسی کہ اگر غلطی سے بھی کوئی پرندہ اس چھت سے اُس چھت کی اُڑان بھرے تو بھی جان گنوا بیٹھے۔میں اسکول سے آکر منجھے پر لیٹا تھا۔پاپا جی گھوڑے کو گھاس ڈال رہے تھے۔ماں پروسنے سے پہلے لسّی بنانے بیٹھی تو دیکھا دہی جما نہیں تھا۔اس نے مجھے آواز دی۔میرے ہاتھ میں برتن تھما کر کہا گلی کے نکڑ سے دہی لے آ۔نہ جانے آج دہی جما کیوں نہیں، میں جب تک چار پراٹھے اتار لیتی ہوں۔

میں گلی کے نکڑ سے دہی لے کر لوٹ رہا تھا تو گلی میں شور وغل سُنا۔میں نے دیکھا ہمارے گھر کے پاس لوگوں کی بھیڑ جمع تھی اور دو تین گھروں سے دھواں اور شعلے اٹھ رہے تھے۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔میں نے تیزی سے گھر کی جانب قدم بڑھائے یہ دیکھنے کے لیے کہ ماجرا کیا ہے۔اتنے میں کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔دہی کا برتن میرے ہاتھ سے گر گیا۔میں نے دیکھا مَوسی مجھے چُپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف گھسیٹتے ہوئے لے جا رہی تھی۔گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے سنگل چڑھا دی۔میں نے پوچھا مَوسی کیا بات ہے؟

چپ مر، کرم جلے۔۔۔اتنا کہہ کر اس نے مجھے اندر لے جا کر بھینسوں کا چارہ رکھنے کے کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔بلوائی آئے ہیں کسی قسم کی آواز مت کرنا۔وقت موقعہ دیکھ کر کھانا دے جاؤں گی۔۔۔دھڑل سے دروازہ بند ہوا۔باہر سے آئی آواز سے میں سمجھ گیا کہ مَوسی نے دروازے کو قفل لگا دیا تھا۔اور یارب، میرے مولا رحم کر۔۔۔کہتے ہوئے چلی گئی تھی۔

وہ اندھیرا کمرا ایک عجیب قسم کی بدبو اور نمی سے بھرا ہوا تھا۔میری آنکھیں جب اس اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو میں نے اس سرمئی روشنی میں دیکھا کہ آدھے سے زیادہ کمرا تو گھاس، چارے سے بھرا پڑا تھا اور باقی کا حصہ کباڑ خانہ نظر آ رہا تھا۔اس ماحول میں میرا دم گھٹنے لگا۔مچھر اور دوسرے کیڑے مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہے تھے۔بار بار جی میں آتا کہ مَوسی کو پکاروں مگر باہر کی آوازیں سُن کر مَوسی کو پکارنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔اس طرح اس کمرے میں گیارہ دن تک میں سورج کی روشنی کو ترستا رہا۔مَوسی کسی طرح وقت بے وقت دو بار کھانا پہنچا دیتی۔وہ بالکل بدل گئی تھی۔بہت ہی بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔وہ گونگوں کی طرح آتی کچھ بدبداتی اور کھانا رکھ کر چلی جاتی۔گیارھویں دن ڈھلتی دوپہر کے وقت جب میری آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز سے میں جاگ گیا۔میں نے دیکھا مَوسی بڑی گڑبڑاہٹ میں میرے پاس آئی اور دروازے کے بیچوں بیچ بندوق تھامے کوئی کھڑا ہوا تھا۔میں جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔اتنی ہی پھرتی سے مَوسی نے مجھے اٹھا کر سینے سے لگایا اور بندوق والے کی طرف یہ کہتے ہوئے پلٹی۔۔۔یہ میری بہن خشونت کور کا بیٹا ہے۔بھرا جی، اسے ہندوستان پہنچا دو۔رب تواڈا بھلا کرے گا۔۔۔

بھگت رام جی، میں کسی سے آج کیا کہوں کہ اس کا میرا کیا رشتہ تھا۔وہ میری کیا لگتی تھی، جس کے سینے سے میں نے دنیا بھر کے مذہب پیئے تھے اور وہ اس وقت میری زندگی کے لیے بندوق والے سے بھیک مانگ رہی تھی۔

بندوق والے نے دروازے سے ہٹ کر مَوسی کو راستہ دیا۔مَوسی آگے بڑھی، بندوق والا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔میں نے مَوسی سے پوچھا یہ کون ہے مَوسی؟ یہ فوجی ہے۔ہندوستانی فوجی تمہیں ہندوستان لے جانے آئے ہیں۔اتنا کہتے کہتے مَوسی مجھے سینے سے لگائے گھر کی دہلیز لانگ کر گلی میں آ گئی۔اس کا دل میرے سینے پر دھڑک رہا تھا اور میں اس کی چھاتی کو آنسوؤں سے تر کر رہا تھا۔اس نے خوف زدہ نظروں سے یہاں وہاں دیکھ کر پھر آگے بڑھ کر سامنے کھڑے فوجی ٹرک میں مجھے اُتارنے سے پہلے ایک بار چوما۔۔۔رب تیرا نگہبان ہو۔

پرکاش جی، اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔مَفلر کو ٹھیک کیا اور اٹھ کر چلنے لگے۔بھگت رام جی، پرکاش جی نے آگے کہنا شروع کیا۔

میں جب اس منظر کا تصور کرتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میری مَوسی مجھے فوجیوں کے ٹرک میں چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ کوئی ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو جو معاشرے کی نظروں میں ناجائز تھا زمانے کے ڈر سے مونسپلٹی کے کچرے کے کنڈے میں رکھ کر روتی ہوئی اپنے گھر کی طرف پلٹی تھی۔

میں پرکاش جی کی انسان دوستی سے واقف تھا۔وہ کسی ایک مذہب کو

نہ مانتے ہوئے ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ پھر بھی ان کا جملہ سُن کر میں کانپ سا گیا۔ پرکاش جی بولے:

فوجیوں کے ٹرک مجھے اور مجھ جیسے کئی اور لوگوں کو لے کر چل دیے۔ میں نے دیکھا میرے شہر کا ولی اداس ٹھہرا تھا اور فوجی اس کے چند لاوارث مریدوں کو نئے ہندوستان کی سرحد کی جانب لے جا رہے تھے۔

پرکاش جی، پھر خاموش ہو گئے۔ نہ جانے سوچ کی کن اتاہ گہرائیوں میں غوطے لگانے لگے تھے۔ میں خاموش رہا۔ اتنے میں انہوں نے میری طرف دیکھا۔۔۔

بھگت رام جی، کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان عمر بھر سوچے تب بھی اسے ان کا معقول جواب نہیں ملتا۔ میں اس دن سے سوچ رہا ہوں۔۔۔ ہمارے شہر میں، ہماری گلی میں بلوائی کیوں آئے تھے؟ گھر کیوں جلے تھے؟ میری بہن اور ماں جیسے لوگوں کو کیوں جلایا گیا تھا؟ وہاں بھی یہاں بھی۔ ملک کا بٹوارہ کیوں ہوا تھا؟ کس نے بٹوارہ چاہا تھا؟ کیا بٹوارہ چاہنے والے مرنے کے بعد اپنے حصے کا ملک اپنے ساتھ لے جائیں گے؟

سوالوں کا بے حس و بے جان ایک لمبا قافلہ ستر سالوں سے میرے ذہن سے گزر رہا ہے اور پاگلوں کی طرح اس قافلے میں میں یہاں وہاں بھاگتے ہوئے اپنی ماں، مَوسی اور بہن کو ڈھونڈ رہا ہوں۔۔۔ فوجیوں نے مجھے امرتسر کیمپ میں لا کر چھوڑ دیا۔ مجھے چھ مہینوں بعد میرے پاپا جی مل گئے۔ احمد آباد میں انہوں نے ریڈیو پر میرا نام اور پتا سنا مگر اب وہ پریتم سنگھ نہیں تھے۔ اب وہ میرے پاپا جی نہیں رہے تھے۔ بہرحال کچھ تھے۔ کیا؟ میں نہیں جان سکا۔ میں نے کبھی اُنہیں نہیں پوچھا۔ میں کبھی یہ ان سے پوچھنے کا حوصلہ نہ کر سکا کہ۔۔۔ پاپا جی، آپ کیسے بچ گئے؟ انہوں نے آپ کو کیسے چھوڑ دیا اور میری ماں اور بہن۔۔۔ اور نا ہی انہوں نے یہ بات کبھی چھیڑی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمیں لے کر فوجیوں کے ٹرک ہمارے شہر کے گھنٹا گھر کے سامنے سے مڑ کر کمپنی باغ جانے والے راستے پر مڑے تھے تب گھنٹا گھڑ میں تین ڈنکے بجے تھے۔ بھگت رام جی، مجھے لگتا ہے وہ ڈنکے نہیں تھے وہ بددُعا تھی اس ولیِ کامل کی جو ہمارے اُجڑے شہر کے بیچوں بیچ غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ وہ بددُعا جو بٹوارے کی لکیر کے اس پار کے لیے بھی تھی اور اُس پار کے لیے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ سوالوں کا قافلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ فسادات، قومی و مذہبی مسئلے، دہشت گردی نہ جانے کیسی کیسی شکلیں اختیار کر کے یہ سوالات ہمارے نہاں خانۂ دل میں رقص کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں نہ کہ سوکھے کے ساتھ گیلا بھی جل جاتا ہے ویسے ہی ہماری نسل بھی سوالوں کے جنگل میں جل رہی ہے۔

اس کے بعد پرکاش جی نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔ آخری دس سالوں سے ہم دونوں صبح سیر کو آتے رہے ہیں۔ وہ عموماً خاموش رہتے تھے۔ نہ جانے آج اتنا سب کچھ کیسے کہہ گئے۔

سڑک پر ابھی ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ کبھی کبھار کوئی ٹرک، کار یا بس گزر جاتی تھی۔ میں ہلکی ہلکی پھیلتی ہوئی دھوپ کو سینکتے ہوئے چل رہا تھا۔ سامنے سے ایک اسکوٹر تیزی آیا۔ یک بیک رُکا۔ پرکاش جی نے مجھے زور سے دھکّا دیا۔ زمین پر گرتے ہوئے میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ میں نے گرتے ہوئے دیکھا اسکوٹر پلٹ کر رفتار پکڑ رہا تھا۔ اسے منہ پر برقع پہنے ایک شخص چلاّ رہا تھا پیچھے کی سیٹ پر کالے لباس میں ملبوس لمبے بالوں والا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ اس اسٹین گن سے اس نے پرکاش جی کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

میں اُٹھ کر پرکاش جی کے پاس گیا مگر تب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ان کے جسم سے خون یوں بہہ رہا تھا جیسے پنجاب کے پانچوں دریاؤں میں خون کی باڑھ آئی ہو۔

☆

''غیر کی عزت''

شوکت تھانوی کی جب پہلی غزل چھپی تو انہوں نے رسالہ کھول کر میز پر رکھ دیا تا کہ آنے جانے والے کی نظر پڑتی رہے۔ مگر شامت اعمال سب سے پہلے ان کے والد صاحب کی نظر پڑی، انہوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا گویا کہ چور پکڑ لیا ہو۔

والدہ صاحبہ کو بلا کر انہوں نے کہا:

''آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں۔''

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچے میں جا کر ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں

''میں پوچھتا ہوں:
یہ وہاں جاتا ہی کیوں ہے؟
کس سے پوچھ کر جاتا ہے؟''

والدہ بیچاری خوفزدہ آواز میں بولیں۔
''غلطی سے چلا گیا ہوگا''

○

دھند کے اندر سفر

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں ٹی وی پر ایک مزاحیہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔ امّی کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر میں نے ٹی وی کی آواز بند کردی۔ امّی میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ''امّی اس وقت میرے کمرے میں کیوں آئی ہیں۔''میں نے سوچا

''بہت خوش نظر آرہے ہو۔؟''امّی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امّی ٹی وی پر ایک مزاحیہ پروگرام دیکھ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا''اچھا کو امّی نے ذرا کھینچتے ہوئے کہا، پھر بولیں

''کل صبح دس بجے کی ٹرین سے تمہاری خالہ لاہور سے آرہی ہیں۔تم ان کو جا کر لے آنا''

یہ سن کر میرا موڈ خراب ہو گیا۔خالہ کے آنے کے خیال سے نہیں بلکہ اسٹیشن اور اس پر ہونے والی دھکم پیل اور بھیڑ بھاڑ کے تصور سے۔ پھر مجھے''دھند'' کا خیال آیا اور میں نے خالہ کے بائی ایئر نہ آنے کے عمل کو معاف کر دیا۔

''اوکے امّی لے آؤں گا۔''میں نے اپنی بوریت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سرمد!صبح ذرا جلدی نکلنا اسٹیشن بہت دور ہے۔'' امی نے جاتے جاتے مجھے تاکید کی۔

امی کے جانے کے بعد میں نے حیدر کو فون کیا ساتھ چلنے کے لئے۔ پہلے تو اس نے منع کر دیا لیکن پھر میرے زور دینے پر راضی ہو گیا۔

پلیٹ فارم پر بھیڑ بھاڑ سے دور پڑی ایک بنچ پر ہم دونوں بیٹھے باتیں کررہے تھے، چائے بیچنے والے سے چائے لے کر گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے جارہے تھے اور خالہ امّی کی ٹرین کا انتظار کررہے تھے۔ اسٹیشن پر بہت چہل پہل تھی ،ایک ٹرین روانہ ہونے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ گارڈ ٹرین کے ساتھ ساتھ قریب قریب چلنے کے انداز میں متحرک تھا۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ٹرین کو رخصت کرنے کے لئے اپنے آفس سے باہر آ کھڑا ہوا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ بوڑھے بچے، مرد عورتیں جو ابھی تک گاڑی میں سوار نہ ہوئے تھے مختلف ڈبوں کے ساتھ اندر داخل ہونے کے لئے متوازی دوڑ بھاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ جو اپنے پیاروں کو چھوڑنے آئے تھے،ٹرین کی کھڑکیوں سے لگے باتوں میں مصروف تھے،اچانک ایک لڑکی نما عورت یا عورت نما لڑکی چھوٹے سے بچے کو بغل میں دبائے، بائیں ہاتھ سے ہینڈ کیری کھینچتی ہماری طرف بڑھی چلی آئی، بچے کو میری گود میں ڈالا اور تحکمانہ انداز میں بولی''چلو اٹھو۔''اور میرا جواب سنے بغیر قریب قریب دوڑنے کے انداز میں آگے کی طرف چلنے لگی۔ حیدر نے چائے کا کپ میرے ہاتھ سے لے لیا تا کہ میں بچے کو سنبھال سکوں۔ میں اس اچانک لگنے والی ڈیوٹی کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ میں نے ایک نظر بچے پر ڈالی اور دوسری اس لڑکی یا خاتون پر جو آگے دوڑے چلی جارہی تھی۔ میں بچے کو گود میں تھامے اس کے پیچھے بھاگا۔ پھر یہ ہوا کہ اچانک وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ کہیں نظر نہ آئی۔ پریشانی اور گھبراہٹ سے میرے پسینے چھوٹ گئے اتنے میں حیدر بھی مجھ تک پہنچ گیا۔ٹرین کے کسی بھی ڈبے کی کسی بھی کھڑکی یا دروازے پر اس خاتون یا لڑکی کا چہرہ موجود نہ تھا۔ بھونچکا سے کھڑے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔شاید حیدر کے ذہن میں بھی صورت حالات کی سنجیدگی ابھر آئی تھی۔۔۔بچے کا کیا کریں؟برے پھنسے، شاید ہم دونوں ہی یہ سوچ رہے تھے۔حیرت کی بات یہ تھی کہ بچہ رونے دھونے کے بجائے خاموشی سے میری گود میں دبکا ہوا تھا۔اچانک وہ جیسے غیر موجود ہوئی تھی، موجود ہو گئی۔ میں نے چین کا سانس لیا اور تیزی سے اس کی طرف دوڑا، وہ بجلی کی سی تیزی سے ٹرین کے ایک ڈبے میں چڑھ گئی۔اس کے چڑھتے ہی ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا، میں اس کے ڈبے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ٹرین پر چڑھتے ہی وہ پلٹی اور تحکمانہ لہجے سے بولی:

''جلدی کرو۔'' میں نے بچہ اس کی طرف بڑھا دیا اس نے اپنے آدھے دھڑ کو گرنے کی حد تک جھکایا ہوا تھا اور دونوں بازو بچے کو لینے کے لئے لٹکائے ہوئے تھے۔ یکبارگی مجھے ایسا لگا کہ بجائے میرے ہاتھوں سے بچہ لینے کے وہ خود مجھ پر جھول جانے والی ہو۔ سچ پوچھئے تو کسی بچے کو اسطرح ٹرین میں کھڑی ہوئی لڑکی کے ہاتھوں میں تھمانے کا تجربہ میرے لئے بالکل نیا تھا، میرے اندر تو اس سے یہ ڈر بھی موجود تھا کہ میں خود یہ کرتب انجام دینے کی کوشش میں پلیٹ فارم سے پھسل کر نیچے گر سکتا تھا جہاں ٹرین کا نچلا مشینی دھڑ اور سفید وسیاہ فولادی چمکدار پہیے میرے بدن کا سواگت کرتے بہر حال بچہ اس کی ماں یا بہن (جو کوئی بھی تھی) اس کے سپرد ہو چکا تھا۔اور ٹرین اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ!خالہ امی۔۔۔؟ پلیٹ فارم کے دوسری جانب لاہور سے آنے والی ٹرین کھڑی تھی، میں بھاگا۔۔۔ابھی ٹرین کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''حیدر!''میں نے پلٹ کر دیکھا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں نے خالہ امی کو اتار لیا ہے۔چلو میرے ساتھ۔''

اسی بنچ پر جس پر میں اور حیدر بیٹھے ہوئے تھے خالہ امی بیٹھی ہوئی تھیں اور پاس ہی ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی خالہ امی نے لپٹا لیا اور بولیں۔''میاں کہاں رہ گئے تھے،حیدر نے ہمیں اتارا۔''

''خالہ امی! میں نے ہی حیدر کو کہا تھا۔ اچانک ایک دوست مل گیا تھا ،ٹرین پر سامان چڑھانے میں اس کی مدد کر رہا تھا، اس کے پاس سامان بہت تھا اور ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔'' میں نے لمبا چوڑا جھوٹ بولا۔ میں، جس کو دعویٰ تھا ''میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا''

چلو اچھا ہوا تم نے اس بے چارے کی مدد کر دی۔ خالہ امی کو جیسے میری بات پر یقین آ گیا تھا۔

گاڑی میں تمام راستے زیادہ تر خالہ امی بولتی رہیں اور میں اور حیدر سنتے رہے۔ دھند کا حال، لاہور کی موجودہ فضا، سفر کا حال وغیرہ وغیرہ۔

گھر میں خالہ امی کو اتارا اور امی سے کہا کہ ''میں حیدر کو چھوڑ کر آتا ہوں۔''

گاڑی چلتے ہی حیدر مجھ سے مخاطب ہوا ''کون تھی وہ۔؟''

''کون۔؟'' میں نے 'کون' پر زور دیتے ہوئے کہا

''مجھے بیوقوف مت بناؤ۔ سیدھے سیدھے بتاؤ وہ لڑکی کون تھی اور تم اسے کب سے جانتے ہو۔

حیدر میری بات ماننے کو تیار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے میں اس کو یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا۔

اس رات کروٹیں بدلتے ہوئے بار بار اس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آتا رہا۔ اس وقت کا چہرہ جب اس نے بچہ میری گود میں ڈال دیا تھا، اس وقت کا چہرہ جب وہ ٹرین پر چڑھ کر بچہ میری گود سے لے رہی تھی۔ دونوں مرتبہ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں اتری تھیں۔ البتہ دوسری مرتبہ جب وہ جھک کر بچہ میرے ہاتھوں سے لے رہی تھی۔ اس کا بدن۔۔۔اس کی پتلی کمر کا جھکاؤ۔۔۔اس کی حسین گردن کا خم ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے فوکس میں آ گئے تھے اور میرے دل پر وہ ایلورا اور ایجنٹا کی کسی مورت کی طرح ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی مورتی انتہائی دلنوازی کے ساتھ متحرک تھی جب کہ ایلورا اور ایجنٹا کی مورتیاں اپنی تمام حشر سامانیوں کے با وجود پتھریلی اور ساکت ہیں۔

اس کی آنکھیں۔۔اس کی آواز۔۔اسکے چہرے کی زبان، اس کا برتاؤ سب مل کر غیر معمولی اپنائیت۔ اعتماد اور حکمرانہ شان کا ملا جلا تاثر دے رہے تھے۔

''وہ کون تھی۔؟'' میں اس کو نہیں جانتا تھا۔

''کیا وہ مجھے جانتی تھی۔؟'' آخر اس نے بچہ میری ہی گود میں کیوں ڈالا۔۔۔حیدر بھی تو ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔۔۔اور وہ کیسے اس یقین کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی کہ میں اس کے پیچھے ضرور آؤں گا۔۔۔میں اس کو سوچ رہا تھا، اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جو اچانک میری زندگی میں آ گئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں اپنا حکم چلا گئی تھی۔

وہ رات اس کی تھی۔ گھر کے سب لوگ سو چکے تھے، گھر بھی سو گیا تھا، آہستہ آہستہ سارا شہر سو گیا سوائے ٹریفک کی گھوں گھوں کے جو بڑے شہروں میں رات کے آخری پہر تک جاری رہتی ہے، صبح تڑکے کے شور میں خلط ملط ہونے تک۔ اس رات میری آدھی جاگی، آدھی سوئی آنکھوں میں وہ جانے کب تک راج کرتی رہی اور جانے کب میرے پپوٹوں کے کواڑ بند کر کے پلکوں کے پردے گرا کر شاید خود بھی سو گئی۔

ایک مرتبہ پھر زندگی معمول پر یا روز کے معمولات پر آ گئی تھی۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے زندگی اور وقت کے سفر میں جو واقعہ ہو رہا ہوتا ہے، نیا ہی ہوتا ہے خواہ وہ تواتر میں ہو رہا ہو۔ سورج ہر روز نکلتا ہے اور نکلتا رہے گا لیکن ہر روز ایک نیا سورج ہو گا جیسے ہر روز ایک نیا دن۔۔۔

میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں، مجھے یاد نہیں کہ پہلے میں اس طرح سوچتا تھا۔ کہیں یہ سوچ اسی کا تحفہ تو نہیں۔ میرا یہ سوچنا تھا کہ اچانک وہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''تم یہ سب اس لئے سوچ رہے ہو کہ تمہارا اندر مجھے سوچ رہا ہے اور تمہارا باہر میری سوچ سے بھاگ رہا ہے۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کو شرارتی مسکراہٹ کی آزمائش سے مزید خوبصورت بنا رہی تھی۔

تم۔۔۔پھر آ گئیں۔۔۔؟ میں نے دل ہی دل میں اس سے پوچھا۔

''میں گئی ہی کب تھی، تمہارے آس پاس تو تھی۔'' وہ شوخی سے بولی۔

میں جانتا ہوں تم نہیں ہو، تم بچے کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو کر جا چکی ہو۔۔۔میں اکثر اسی وقت اسٹیشن کی اسی بنچ پر بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہتا ہوں۔۔۔کیا پتہ تم آ جاؤ۔۔۔اور تحکمانہ لہجے میں بولو 'اٹھو میں تمہیں لینے آئی ہوں۔' پھر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں کیوں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔۔۔تم ایک عدد بچے کی ماں ہو، تمہاری ایک فیملی ہو گی۔۔۔

امی کو آتا دیکھ کر میں نے ہوش میں آنے کی کوشش کی میں نے سر کے بالوں میں انگلیوں سے کئی مرتبہ کنگھی کی، کنپٹیوں اور کانوں پر ہاتھوں سے اچھی طرح سے تیز تیز مساج کیا، ان گنت مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔ مگر ان کوششوں کے باوجود شاید میں اپنے نارمل وجود میں لوٹ کر نہ آ سکا۔ جتنی دیر امی مجھ سے ہمکلام رہیں میں ان سے نظریں چراتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے میں اور امی ڈائننگ روم میں چلے گئے جہاں گرم گرم پراٹھے، آملیٹ اور قیمے کا ناشتہ ہمارا منتظر تھا۔ گھر کے سب لوگ ملک کی گرما گرم سیاست اور دھرنوں پر بات چیت کر رہے تھے۔ میں اس گپ شپ میں سامع کے طور پر شریک تھا۔ شاید ان کی گفتگو ٹھیک سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ آج پھر وہ لڑکی یا عورت بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہی تھی۔ والد صاحب نے تیسرے چائے کے کپ کی چسکی لیتے ہوئے، میری طرف دیکھ کر کہا۔

''صاحبزادے آپ کس دنیا میں گم ہیں۔؟''

''نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں سب کی باتیں سن رہا تھا۔'' میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

بابا نے میری طرف گہری نگاہ ڈالی، چائے کی پیالی میز پر رکھی اور

اٹھ کھڑے ہوئے۔

وقت تیز رفتار موجوں کی طرح بہے چلا جا رہا تھا۔ اس عرصے میں، میں نے اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بہت تلاش کیا۔ تفریحی مقامات پر، بازاروں میں، اسٹیشن پر اور نجانے کہاں کہاں۔۔۔ ہر جگہ میری نگاہیں اسے ڈھونڈھنے لگتیں۔۔۔ کبھی کبھی مجھے اپنے آپ پر ہنسی بھی آنے لگتی یہ سوچ کر کہ مجھے اس کا نام تک تو معلوم نہیں۔۔۔

امتحان سر پر آ گئے، میں پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اب بہت کم اس کا خیال آتا تھا، بلکہ کبھی کبھی میں خود اسے اپنے گزرے ہوئے وقت میں ڈھونڈھنے لگتا۔ اور میری نگاہوں کے سامنے بہت سے ادھورے اور کچھ پورے چہرے ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتے اور میں تھک کر سو جاتا۔

اس دن میں غیر ارادی طور پر اسٹیشن پہنچ گیا اور پلیٹ فارم پر اس بنچ کی طرف گیا جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔

چند لمحوں کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

''تم۔۔! بے اختیار میرے منہ سے نکلا''

کچھ دیر وہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ اور حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''مجھے بھی تم کو دیکھ کر اتنی ہی حیرت ہو رہی ہے جتنی تمہیں۔'' پھر بولی ''بیٹھ جاؤ۔''

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جیسے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی ہو۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر میں نے پوچھا۔

''کیا تم مجھے پہلے سے جانتی ہو۔؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا

''کیا واقعی آپ کو یاد نہیں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اس دن کے اسٹیشن والے واقعے سے پہلے ہم کبھی ملے تھے۔''

اچانک اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ وہ بولی

''آپ کو آج سے تقریباً چار سال پہلے یونیورسٹی روڈ پر ہونے والا حادثہ یاد ہے جس میں ایک جیپ نے ایک گاڑی کو ٹکر ماری تھی اور گاڑی بری طرح تباہ ہو گئی تھی۔''

اس کے کہنے کے ساتھ وہ حادثہ مجھے یاد آ گیا اور پرت در پرت سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔ میں یونیورسٹی سے آ رہا تھا اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا جیپ جو ایک نوجوان لڑکا چلا رہا تھا، اس نے ایک گاڑی کو ٹکر ماری، گاڑی دو تین قلابازیاں کھا کر تھوڑی دور جا گری اور لڑکا جیپ لے کر تیزی سے فرار ہو گیا۔ کوئی اس جیپ کا نمبر بھی نوٹ نہ کر سکا۔

مجمع، شور پکار، لوگوں کی آوازیں۔۔۔ کچھ مشتعل لوگوں نے وہاں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔۔۔

کچھ لوگ گاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور زخمیوں کو نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ گاڑی کے دروازے نہیں کھل رہے تھے بڑی مشکل سے دروازے کھولے گئے اور زخمی جو تقریباً چھ نفوس تھے ان کو نکال کر اسپتال لے جانے کے لئے مختلف گاڑیوں میں ڈالا گیا، ایک لڑکی جس کو سب سے آخر میں نکالا گیا تھا، کافی زخمی تھی۔۔۔ میں بھی مدد کرنے والوں میں شامل تھا، ایک صاحب نے مجھ سے کہا ''ان گاڑیوں میں جگہ نہیں ہے اگر آپ کے پاس گاڑی ہے تو اس لڑکی کو اسپتال تک پہنچا دیں۔'' میں اپنی گاڑی لے کر آیا اور ان صاحب کی مدد سے اس لڑکی کو گاڑی میں ڈالا، جب میں اس کو بیلٹ لگا رہا تھا تو میں نے دیکھا اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ تمام زخمیوں کو شان ہسپتال جو نزدیک تھا پہنچایا گیا، میں بھی لڑکی کو لے کر وہیں پہنچا، جب لڑکی کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے تو میں وہاں سے چلا آیا۔ پولس کے چکر سے بچنے کے لئے۔۔۔ اس وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ ''کیا امراء کے بچوں کے نزدیک کسی کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔؟'' یقیناً وہ لڑکا کسی وزیر کا، کسی زمیندار کا، کسی مل مالک کا بگڑا ہوا بیٹا ہوگا۔

اتنے سال بیت گئے میں تو اس حادثے کو بالکل بھول چکا تھا۔ مگر تمہارا اس حادثے سے کیا تعلق ہے۔۔۔؟

''میں وہی لڑکی ہوں جسے آپ نے اپنی گاڑی میں اسپتال پہنچایا تھا۔ اس حادثے کی وجہ سے جو تکلیف ہمارے پورے گھر نے اٹھائی ہے وہ ہم لوگ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ نہ کوئی معذور ہوا اور نہ کسی کی زندگی ختم ہوئی۔ میں تو کافی لمبے عرصے تک ہسپتال میں رہی۔''

تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش ہو گئی پھر بولی۔

''یہ حادثہ تو جیسے میرے ذہن و دل میں محفوظ ہو گیا ہے۔ ٹکراؤ، دھماکا، جھٹکا۔۔ جیسے زلزلہ آ گیا ہو، چیخیں آوازیں، شور پکار، بیہوشی اور نیم بے ہوشی کی لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی کیفیت۔ شدید اذیت جو دانتوں کو بھینچنے سے بھی کم نہ ہوتی تھی۔ موت کا احساس موقع موقع سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔۔۔ اس منظر میں تم اکثر آ موجود ہوتے شاید اس لئے کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے تمہارا ہی چہرہ دیکھا تھا جو میرے ذہن میں تصویر ہو کر رہ گیا تھا۔ جب بھی میں اکیلی ہوتی یا فرصت میں ہوتی تمہارا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ موجود ہوتا۔ اندر ہی اندر تم سے ملنے کی خلش پیدا ہوتی، میری آنکھیں تمہیں ہر جگہ تلاش کرتیں۔۔۔''

''جیپ کا ڈرائیور پکڑا گیا۔؟'' میں نے موضوع بدلا۔

''کبھی بڑے آدمیوں کے بچے بھی پکڑے جاتے ہیں۔۔۔؟ کتنے سفاک ہوتے ہیں یہ لوگ۔۔۔؟ ان کی بلا سے کوئی مرے یا جئے۔''

اس نے طنز کی تلخی اپنے لہجے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آج تم اپنے بیٹے کو ساتھ نہیں لائیں'' میں نے پوچھا

''کون بیٹا۔؟''اس نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ارے بھئی وہ بچہ جو اس دن تم نے میری گود میں ڈال دیا تھا۔''
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''وہ بچہ۔۔۔وہ تو میرا بھانجا ہے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔''
''ہم دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے نام سے واقف نہیں۔؟''
میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''زرمینا۔''اور تمہارا۔۔؟
''سرمد۔''میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد ہم اکثر ملتے رہتے۔اسٹیشن کی وہ بنچ ہماری ملاقات کی جگہ بن گئی تھی۔کسی ٹرین کے آنے پر اس میں سے اترتے چڑھتے لوگوں پر تبصرہ کرتے، ایک دوسرے کے فقروں پر ہنستے، مسکراتے۔۔۔باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس کے قبیلے میں کسی کی بھی شادی خاندان سے باہر نہیں ہو سکتی۔۔۔پھر بھی ہم مل رہے تھے۔
پھر اچانک وہ دن آ گیا۔ہم دونوں کے درمیان ''فیصلے'' کا دن۔
اس دن وہ بہت سنجیدہ تھی۔کہنے لگی
''کیا تم ہر حال میں میرا ساتھ دے سکو گے۔۔؟''
''تمہارا ساتھ۔۔۔تمہارا ساتھ تو میں مرتے دم تک دے سکتا ہوں۔''
اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔۔۔تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی پھر بولی
''کل تم اپنا ضروری اسباب وغیرہ لے کر شام پانچ بجے اسی جگہ پہنچ جانا۔اسکے بعد نہ تو وہ کچھ بولی اور نہ ہی میں۔۔۔ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دیر تک بیٹھے رہے۔
دوسرے دن میں وہاں پہنچا تو وہ پہلے سے موجود تھی، اسی بنچ پر، پرس اور ایک ہینڈ کیری کے ساتھ۔
اس نے میری طرف ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ سے دیکھا اور بولی
''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔''
''میں ٹکٹ لے آتا ہوں، ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟''میں نے اس سے کہا۔
''ٹکٹ میں نے لے لئے ہیں۔''اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دو ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا اس نے میرے دوسرے سوال کا جواب نہیں دیا۔تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔وہ کھڑی ہوئی اس نے پرس کاندھے پر ڈالا، ہینڈ کیری کو گھسیٹنے کے انداز میں پکڑا اور بولی:
''چلو!۔''
میں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔اور پھر ہم دونوں ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔کچھ ہی دیر بعد ٹرین اسٹیشن سے آگے نکل گئی۔

لنگھے کل دے وانگ

حنیف باوا (جھنگ)

لنگھے کل
اس توں وی اگلے لنگھے کل دے وانگ
اج وی
امن دے ناں دے
ایٹم بم۔
سر جنوں بند نہیں ہوئے
اج وی
دھرتی ماں دی ہِک نوں
لوسن دے لئی تیار کھلّے نیں
پر
ایس دھرتی دے پردھانوں
لکھاں انہاں نوں دوجیاں دے لئی
اپنی بُکل دے وچ کج کے رکھو
انہاں دے نل پیار کرو
جتّاں چاہوو
سپاں دے وانگ ''چولیاں ددھ پیاؤ''
پر کی۔۔۔
انہاں بمباں نیں
ہسدی وسدی حیاتی نُوں
جدوی۔تے جتھے وی
اپنا آپ وکھایا
تاں پھیر
کی ایہہ بمب
ساڈے تہاڈے لئی
اگ دی نھانویں
پھلاں دا سینہ برساواں گے؟
دسّو
ایس جگ دے پردھانوں
دسّو۔۔۔

گائے ہماری ماتا ہے

شموئل احمد

(پٹنہ، بھارت)

اب کھلنے کی ریت ہے۔اب ایک بار میں قتل نہیں کرتے ہیں۔اب ایک آدمی کو سب مل کر کچلتے ہیں۔اخلاق کچلے گئے۔ پہلو خاں کچلے گئے۔اور وزیر محترم کو فکر تھی کہ باقی گوشت کہاں ہے؟ ایک گائے سے ڈیڑھ من گوشت برآمد ہوتا ہے۔اخلاق نے زیادہ سے زیادہ ایک کیلو گوشت کھایا ہوگا.....باقی.....؟محترم کا اصرار تھا کہ اس کی جانچ ہونی چاہیے۔ پہلو میاں تسکری میں کیوں لگ گئے؟ اس بات پر وزیر محترم ناراض تھے کہ جب گائے کی تسکری پر پابندی ہے تو میاں جی نے جرأت کیسے کی؟ گئو رکشک تو روکنے کی کوشش ضرور کرینگے۔اور دیوار پر وقت کی تحریر تھی کہ تم لوگ گائے سے دور رہو ورنہ.....

یہ تحریر سب سے پہلے معظم خاں نے پڑھی اور اپنی دونوں جرسی گائیں واپس کر دیں جو انہیں تحفے میں ملی تھیں۔سیف کے دادا کے پاس بھی ایک جرسی گائے تھی جو کرشن مراری نے دی تھی۔کرشن مراری سے ان کا یارانہ پرانا تھا۔وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تو دو پلّی ٹوپی پہنتے اور دادا سے دعا کی درخواست کرتے۔دادا مصلّے پر بیٹھ جاتے اور کرشن مراری ٹوپی پہنے سامنے دوزانو ہو جاتے۔دادا سورہء یونس کے ساتھ دعا مانگتے ''یا اللہ...جس طرح تو نے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے صحیح سلامت نکالا اسی طرح میرے دوست کو مصیبت کے پھندے سے آزاد کر....'' وہ کرشن مراری کو تعویز اور نقش وغیرہ بھی دیتے رہتے تھے۔کبھی الجامع کی تعویز دی تو کبھی یاحفیظُ کا نقش دیا۔ایک بار الغنیُ کا نقش دیا تو کرشن مراری کے کاروبار میں حیرت انگیز ترقّی ہوئی۔کرشن مراری بوڑھے ہوگئے تھے۔ یہاں ان کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ بیٹے نے اپنے پاس امریکہ بلا لیا تو جاتے جاتے اپنی جرسی گائے دادا کی نذر کر دی۔ پندرہ سولہ سال کا مجنا بھی حصّے میں آیا۔لمبوترے چہرے والا مجنا ذات کا ہری جن تھا۔ وہ کالا بھجنگ تھا اور دانت بالکل سفید۔ہنستا تو چہرے کی سیاہی پھیلتی اور دانت جگمگاتے۔لیکن کرشن مراری نے اسے بچپن سے پالا تھا۔گائے کی دیکھ ریکھ وہی کرتا تھا۔گائے کو نہلاتا اور گوبر اٹھاتا لیکن دودھ دوسرا ملازم دوہتا جو ذات کا ہریجن نہیں تھا۔ مجنا کی دلی تمنّا تھی کہ کبھی وہ بھی دودھ دوہتا۔سر سر کی آواز کے ساتھ دودھ کی دھار بالٹی میں گرتی اور جھاگ سا اٹھتا تو مجنا پر نشہ سا چھانے لگتا اور بڑی حسرت سے سوچتا کہ کاش کبھی.....

وداع ہوتے وقت کرشن مراری جی نے مجنا کا ہاتھ دادا کے ہاتھ میں تھمایا بھی نہیں تھا کہ رقّت طاری ہوگئی ''اس کا خیال رکھنا، یہ میری آنکھ کا تارہ ہے...اور دادا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

دادا نے آنگن کے کونے پر گوہال بنوا دیا۔ مجنا کے لئے بھی چھوٹی سی کوٹھری بنوا دی اور اس کو دودھ دوہنے کا اختیار دیا۔ مجنا کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اتنی عزّت کسی نے نہیں دی تھی۔دادا کے قدموں میں گر گیا اور دیر تک روتا رہا۔وہ گائے کو ماتا کہتا تھا۔دادا بھی ماتا کہنے لگے۔ مجنا گھر کے دوسرے کام بھی کرنے لگا اور بہت جلد سب کا ہر دلعزیز بن گیا۔لیکن دادا نے اس کو اپنے لئے وقف کر لیا۔اس کی کھاٹ عقبی برآمدے کے کونے میں لگوائی۔خود برآمدے میں سوتے تھے۔دھوپ اور پانی سے بچنے کے لئے شہتیر سے برساتی لگا رکھی تھی۔ہر موسم میں ان کی کھاٹ یہاں پڑی رہتی اور وہ دن بھر پڑے حقّہ گڑگڑاتے رہتے۔ بیچ بیچ میں اٹھ کر آنگن کی پھلواری پٹاتے۔ماتا کو گڑ کھلاتے اور یہ شعر گنگناتے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی

اس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائی دودھ کی دھاریں۔

مجنا شعر پر سر دھنتا تھا۔ماتا بھی گردن ہلانے لگتیں۔ مجنا نے بہت کوشش کی کہ شعر یاد ہو جائے لیکن کچھ الفاظ کی ادائیگی میں گڑبڑ ہو جاتی۔تب دادا نے اسے مقامی بولی میں ازبر کرایا۔

رب کا سکر منا وہ بھیوا؛ جس نے ہمرو گائے بنایا

مجنا جھوم جھوم کر شعر پڑھتا اور دودھ دوہتا...سر...سر...ہمرو میّا کی دھار تو دیکھو....! ماتا روز دس کیلو دودھ دیتی تھیں۔ایک دن دیکھا کھیاں پریشان کر رہی ہیں۔دادا نے گوہال میں فوراً ٹیبل فین لگایا۔

بوڑھے کے پاس مستقبل نہیں ہوتا۔ پاس بیٹھ جاؤ تو ماضی کے قصّے سنائے گا۔لیکن دادا کے ماضی میں ماتائیں سمائی ہوئی تھیں۔شام کو جب بستر پر پڑے حقّہ گڑگڑاتے اور مجنا ان کے پاؤں دباتا تو اس کو تاریخ کی گھٹّی پلاتے کہ کس طرح ونوبا بھاوے نے سن 1966 میں سارے ملک میں گائے کشی کے خلاف قانون بنانے کی مہم چلائی تھی اور اندرا گاندھی نے گائے رکشا آندولن میں گولی چلوا دی تھی۔دادا مجنا کو سمجھاتے کہ ماتا جی بی جے پی والوں کے لئے خاص چیز رہی ہیں۔وہ ماتا کے ذریعہ ہندوؤں کو ایک جٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سن 1882 میں دیانند سرسوتی نے گئو رکشنی سبھا کی بنیاد ڈالی تھی جس کے کچھ عرصہ بعد اعظم گڑھ اور بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے تھے۔اور یہ کہ سن 1925 میں آر ایس ایس کی بنیاد...

آر ایس ایس تک آتے آتے .حقّہ کی نے منھ سے چھوٹ جاتی....

دادا خرخر کرنے لگتے اور مجنا بھی ان کے پاؤں پر لڑھک جاتا۔

اچانک جوگی مہیش نے بوچڑ خانے بند کرا دیئے۔حکومت نے بھی جانوروں کی خرید وفروخت پر پابندی لگا دی۔مہندر آچاریہ ناراض ہوئے کہ گائے کے کاروبار میں اسّی فی صد لوگ ہندو ہیں پھر ایک فرقہ کو نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے۔

اسی دن سانڈ گھر میں گھسا اور دادا کے کولہے کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔

دیوار کی تحریر گہری ہوگئی۔دادا گہری نیند میں تھے کہ اچانک سانڈ کے رمبانے کی آواز سے نیند ٹوٹ گئی۔سیف بھی جاگ گیا۔سانڈ کو دیکھ کر اپنا کیمرہ لے

آیا۔دادانے دیکھا سانڈ ماتا جی سے اٹھکھیلیاں کر رہا ہے۔دادا ڈنڈا لے کر دوڑے۔ سانڈ زور سے اچھلا۔پھولوں کی کیاری روندتا ہوا برآمدے میں گھسا اور دادا کی کھاٹ الٹ دی۔دادا نے بڑھ کر ڈنڈا جمایا تو سانڈ نے ان کو سینگ پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔دادا امرود کے پیڑ سے ٹکرا کر نیچے گرے۔کولہے کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔وہ زور سے چلّائے۔ان کی آواز سن کر گھر کے افراد دوڑ کر آئے۔سب نے مل کر کسی طرح سانڈ کو دور بھگایا۔ان کو شہر کے اسپتال میں بھرتی کرنا پڑا۔صحت یاب ہونے میں دو ماہ لگ گئے۔

سارا منظر سیف نے وی ڈی او میں قید کر لیا تھا۔دو دنوں تک سوچتا رہا کہ اسے سوشل میڈیا پر ڈالنا چاہیے یا نہیں۔آخر اس نے فیک آئی ڈی کے ساتھ وی ڈی او لانچ کر دیا۔منٹوں میں ردّعمل آنے لگے۔دوسرے دن سفید شرٹ اور ہاف پینٹ میں ملبوس کسی ونود بھاسکر کا وی ڈی او سامنے آیا۔بھاسکر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''ابھی تو ایک سانڈ چھوڑا ہے اور تمہاری ہڈّی ٹوٹ گئی۔

ایسے ایسے لاکھوں سانڈ ہیں۔اگر چھوڑ دیا تو کچلے جاؤ گے۔

گائے ہماری ماتا ہے اور تم اسے کھاتے ہو۔سالے...حرامی۔''

سیف وی ڈی او دیکھ کر محظوظ ہوا۔یہ سوچ کر خوش ہوا کہ آر ایس ایس کی اولاد اس کی آئی ڈی کو کسی ہندو کی آئی ڈی سمجھ رہی ہے۔لیکن دادا ڈر گئے،انہیں احساس ہوا کہ گائے سے فاصلہ بنائے رکھنے میں خیریت ہے۔انہوں نے اخلاق اور پہلو خاں کے کچلے جانے کا وی ڈی او بھی دیکھا تھا۔ہر طرف سے لاٹھاں تلوار گڑانسے برس رہے تھے۔کوئی کمر پر وار کر رہا تھا،کوئی سر پر کوئی ٹانگوں پر کوئی سینے پر۔مر جانے کے بعد بھی کچلنے کا عمل جاری تھا۔دادا ہل گئے تھے۔اس وقت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ ان کی قوم کو مسیج تھا کہ گائے سے دور رہو۔اب انہیں ماتا جی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔انہیں یقین تھا کہ سانڈ پھر گھر میں گھسے گا۔اور دیوار کی تحریر بھی یہی تھی۔وہ منتری کے اس بیان سے اور بھی سہم گئے تھے کہ گائے کی تسکری غیر قانونی ہے اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ انہیں روکنے کے لیے ہی گئو رکشک سمیتی بنی ہے۔یعنی مقتول مجرم تھا اور قاتل حق بہ جانب۔

سانڈ سب کے لیے مسلہ بنا ہوا تھا۔اس نے سب کی فصلیں تباہ کیں۔اسے روکنے کا کسی میں یارا نہیں تھا۔جانور کی خرید فروخت بند تھی۔پشو میلہ تو کب کا بند ہو چکا تھا۔جو جانور کسی لائق نہیں تھے انہیں بیچا نہیں جا سکتا تھا۔لوگ انہیں کھلا چھوڑ دیتے تھے جو کھیت خراب کر دیتے تھے۔بیمار ماتائیں اسکول کے برآمدے میں قیلولہ فرماتی تھیں۔برآمدہ گوبر سے بھرا رہتا۔بچّے گوبر صاف کرتے تب پڑھائی شروع ہوتی۔گاؤں والے پہلے صبح اٹھ کر اپنا کام کرتے تھے۔اب صبح ڈنڈا لے کر کھیت جاتے کہ ماتا تو اندر نہیں گھس گئیں۔لاکھ پہرہ دو کوئی نہ کوئی جانور اندر گھس جاتا۔سب کو سانڈ کے مرنے کا انتظار تھا۔خود مار نہیں سکتے تھے کہ گئوکشی کے مرتکب ہوتے۔

دادا کے ماضی سے اب ماتائیں نکل گئی تھیں۔حقّہ گڑگڑاتے ہوئے وہ اب مچنا سے اس قسم کی گفتگو نہیں کرتے تھے کہ نہرو کے وقت میں یہ کوئی مسلہ نہیں تھا اور بی جے پی جب جن سنگھ ہوا کرتی تھی تو اس وقت بھی اس نے گائے کو سیاسی حربہ بنایا تھا۔دادا کو فکر تھی کہ ماتا جی سے چھٹکارہ کس طرح حاصل کیا جائے۔گاؤں میں کسی کو دان کرنا مناسب نہیں تھا۔وہ یہی سوچتا کہ ماتا جی میاں جی کے گھر سے آئی ہیں۔دادا نے سوچا کہ تھانے میں باندھ کر چلے آئیں۔پولیس جو مناسب سمجھے گی کرے گی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔سیف کے کالج کا اکاونٹنٹ رمیش رجک گائے خریدنے کے لئے راضی ہو گیا۔مچنا کو چھٹپٹاہٹ ہوئی۔ماتا جی چلی جائینگی تو وہ سیوا کس کی کرے گا۔وہ اداس ہو گیا۔بھوک پیاس ختم ہوگئی۔ایک کونے میں گم صم بیٹھا پرنم آنکھوں سے ماتا کو نہارتا رہتا۔دادا نے تسلّی دی کہ بکری پالیں گے۔بکری سے ہندؤں کا کوئی مذہبی رشتہ نہیں ہے۔بلکہ بکری پالنا سنّت ہے اور پیغمبر بھیڑ بکری چرایا کرتے تھے۔لیکن مچنا بیمار پڑ گیا اور ماتا ماتا بڑبڑانے لگا تو دادا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مچنا کو ساتھ کر دینگے۔ وہ ماتا کے ساتھ آیا تھا ماتا کے ساتھ اپنے سماج سے جا ملے گا۔

سیف نے کورٹ سے گائے کی خرید فروخت کا مسّودہ تیار کیا۔گائے کی تصویر بھی منسلک کی تا کہ تسکری کا الزام نہیں لگے۔اب مسئلہ تھا گائے کو لے جانا۔رمیش گائے اپنے گاؤں بھیجنا چاہتا تھا جو دادا کے گاؤں سے دو سو کیلو میٹر دور تھا۔رمیش نے ٹرک کا انتظام کیا۔دروازے پر ٹرک آ کر لگی تو گاؤں والوں کو تجسس ہوا کہ کیا چیز ٹرک سے بھیجی جا رہی ہے۔بات منٹوں میں پھیل گئی کہ دادا نے گائے بیچی ہے۔گاؤں کا سرپنچ براہمن تھا۔اس کو فکر ہوئی کہ گائے کس نے خریدی؟ جب معلوم ہوا کہ کوئی رمیش رجک ہے تو سرپنچ کے ماتھے پر بل پڑ گئے....شدر اور گائے....؟

رمیش کے پاس خرید کے کاغذات تھے۔اس نے گائے ٹرک پر لدوائی مچنا کو ساتھ لیا خود بھی بیٹھا اور چل پڑا۔سرپنچ نے گئو رکشک واھنی کو فون کر دیا کہ شدر جرسی گائے کی تسکری کر رہا ہے۔ٹرک بلوا چوک سے آگے نہیں بڑھ سکا۔گئو رکشک ہتھیاروں سے لیس کھڑے تھے۔راستہ بلّہ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔رمیش نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر کاغذ دکھایا۔

''باہر نکل سالا۔۔۔''

کاغذ دیکھنے کے بجائے کسی نے انہیں نیچے کھینچ لیا۔بھارت ماتا کی جے کے نعرے سے فضا گونج اٹھی۔رمیش ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

''میں مسلمان نہیں ہوں بھیّا.....میں مسلمان نہیں ہوں۔''

سر پر زور کی لاٹھی پڑی۔''چپ سالا دلت.....''

کچلنے کا عمل شروع ہو گیا۔وہ چلّاتا رہا....'' میں مسلمان نہیں ہوں....میں مسلمان نہیں ہوں۔آخری بار وہ زور سے چلّایا۔''میں ہندو ہوں....'' اس طرح چلّاتے ہوئے بھول گیا تھا کہ وہ دلت ہے اور براہما کے پاؤں سے پیدہ ہوا ہے۔اسے گائے رکھنے کا اختیار نہیں ہے۔وہ مری ہوئی گائے کی چمڑی ادھیڑ سکتا ہے لیکن دودھ نہیں دوہ سکتا.........

اور دیوار پر نئی تحریر اُگ آئی تھی۔

''ملیچھ کا ساتھ دو گے تو.....''

جلتی بے خبری سے، کرن کا جنم

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

جلتے جلتے زمانے، قرن یا پھر صدیاں بیت گئی تھیں۔ اپنی آگ میں خود ہی جھلس کر، جل کر یوں لگا تھا کہ خاک ہوئے بھی زمانے بیت گئے!
اپنی جلن اور اُگن سے گھبرا کر اپنے ہی حبس سے مرتے ہوئے سورج نے سر اٹھا کر دیکھا!
دور تک اُسے سوائے آگ کے شعلوں کے جہنم، ویرانی اور تنہائی کے کچھ نظر نہیں آیا!
پناہ کہیں نہیں ملی!
پھر آگ نے ہی آگ کو پناہ دی!
اِک زمانہ اور بیتا جلتے ہوئے!
یوں لگا سورج کو۔۔۔کہ اَب تو جل جل کر شاید خاک بھی نہ بچی ہو!
جلتے جلتے شاید سات قرن بیت گئے تھے!
یا پھر سات سو قرن!
وقت کا حساب بھی راکھ ہوا تھا!
سورج نے اپنی آگ جلن، اُگن اور حبس سے گھبرا کر ایک بار پھر نظر اُٹھائی!
ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔۔۔
دور تک شعلے تھے! بلند قامت شعلے آگ ہی آگ!
سورج نے نگاہ کے دائرے کو مزید وسیع کیا
آگ کے گولے اور دور تک پھیلے آگ کے غبار کے باہر پھر اک غور کی گہری نگاہ ڈالی!
اسے اِس غبار کے پاس ایک مدہم سادھبا نظر آیا!
جَلن کی شدت نے اس دھبے کو ایک داغ کی طرح سیاہ دِکھایا!
اس کے باوجود ایک حیرت وخوشی تھی کہ اس آگ میں خاک ہونے کی جرات کس کو ہوئی!
کون تھا جو قرنوں کے سفر کو طے کر کے اسکی آگ کے قریب آیا تھا!!!
اَب غور کی نگاہ نے حیرت ومحبت کا لبادہ اوڑھا!
سورج نے دیکھا اس کے پاس آنے والی سیاہی نہیں تھی!
بلکہ روشنی کی چمکتی ایک لکیر تھی۔۔۔
ایک ننھی سی کرن۔۔

جو محبت، عقیدت کے وفور سے بھیگتی، ایک لمبا سفر زمانوں، قرنوں کا سفر طے کر کے صرف یہ بتانے آئی تھی کہ'' آپ کے وجود سے ایسی حرارت وحیات بخش روشنی پھوٹتی ہے کہ میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔۔۔
آپ روشنی کا مینار ہیں۔۔۔آب حیات ہیں۔۔۔
آپ کے ہوتے کبھی گمراہی کی آگ گرفت نہیں کر سکتی کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کی روشنی سے مجھ جیسے کتنے وجود منور ہوتے ہیں۔۔۔
سورج نے اپنے وجود کی جلتی آگ کے بے خبری سے سر اٹھایا۔۔۔حیرت سے اپنے ارد گرد پھیلے خلد پہ نظر دوڑائی، اپنی بے خبری پہ۔۔۔سورج کب یہ جانتا تھا کہ اس کی جلن اس کی اگن کتنی روشنی پھیلا کر کتنی کرنوں کو جنم دے چکی تھی۔۔۔ دیتی چلی جا رہی تھی!
روشنی کی اس خبر نے سورج کی آنکھیں نم کر دیں۔۔۔اس نے اپنے وجود میں جلتے آگ کے دوزخ کو دیکھا اور ندامت سے اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے!

- بقیہ -

داؤد کا چاند

کشش کم نہیں ہوئی۔ اُس کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ اُس سے بچھڑنے کی کسک مدھم نہیں پڑی۔ اُن کی نظم ''ہڈ بیتی'' اس کی گواہ ہے:

ایک عمر بھر روزے رکھے
اور مانگی لاکھ دعائیں
داؤد کا چاند نظر جو آئے
تو ہم بھی عید منائیں
چاند چڑھا نہ کوئی عرش پر
نہ عید ہی ہوئی کوئی
میرے لیے تو ساری عمر ہی
محرم جیسی ہوئی

یہ شاید صرف اُن کا ہی نہیں ہر اُس شخص کا المیہ ہے جو اپنی مٹی سے بچھڑنے پر مجبور ہو گیا۔
رب سے یہ ہی دعا ہے کہ اُن کی عمر دراز ہو، صحت یاب رہیں۔ اُن کا قلم اسی طرح ادبی شگوفوں سے اُردو ادب کے گلشن کو مہکاتا رہے۔ خوبصورت عورت کا ساتھ بنا رہے۔ دونوں اک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کے سفر پر گامزن رہیں۔ (آمین)

''نجومِ چشم''

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

ملے ہیں جو وہ غم بے جا نہیں ہیں
تری الفت میں ہم بے جا نہیں ہیں

چمک اُن کی فلک آرا ہوئی ہے
نجومِ چشم نم بے جا نہیں ہیں

انہیں سمجھے گا دل والا ہی کوئی
رموزِ کیف و کم بے جا نہیں ہیں

انہی سے نقشِ دنیا برملا ہے
مرے لوح وقلم بے جا نہیں ہیں

ہمارا صبر بھی ہر جا رہے گا
تمہارے بھی ستم بے جا نہیں ہیں

ہر اک محفل میں بول اُن کا ہے بالا
مرے شاعر ''عدم'' بے جا نہیں ہیں

یہی ہیں رہ نما منزل کے ثاقبؔ
مرے اٹھتے قدم بے جا نہیں ہیں

○

محمودالحسن

(راولپنڈی)

عشق ایثار تک نہیں پہنچا
تُو ابھی دار تک نہیں پہنچا
تیرا ایمان ہے ترے دل میں
تیرے کردار تک نہیں پہنچا
اچھے عیسیٰ نفس ہیں وہ جن کا
ہاتھ بیمار تک نہیں پہنچا
ہے وہ سر بارِ دوش جواب تک
رفعتِ دار تک نہیں پہنچا
منبعِ نُور بن گیا ہے جو
کیا تُو اُس غار تک نہیں پہنچا
کون سا درد ہے جو درد اے دل
تیرے دربار تک نہیں پہنچا
لاکھ چمکا مگر مہِ کامل
تیرے رُخسار تک نہیں پہنچا
دل پہ پہنچا دیا ہے لیکن میں
اپنے دلدار تک نہیں پہنچا
حیف اُس دل کی بدنصیبی پر
جو غمِ یار تک نہیں پہنچا
ہے تعجب کہ تیرا دل اب تک
میری سرکار تک نہیں پہنچا
عرش تک تو گیا ہے نالہِ شب
تیری دیوار تک نہیں پہنچا
راز ہے آج تک فسانہ دل
لبِ اظہار تک نہیں پہنچا
یوں نہ کرتا وہ ضبط کی تاکید
درد غمخوار تک نہیں پہنچا
رنگِ مدحت سرائیِ سلطاں
میرے اشعار تک نہیں پہنچا
ناز ہے عشق پر اگر محمودؔ
کیوں درِیار تک نہیں پہنچا

غالب عرفان
(کراچی)

چشم پوشی حیات سے کب تک؟
بے رخی اپنی ذات سے کب تک؟

بحث و تمحیص، دلیل اپنی جگہ
کشمکش ، بات بات سے کب تک

دل کا آئینہ صاف ہو تو کہوں
رغبتیں ، واہیات سے کب تک

خرچ اپنا تو اپنے بس میں رہے
بڑھ کے اپنی بساط سے کب تک

رابطہ ہو عوام سے ورنہ
دوستی شخصیات سے کب تک

آپ نقاد ہیں تو سچ لکھیں
کھیل یہ ، لفظیات سے کب تک

ہار تسلیم ہو، تو جرأت سے!
ورنہ شرم اپنی مات سے کب تک

علم و فن پر ہی گفتگو کرنا
حجتیں، ذاتیات سے کب تک

اپنی پہچان کے تجسس میں
فاصلہ شہرِ ذات سے کب تک

راہِ عرفاںؔ کا ہر سوال مگر
ذات اور کائنات سے کب تک؟

عبدالرحمٰن عبد
(امریکہ)

خوش دلی کے تذکرے،لفظوں کی سوغاتیں تو ہیں
وہ نہیں اس بزم میں، اُن کی مگر باتیں تو ہیں

چاندنی راتیں نہیں میرے مقدر میں تو کیا
کھل کے رو لیتا ہوں میں،تنہائی کی راتیں تو ہیں

جھوٹ ہے گر میں کہوں، مجھ سے کوئی ملتا نہیں
گاہے گاہے خواب میں اُن سے ملاقاتیں تو ہیں

کچھ تو لازم ہے غموں کی آبیاری کے لیے
موسمِ گل نہ سہی، اشکوں کی برساتیں تو ہیں

چاندنی، خاموشیِ شب، گفتگو، ہاتھوں میں ہاتھ
دل کے بہلانے کو وہ یادوں کی باراتیں تو ہیں

فیصل عظیم
(کینیڈا)

پلکیں نیند سے بوجھل ہیں یا اب منظر کی تاب نہیں
کیوں اِن جلتی آنکھوں میں اب رنگ برنگے خواب نہیں

اک مدّت سے کس ناطق کی نوکِ زباں پر اٹکا ہوں
میں اک لفظ ہوں گویا، وہ بھی معنی سے سیراب نہیں

آنکھیں ہیں یا خارِ مغیلاں، چہرہ ہے یا صحرا ہے
لفظ بہت نایاب ہیں پیارے، درد مگر نایاب نہیں

میری بلا سے، جھکنے والوں میں معبود بھی شامل ہوں
لیکن میرے سجدوں میں بت خانے کے آداب نہیں

فطرت کا پیغمبر کیا جانے سمجھوتے کی باتیں
دریا مُڑ سکتے ہیں، لیکن دریا کے سیلاب نہیں

آنکھوں اور چنیں گی کب تک آخر منظر کی کرچیں
مجھ میں تو اب جیسے اپنی نظروں کی بھی تاب نہیں

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

ہَوا اس کی گلی میں ٹھوکریں کھاتی تو اچھا تھا
سنبھل کر حال میرا اس کو بتلاتی تو اچھا تھا

میں اس کی قربتوں کا حظ اٹھاؤں گا بھلا کیسے
مہک اس کے بدن کی گر صبا لاتی تو اچھا تھا

اسے یوں ٹوٹ کر میری طرح اب کون چاہے گا
سمجھ میں بات یہ اس کے جو آجاتی تو اچھا تھا

خدا جانے وہ رویا یا نہ رویا تھا بچھڑے پر
اسے بیتے دنوں کی یاد تڑپاتی تو اچھا تھا

برا تھا یا بھلا، میں تو بُھلا بیٹھا تھا مدت سے
نہ مجھ کو یاد اس بے مہر کی آتی تو اچھا تھا

وہ شعلہ تھی کہ شبنم تھی مگر اے کاش یوں ہوتا
کہ بھولے سے وہ صورت خواب میں آتی تو اچھا تھا

زمانے سے حسنؔ اب اعتبارِ دوستی اٹھا!
جو باقی ہے خلش دل میں نکل جاتی تو اچھا تھا

○

اختر شاہجہاں پوری

(بھارت)

چھپا کر سادہ لفظوں میں غضب کی تلخیاں رکھ دیں
غزل میں ہم نے اپنے عہد کی محرومیاں رکھ دیں

تری آواز نے بڑھتے ہوئے میرے قدم روکے
مِری منزل قریب آئی تو، تُو نے بیڑیاں رکھ دیں

غبارِ مصلحت سے اَٹ چکے ہیں آج سب چہرے
مزاجوں سے کھرچ کر وقت نے ہمدردیاں رکھ دیں

یہ کس نے آج چپکے سے باندازِ رفیقانہ
مِری جلتی ہوئی آنکھوں پہ اپنی اُنگلیاں رکھ دیں

مجھے اندھے یقین کا آج خمیازہ بھگتنا ہے
شعور وفہم کی جس نے اُڑا کر دھجیاں رکھ دیں

تبسم ہے فصیلِ لب پہ گویا دھوپ پھیلی ہے
مٹا کر جس نے میرے ذہن سے تاریکیاں رکھ دیں

کہیں ایسا نہ ہو حرفِ تسلّی بوجھ بن جائے
کسی کے سامنے اخترؔ یہ کیوں مجبوریاں رکھ دیں

○

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا، بھارت)

وہ اگر با وفا نہیں ہوتا
عشق میں زاویقہ نہیں ہوتا

دل میں رکھئے خدائے برتر کو
ورنہ سجدہ ادا نہیں ہوتا

اُنگلیوں سے سنوار لو زلفیں
ہر جگہ آئینہ نہیں ہوتا

ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا
اس علاقے میں کیا نہیں ہوتا

الجھنیں، مُشکلیں، پریشانی
پیار میں کچھ نیا نہیں ہوتا

ہنستے ہنستے نکل پڑے آنسو
مشکلوں کا پتہ نہیں ہوتا

تم بھی جاوید یاد آتے ہو
''جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''

○

اشرف جاوید

(لاہور)

تُو فقط نشہء شاہی میں کھڑا تھا، شاہا!
تخت کے ساتھ ہی تختہ بھی پڑا تھا، شاہا!

قہرِ سلطانی میں سر کاٹ رہے ہو جس کا
وہی تیرے لیے دشمن سے لڑا تھا، شاہا!

کیا مقدر کا لکھا ٹال سکا ہے کوئی؟
امتحاں اُس کی عدالت کا کڑا تھا، شاہا!

دست بستہ سبھی درباری کھڑے رہتے تھے
دبدبہ ساری رعایا پہ بڑا تھا، شاہا!

ہر گھڑی ہاتھ میں رہتا تھا جڑاؤ خنجر
بے گنہ خون کا لعل اُس میں جڑا تھا، شاہا!

جھوٹ کا سکہ زمانے میں چلایا کس نے!
کون، پھر اپنی حماقت پہ اَڑا تھا، شاہا!

سوچتا ہو گا پڑا کنجِ قفس میں تو بھی!
لاؤ لشکر تھا کبھی، کوئی دھڑا تھا، شاہا!

بھانپ لینا تھا ہواؤں کا اشارہ کیا ہے!
جب درختوں سے کوئی پات جھڑا تھا، شاہا!

مُنہ سے نکلے ہُوئے الفاظ پلٹ سکتے ہیں
کیا ہوا تیر جو سینے میں گڑا تھا، شاہا!

○

کنفیشن

قمر جمالی
(حیدرآباد، دکن)

کچی پکی عمارتوں کا سلسلہ بہت دور تک جا کر یہاں ختم ہو جاتا تھا۔اب حدِّ نظر تک میدان ہی میدان تھا۔

درمیان سے گزرتی تارکول کی سڑک مردہ افعی کی طرح خاموش پڑی تھی۔ ہاں۔۔۔کبھی کبھی ایک آدھ راہ رو کے گزرنے سے گھڑی دو گھڑی کو اس کے خاموش سینے میں ذراسی ہلچل ہو جاتی،

پھر۔۔۔

وہی پہلی سی خاموشی۔

سڑک کے ایک طرف مختلف النوع درخت زمین سے اونچے فضا میں ناجائز قابضوں کی طرح ایک دوسرے کے پھیلاؤ میں مداخلت کئے کھڑے تھے جو ہوا کے ایک ذرا سے جھونکے پر ہاتھ پھیلا پھیلا کر ایک دوسرے پر چلاّنے اور کوسنے لگتے،تو۔۔۔

دوسری طرف یوکلپٹس کے دبلے پتلے درخت آسمان چھونے کی خواہش میں ضرورت سے زیادہ قدآور ہو گئے تھے اور ہوا کے معمولی سے جھکّوے جھک جھک کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے۔ پھر اتنی ہی تندہی سے دوبارہ ایستادہ بھی ہو جاتے۔

یہ علاقہ دراصل ہندوستان میں برٹش کراؤن کی عملداری میں برٹش باشندوں کی بودوباش کے لیے آباد کیا گیا تھا۔میدان میں دور دور تک ایک ایک ایکڑ اراضی پر محیط چند گنے چنے بنگلے بانجھ عورتوں کے آنچلوں کی طرح سمٹے سمٹائے بے نام وحرام کھڑے تھے۔اسی آباد خرابے کی وہ مکین تھی۔

سلویا اینڈرسن اپنے ہی خیالوں میں غرق تیز تیز قدموں سے دوڑی جارہی تھی حالاں کہ۔۔۔

وہ مانوس تھی ان راستوں سے،ان ہولناک سناٹوں سے۔

لیکن اس وقت۔۔۔

وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔

کیونکہ۔۔۔

آج پھر اُس نے اُسے کالج کی نکڑ پہ کھڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے تمسخرانہ انداز میں گھورے جارہا تھا۔ یوں ہی وہ اس کے پاس سے گزری ہمیشہ کی طرح ''بیڈ وومن'' اس نے فقرہ اچھالا۔

آج اسٹاف روم میں بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا مذاق ہو رہا تھا۔

متناسب قد و قامت، چمپئی رنگت اور نہایت خوبصورتی سے ترشے ہوئے سنہرے بالوں کی وجہ سے مثبت یا منفی انداز میں وہ اپنے کالج اسٹاف اور اسٹوڈنٹس میں کافی مقبول تھی۔ مرد اسٹاف ہمیشہ اس کی قربت کا طلبگار رہتا اور خواتین اس سے رقابت کی حد تک یارانہ جتانے کی کوشش میں رہتیں۔ وہ ان دونوں رویّوں سے نالاں تھی۔

اسے لگتا تھا اُن ساری باتوں کا سرا کہیں نہ کہیں اس کے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ یہ احساس اس کے وجود میں ایک زہریلے بچھو کی طرح دُم اکڑائے بیٹھا تھا کہ ذراسی ہلچل سے ڈنک مار دے۔

''بری عورت۔۔۔بیڈ وومن''

یہ نعرہ اس کی ذات سے ٹائٹل کی طرح جڑ گیا تھا جس سے پیچھا چھڑانے کے چکر ہی میں وہ پیٹر کے خاندان کا حصہ بن گئی تھی۔

آج۔۔۔

اُس پر ضرورت سے زیادہ ہی خوف طاری تھا۔ وہ دوڑی جارہی تھی۔ راستوں کے سناٹے، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ اور خود اس کے اپنے وجود میں اٹھے غلغلے سے اس کے کان بہرے ہو گئے تھے۔

''شِٹ۔۔۔نوسٹلجیا۔۔۔!!''

اُس نے خود پر لعنت بھیجی اور سانسیں سدھارنے کے لیے ایک گھنے پیڑ کے سایے میں ٹھہر گئی۔

''کون ہے میرے آس پاس؟ کوئی بھی تو نہیں۔ پھر۔۔۔میں کس سے خوف زدہ ہوں؟ کون ہے وہ جو مجھے ہر جگہ نظر آجاتا ہے۔۔۔؟! جسے دیکھ کر مجھ پہ خوف طاری ہو جاتا ہے۔ میں اسے جانتی تک نہیں، پھر بھی وہ میرے آس پاس اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔۔۔کوئی نہیں ہے،کوئی بھی تو نہیں۔۔۔فولش کریچر۔۔۔!''اسے خود پر ہی غصہ آیا۔

مگر۔۔۔

جوں ہی چلچلاتی دھوپ کی رَو اس کے کان کے پاس سے گزری وہ دوبارہ دوڑنے لگی۔

حالانکہ۔۔۔

وہ بڑی نڈر اور بے باک عورت تھی۔خوف سے اس کا واسطہ پڑا ہی نہ تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو تنہائی بھی اس کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔اس کی ماں کی کوکھ سے ہر نوزائیدہ کی طرح عالمِ وجود میں آتے ہی اس کی پہلی چیخ کا مسکراہٹوں اور دعاؤں سے استقبال نہیں ہوا تھا کیونکہ ماں نے سلویا کے اندر اپنی روح کا سرمایہ چھوڑ کر سانسوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا۔ دواخانے کے عملے نے اسے چرچ سے ملحق ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا تھا۔ آرفنیج والوں نے ہی اسے سلویا نام دیا تھا۔

اُس نے اپنا بچپن یسوع مسیح کی صلیب کے نیچے گزارا تھا۔ان ہی کی

تعلیمات کی ضوٗ میں کتابِ زندگی کے اوراق پلٹے تھے۔ ہاسٹل میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے کب وہ بچپن کی پگڈنڈیوں سے گزر گئی اس کا اسے اندازہ تک نہ ہوا۔ جوانی میں قدم رکھتے رکھتے سلویا کا رنگ روپ ایسا نکھرا کہ آرفنیج کی دوسری لڑکیاں اس کی رقیب بن گئیں اور ہمیشہ طرح طرح سے اسے نیچا دکھانے کے بہانے تراشنے لگیں۔

تب ہی۔۔۔

سلویا میں اپنی ہم عمر لڑکیوں پر فوقیت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرا۔ ویسے بھی سلویا کو اپنی خوبصورتی کا احساس کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی خوبصورتی کو ہی زندگی کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا اور ماڈلنگ کرنے لگی۔

فیشن کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اسے زندگی بڑی خوبصورت لگنے لگی۔ اس کے پر نکل آئے اور۔۔۔ پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی اور بہت جلد چرچ کی راہباؤں کا بتایا ہوا راستہ اس کے پاؤں سے چھوٹ گیا اور۔۔۔

کچھ ہی دنوں میں،

وہ۔۔۔

متاعِ کوچہ و بازار بن گئی۔

ابتداء میں اسے لگا وہ کھلے آسمان تلے آزاد ہے اور حدِ نظر تک پرواز کر سکتی ہے۔ شاید۔۔۔

وہ بھول گئی کہ حدِّ پرواز آسمان کی وسعتوں سے نہیں قوتِ پرواز سے مقرر کی جاتی ہے۔ اور صارفیت کے اس دور میں قوتِ پرواز بھی کوموڈٹی ہے۔

ان ساری کمزوریوں کے باوجود وہ ایک باضمیر لڑکی تھی۔ چرچ کی پرورش نے اس کے ضمیر کو مردہ ہونے سے محفوظ رکھا تھا۔ ڈیٹ کے نام پر اور کیریئر پروموشن کے نام پر کتنے مردوں سے اس کے مراسم بڑھے اور کتنی بار اسے اپنی نسائیت کا سودا کرنا پڑا اس کا حساب کرتے کرتے اسے خود سے گھِن آنے لگی۔ اس کا ضمیر ہی اس کا محتسب بن گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بازارِ حسن میں اس کی حیثیت محض ایک جنسِ خریداری جیسی ہے۔

اور بہت جلد۔۔۔

وہ اُس زندگی سے اوب گئی۔

اسی بازارِ حسن کے خریداروں میں اسے پیٹر ملا تھا۔ پیٹر اینڈرسن۔ پیٹر نے اسے جی جان سے چاہا۔ وہ بُرا آدمی نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہ سلویا سے ٹکرا گیا۔

وہ اکثر سوچا کرتی کہ خدا کو اسے اچھی زندگی دینا مقصود تھا۔ اس لیے اُسے پیٹر جیسا ساتھی ملا۔

''تھینک یو گاڈ۔۔۔!''

اُس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور آنکھیں موندھ لیں۔

اُسے فادر ولیم کا وعظ یاد آیا۔

''روشنی کی تلاش میں انسان بے وجہ ہی اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ اگر وہ کچھ لمحوں کے لیے باہر دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لے اور آنکھیں موندھ لے تو اس اندھیرے میں اسے اپنے وجود کے اندر بے شمار چراغ جلتے محسوس ہوں گے۔''

اُس نے سکون کی سانس لی۔ کچھ لمحے خاموش کھڑی رہی۔

دوبارہ۔۔۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اسے سب کچھ روشن روشن دکھائی دے رہا تھا۔ تب۔۔۔

اُسے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ ہی بھاگ رہی تھی۔

''آخر کون تھا وہ جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔۔۔؟''

پر۔۔۔ وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔

''او پیٹر۔۔۔! تم کہاں کھو گئے۔۔۔!!'

کالج سے گھر لوٹتے وقت اکثر وہ کالج کے گیٹ پر اس کا منتظر رہتا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے آتا تھا۔

اسے یاد ہے وہ دن۔۔۔

جب پیٹر پہلی بار اسے اپنے گھر لے آیا اور اپنی دادی سے ملوایا تھا۔ دودھ کی طرح گوری، جھیل سی نیلی آنکھوں والی مسز اینڈرسن نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔

''ہاؤ بیوٹی فُل۔۔۔!''

سفید بے داغ رنگت، شفاف نیلی آنکھیں، خوبصورتی سے ترشے ہوئے سنہری بال اور گھٹنوں سے نیچے تک لہراتا لمبا اسکرٹ پہنے مسز اینڈرسن خود بھی بہت خوبصورت تھیں۔

''سو کیوٹ! کون ہے یہ لڑکی۔۔۔؟''

''میری گرل فرینڈ''

''پیٹر۔۔۔! نو مور گرل فرینڈ۔۔۔ اب اور کوئی گرل فرینڈ نہیں۔ مائنڈ اِٹ''

مسز اینڈرسن نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تو پیٹر نے تو اِدھر اُدھر دیکھ کر نظریں چرا لیں مگر سلویا کو یقین ہو گیا کہ وہ پیٹر کی پہلی گرل فرینڈ نہیں ہے۔

''کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟''

''سلویا''

''سو کیوٹ۔۔۔!''

''کہاں رہتی ہو۔۔۔؟''

''نینا! اب یہ یہیں رہے گی۔ اب کوئی اور سوال نہیں۔'' پیٹر نے

مدافعت کی۔

''پر۔۔۔پیٹر۔۔۔''

''نومور کوئچن نینا۔۔۔!''

پیٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا تو مسز اینڈرسن چپ ہوگئیں۔

بس۔۔۔

اسی دن سے وہ اُس گھر کا حصہ بن گئی۔ساتھ ہی سلویا کو نئی زندگی ملی۔اس کی برسوں کی آرزو پلک جھپکنے میں پوری ہوگئی۔وہ کسی گھر پریوار کا حصہ بن گئی۔اب وہ بھی گھر والی تھی۔

سلویا بڑی خوش تھی کہ پیٹر نے اسے گھر دیا،خاندان کا سکھ دیا اور گھر میں حکم چلانے والی دادی بھی دی۔

مسز اینڈرسن نہایت ہی منظم قسم کی خاتون تھیں۔ان کے اپنے اصول تھے اور وہ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی تھیں۔سلویا خود بھی ہاسٹل کی پروردہ تھی۔اصولوں کی عادت اسے بھی تھی۔دونوں کی خوب جمنے لگی۔

''سِل۔۔۔!ہم اینگلو انڈین ہیں۔ہمارا ڈیڈ کراؤن کے حکم پر انڈیا آیا تھا۔پہلے فوج میں کرنل تھا پھر انڈین ایلویز جوائن کیا۔ہمارا مام انڈین تھا۔ہم یہیں پیدا ہوا۔ہمارا ڈیڈ بہت گاڈ فیرنگ پرسن تھا۔وہ اکثر کہا کرتا تھا۔۔۔''ہم انڈیا میں بزنس کرنے کے لیے آیا تھا حکومت کرنے نہیں۔کسی کا گھر میں گُھس کر اسی کو باہر ڈھکیل دیں یہ غلط ہے۔''

نائنتھ آگسٹ نائنٹین فورٹی ٹو (9.8.1942) کو ،کُوِٹ انڈیا موومنٹ (Quit India Movement) کے تحت جب انگلش، بری ٹین (Britain) لوٹنے لگے تو ڈیڈ نے مام کو بہت سمجھایا۔مگر مام انڈیا چھوڑنے کو تیار نہ ہوا۔ڈیڈ اپنے وطن لوٹ گیا اور ہم اپنی مام کے ساتھ یہیں رہ گیا۔ہمارا میرج یہیں مسٹر اینڈرسن سے ہوا۔وہ بھی اینگلو انڈین تھا۔شادی کے دو سال بعد ہم کو پیٹر کا ڈیڈ پیدا ہوا۔وہ ہم کو اور بے بی کو بہت لَو (Love) کرتا تھا مگر ایک نامعلوم بیماری نے اسے ہم سے بہت جلد چھین لیا۔ہم نے اکیلا ہی پیٹر کے ڈیڈ کا پرورش کیا اور اپنی پسند کا لڑکی سے اس کا میرج کیا۔پیٹر کا مام اینڈ ڈیڈ بہت گاڈ فیئرنگ تھا۔وہ دونوں جاب بھی کرتا تھا اور چرچ میں سروس بھی کرتا تھا۔

ایک دن۔۔۔

چرچ ہی کے کام سے وہ گوا گیا۔مگر۔۔۔لوٹ کر نہیں آیا۔بعد میں پتہ چلا کہ ان کا کار کھائی سے نیچے گر گیا۔اب پیٹر ہمارا زندگی بن گیا۔اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کبھی کا مر گیا ہوتا۔۔۔اس کے اندر ہمارا جان بسا ہے۔

سِل!پیٹر بُرا لڑکا نہیں ہے۔دل کا بہت اچھا ہے پر طبیعت کا کھلنڈر ہے۔اس نے زندگی کو کبھی سیریس لیا ہی نہیں۔

پر۔۔۔

یہ بھی گاڈ کا بُون (Boon) ہے۔اس نے کبھی ہم کو تنگ نہیں کیا۔جو کھلایا،کھایا۔جیسے پالا۔۔۔جیا۔جب تک چھوٹا تھا ہمارا اوبیڈیئنٹ رہا۔مگر۔۔۔جوان ہوتے ہوتے۔۔۔

اتنا کہتے کہتے مسز اینڈرسن کی آواز رندھ گئی۔

''سِل۔۔۔!پیٹر بُرا لڑکا نہیں ہے۔یہ ہمارا کمیونٹی کا ڈِفِکٹ ہے۔''سیلف اِنڈپنڈنس''۔۔۔آدمی کو پتہ ہونا چاہیے کہ انڈپنڈنس کا باؤنڈریز اور لمیٹیشنز ہوتا ہے۔اب تم آ گیا ہے تو۔۔۔''

مسز اینڈرسن نے گہری سانس لی اور بازو رکھے گلاس سے ایک گھونٹ پانی پیتے ہوئے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

''ڈاٹی۔۔۔!تم اسے چھوڑ کر جائے گا تو نہیں نا۔۔۔؟ایسا مت کرنا فار گاڈ سیک۔۔۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر کہنے لگیں۔

''تم دیکھنا۔۔۔ایک دن ہم اس سے کنفیس کروائے گا۔جیز زاسے ضرور معاف کردے گا۔وہ بُرا لڑکا نہیں ہے۔تمہیں سرپرائز ہوگا کہ بچپن میں وہ فادر بننے کی ضد کرتا تھا۔مگر ہم نے اسے روکا۔اگر وہ کلرجی سروس میں چلا جاتا تو ہم جیتے جی مرجاتا نا۔۔۔''وہ ہمک ہمک کر رونے لگیں۔

''نینا۔۔۔!پلیز رو نہیں۔میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''پرامس۔۔۔؟''

مسز اینڈرسن نے چھوٹی بچی کی طرح خوشی سے سلویا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دادی کی شفقت اور پیٹر کی محبت میں سلویا نے اپنا ماضی فراموش کر دیا۔وہ بڑی خوش تھی کہ خاندان میں جینے کی اس کی برسوں کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ایک سگھڑ ہاؤز وائف کی طرح وہ گھر گرہستی سے جڑ گئی مگر۔۔۔

جب جب پیٹر اس کے قریب آتا اور اس کے بے پناہ حسن اور اخلاق کی تعریف کرتا تو اس کا ماضی اس پر ہنسنے لگتا۔

''پیٹر۔۔۔!میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔میں تو بہت سارے گناہ۔۔۔''

''افوہ۔۔۔!!''

پیٹر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔

''سِل۔۔۔!تم نے مجھے کسی چرچ کا فادر سمجھ رکھا ہے کیا۔۔۔؟یار۔۔۔!اتنے اچھے موڈ کا ستیاناس کردیا''

''پیٹر!میری روح پر بڑا بوجھ ہے۔میں شیئر کرنا چاہتی ہوں۔پلیز پھر تم۔۔۔چاہے مجھ سے نفرت ہی کرنے لگو۔''

''سِل۔۔۔!پلیز۔۔۔فار گاڈ سیک۔میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔مجھے تمہارے پاسٹ سے کوئی مطلب نہیں۔میں صرف پریزنٹ میں جینا چاہتا ہوں۔تمہارے ساتھ۔

''آئی لو یو سو مچ سِل۔۔۔''

پیٹر اسے اپنے اوپر کھینچ لیتا تو وہ سب کچھ بھول جاتی۔

کہتے ہیں عادتیں بگڑتی بہت تیزی سے ہیں مگر سدھرتے عمر گزر جاتی ہے۔ پیٹر کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ بہت جلد وہ اپنی پرانی روش پہ لوٹ گیا۔ شراب، نائٹ کلبس، راتوں کو یا تو دیر سے آنا۔۔۔ یا پھر غائب رہنا اس کا شعار بن گیا۔ اس درمیان سلویا ایک مکمل عورت بن گئی۔ ماں بننے کی خوشی میں وہ جائز، ناجائز کا فرق ہی بھول گئی۔

حالانکہ۔۔۔

مسز اینڈرسن اسے آگاہ کرتی رہیں۔

''پیٹر۔۔۔! یہ بچہ اِل لیجٹ میٹ (ناجائز) ہے۔ تم چرچ میں اپنا میرج نوٹیفائی کروانا ورنہ ایک دن یہی بچہ تم سے سوال کرے گا۔ ابھی بھی کچھ بگڑا نہیں۔ تم جیزز کے آگے گڑگڑا کے معافی مانگنا۔ وہ تمہیں ضرور معاف کر دے گا۔''

مسز اینڈرسن کی نصیحتوں کا پیٹر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اب ان راستوں کا راہرو بن گیا تھا جہاں سے لوٹنا ناممکن تھا۔

بوب (Bob) کے پیدا ہوتے ہی سلویا کو اندازہ ہوا کہ صرف دادی کی پنشن پہ گزارا ناممکن ہے۔ اس نے ایک جونیئر کالج میں نوکری کر لی۔ مگر زندگی۔۔۔

کہاں چپ رہتی ہے! اس کی سیمابیت ہی اس کی موجودگی کی مظہر ہے۔ زندگی اب معمول پر آ رہی تھی کہ اس کی مونس و غمخوار، اس کی سرپرست، دوست، استاد، دادی جس نے اسے جینا سکھایا تھا اچانک اس دنیا سے چل بسیں۔

اب زندگی۔۔۔

سلویا کے لیے ایک چیلنج بن گئی۔

مگر اس بار اس کے قدم ڈگمگائے نہیں بلکہ زندگی کی ناہمواریوں سے جوجھتے جوجھتے وہ ایک طاقتور اکائی بن گئی۔

اب اسے پیٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے بوب کی پرورش میں اپنے جینے کا جواز ڈھونڈ لیا پھر بھی۔۔۔

جانے کہاں سے وہ پہلے والا خوف، ماضی کی بدصورت زندگی کبھی کبھی اچانک کہیں سے اس کے روبرو کھڑی ہو جاتی اور وہ خوف زدہ ہو جاتی۔

حد تو یہ کہ۔۔۔

اسٹاف روم میں کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا یا اس کی طرف دیکھ کر کسی سے سرگوشی کرتا تو اسے لگتا کہ وہ اس کے ماضی سے واقف ہے۔

''سلویا۔۔۔!''

''کک۔۔۔کون۔۔۔؟''

اپنے ہی گھر کی گیٹ کا قفل کھولتے ہوئے وہ اچھل پڑی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کالج سے گھر پہنچتے تک وہ زندگی کے تیس سال جی گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ زندگی ٹون بدل بدل کر اسے آواز دیتی اور وہ خوف زدہ ہو جاتی۔ ایسے میں اپنی سانسیں سدھانے میں دقّت ہوتی آخر چند قدم میں تیس سال کی مسافت طے کرنا کوئی آسان بات تو نہ تھی۔۔۔!

شام کے سائے آہستہ آہستہ پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی اور صحن میں یوکلپٹس کے پیٹر کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسے بڑے عزیز تھے یہ اندھیرے۔ سہ پہر کے ساتھ ہی اسے ان اندھیروں کا انتظار ہوتا۔ کھلے آسمان تلے اپنی ہی طرح بے گھر پرندوں کو ٹھکانوں کی تلاش میں تیز تیز پر مارتے دیکھتی تو اسے ان میں اپنی زندگی سے بڑی مماثلت لگتی۔ روشنی کا اہتمام کیے بغیر وہ گھنٹوں یوں ہی بیٹھی رہتی۔

''بڑی عجیب چیز ہیں یہ اندھیرے۔۔۔!!''

بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

جانے کتنی دیر سے وہ آرام کرسی میں نیم دراز آنکھیں موندھے زندگی کی اوبڑ کھابڑ زمین پہ دوڑ رہی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کا شیشہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا ہاتھ یوکلپٹس کے نرم تنے سے ٹکرا گیا۔

اور۔۔۔

انگلیاں جل اُٹھیں۔

کسی جوان اور تنومند مرد کی طرح سر اٹھائے اپنی ہی قد آوری پر نازاں یوکلپٹس کا یہ پیڑ اس کے دل کی زمین پر ابھر آیا۔ ٹیلہ جیسا تھا جہاں یادیں ایک ایک کر کے جمع ہو گئی تھیں۔ مگر اُن میں اب نہ ہی ترسیل کی کیفیت تھی اور نہ ہی۔۔۔ ترمیم کی۔

بس جم گئی تھیں۔

منجمد۔۔۔

کتنی شامیں اُس نے اس پیڑ کے پہلو میں گزاریں اس کا حساب کرنا بھی اس کے لیے کسی آزار سے کم نہ تھا۔

دادی اور پیٹر اینڈرسن کے جانے کے بعد یہی اس کا ہمراز تھا۔ اس کا مہربان دوست۔ اونچی اونچی دیواروں اور بلند پھاٹک کے اس صحن میں حدیقہ کے ساتھ سر اٹھائے بہت سے درخت تھے مگر ورانڈے سے لگا یہ درخت اس کا ہمراز تھا۔ تنہائی میں وہ اس سے اپنے دل کی باتیں کرتی۔ درد بانٹتی۔ دل کے راز افشاں کرتی۔ باتیں کرتے کرتے تھک جاتی تو اُس پر سر ٹکا کر سو جاتی۔ ہوا کے جھونکوں سے اٹھتی اس کی مہک اس کے اندر گرمی اور تراوٹ کا احساس دلاتی۔

آج وہ کچھ زیادہ ہی بے چین تھی۔

اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ اور بکھر رہا تھا۔ شام کی خنک ہوائیں بار بار اس کی ترستی ہوئی البیلی لٹوں کو اس کے چہرے پر بکھیر رہی تھیں۔ حالانکہ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سر کے اوپر جوڑا سا بنا لیا تھا مگر بال چھوٹے ہونے کی وجہ سے

گرہ کھل جاتی اور بالوں کے سرے نکیلی برچھیوں کی انیوں کی طرح اس کے چہرے پر چبھنے لگتیں۔ بالوں میں اُڑسنے کے لیے اُسے ہیئر کلچ کا خیال آیا مگر۔۔۔جیسے ہی اُس نے۔۔۔

پرس کے اندر ہاتھ ڈالا، باب کے اسکول سے آیا پرانا لیٹر اس کی انگلیوں میں پھنس کر باہر آ گیا۔

وہ خط کو اتنے ہی انہاک سے پڑھنے لگی جتنا کہ وہ اسے متعدد بار پڑھ چکی تھی۔

''مسز سلویا اینڈرسن! کیا آپ مجھ سے مل سکتی ہیں؟''

فادر جیمس نکولس

اتنی ذراسی عبارت نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ وسوسوں کے جنگل میں پھنس گئی تھی۔

فادر جیمس نکولس سے اس کی ملاقات کا ایک ایک لمحہ جو اس کی آنکھوں میں مقید تھا ماضی کے خوف میں مدغم ہو کر سیلِ رواں کی طرح اس کی آنکھوں کے آگے رواں ہو گیا۔ ہر بار کی طرح اِس بار بھی، باب کی چھٹیوں کے ساتھ وہ بھی کالج سے چھٹی لے چکی تھی تا کہ اپنے بیٹے کے ساتھ جی بھر کے جی سکے۔ اُس وقت ماضی کا وہ خوف پتہ نہیں کہاں چھپ جاتا تھا۔۔۔! وہ نڈر ہو جاتی تھی۔

مگر۔۔۔باب اب بڑا ہونے لگا تھا۔ زندگی کو سمجھنے کی کوشش میں وہ دن بھر بے تکے سوال کئے جاتا اور وہ ان کے جوابات دیتے نہ تھکتی تھی۔ ہر دن وہ اُسے پلے گراؤنڈ لے جاتی۔ جب تک باب تھک کر لوٹ نہیں جاتا وہ کسی بنچ پر بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہتی۔ مگر اُس دن۔۔۔

جب باب پلے گراؤنڈ سے لوٹا،

''مما! یہ بیسٹرڈ کیا ہوتا ہے؟''

باب نے سوال کیا تو اسے لگا سامنے کھڑا ماضی اپنے لمبے لمبے خونخوار دانت نکالے اس پر ہنسنے لگا ہے۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

''مما۔۔۔مما کیا ہوا۔۔۔؟ تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔؟''

''کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ چلو۔۔۔صبح اسکول واپس لوٹنا ہے۔ تھوڑا سا ہوم ورک بھی باقی رہ گیا ہے۔''

وہ گھر لوٹ آئی اور صبح کی تیاری میں جٹ گئی۔ اب اس میں باب کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہر بار وہی باب کو بورڈنگ اسکول سے لے آتی اور چھٹیاں ختم ہونے پر چھوڑ بھی آتی تھی۔

مگر اس بار اس پر ایک عجیب سا خوف طاری تھا۔ اُسے فادر نکولس سے ملنا تھا۔ جب وہ باب کو رکٹر (Rector) کے حوالے کر کے لوٹ رہی تھی کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

''یس فادر۔۔۔''

اسکول سے ملحق چرچ کی گیٹ پر فادر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''ہم نے ہی تمہیں خط لکھا تھا۔ کچھ دیر کے لیے رُک سکتی ہو۔۔۔؟''

''شور فادر۔۔۔ویسے میں آپ ہی کی طرف آ رہی تھی۔''

''تھینکس''

''مائی پلیور فادر''

''تم اندر چرچ میں ہمارا ویٹ کرو۔ ہم ابھی آتا ہے۔''

''یس فادر''

خوف و ہراس نے اس کے اندر کی طاقت سلب کر لی تھی۔ پھر بھی کسی طرح وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی چرچ ہال کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اندر کوئی نہیں تھا۔ یسوع مسیح صلیب پر سر نیوڑھائے کھڑے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے یسوع مسیح کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں یسوع کے مقدس زخموں پر جم گئیں۔

''اوروں کے درد کو اپنی رگِ جاں میں سمیٹ کر تختۂ دار پر چڑھنے کے لیے آپ جیسا کلیجہ چاہیے۔ یہ میرا درد۔۔۔ پاہام۔۔۔!! درد کی شدت سے اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

''تمہارا درد میرا بھی درد ہے۔ میں تمہارے درد کا مداوا بھی ہوں۔ تم مجھ سے کہہ کر تو دیکھو۔'' کوئی اس کے اندر سے آواز دے رہا تھا۔

''کیسے کہوں۔۔۔! یہ وہ درد ہے جسے میں خود سے بھی کہتے ڈرتی ہوں۔ او۔ جیز ز۔۔۔ہیلپ می۔''

اطراف وجوانب کا خیال کیے بغیر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

''پیشنس مائی ڈیئر۔۔۔بی پیشنٹ۔''

اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فادر نکولس اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دے رہے تھے۔

''صبر۔۔۔صبر کرو۔ صبر کرنے والا گاڈ کو بہت پیارا ہوتا ہے۔''

''آئی یم سوری فادر''

''کوئی بات نہیں۔ آنسو انسان کے بہترین دوست ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے راز دار بھی ہوتے ہیں اور مہربان بھی۔ دکھ میں، درد میں سب سے پہلے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے آنکھوں میں نمی بن کر اُترنے والے آنسو ہی تو ہوتے ہیں۔''

''او۔۔۔فادر۔۔۔!!''

اس نے بے بسی سے فادر کی طرف دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''باب ابھی ناسمجھ ہے۔ اسے آپ سے ایسے سوال نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ پر۔۔۔اسے دنیا کو سمجھنا ہے۔ یہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ وہ

جاننا چاہتا ہے کہ۔۔۔''
''نو۔۔۔نو۔۔۔نو فادر۔۔۔نو'' وہ چیخ اٹھی۔
اُس نے فادر کا جملہ پورا ہونے نہ دیا۔ اسے لگا کہ ضرور باب نے ویسا ہی سوال فادر سے کیا ہوگا جیسے اس نے پلے گراؤنڈ پر اس سے کیا تھا۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔
''ڈاٹی۔۔۔! صبر کرنا سیکھو۔ ایک بار جو انسان اپنے خود ساختہ دائروں سے باہر نکل گیا۔۔۔تو سمجھ کہ وہ اپنی ہی نظروں سے گر گیا۔''
''میں۔۔۔میں نے۔۔۔''
''نہیں ڈاٹی۔۔۔''
فادر نکولس نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کی۔
''مجھ سے نہیں۔۔۔جیز ز سے۔۔۔''
''میں کیا کروں فادر۔۔۔!''
''کنفیشن''
''کنفیشن۔۔۔؟'' وہ اپنی حیرت دبا نہ سکی۔
''ہاں''
''فادر! کیا کنفیشن کر لینے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟ ہمارے بیڈ ڈیڈس (Bad Deeds) پورے اَن ڈن (Undone) ہو جاتے ہیں؟''
''نہیں''
''تو پھر۔۔۔؟''
''انسان جب اپنے گناہوں کا بآواز بلند اعتراف کرتا ہے تو دراصل خود کو شرمسار کرتا ہے۔ اس لیے جب وہ کنفیشن کر رہا ہوتا ہے، اندر ہی اندر پشیمان بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا ضمیر اس سے ایک معاہدہ کرتا ہے کہ اب تک جو ہوا سو ہوا آئندہ دہرایا نہ جائے گا۔ اسے ''رپنٹنس'' کہتے ہیں۔
رپنٹنس ہی درحقیقت گناہوں کی تلافی کا ذریعہ ہے۔
''ڈاٹر۔۔۔! تم ایک اچھی لیڈی ہو۔ سچے دل سے کنفس کرو۔ تمہارے کونشئیس ہی تمہاری نجات کا ذریعہ ہوگا۔ گاڈ تمہیں ضرور معاف کر دے گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ گاڈ بلیس یُو۔''
یکا یک چڑیوں کی چہچاہٹ کا ایک شور بلند ہوا اور اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چڑیوں کا آخری قافلہ بڑی تندہی سے پنکھ پھڑ پھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔
اُس نے لیٹر کو احتیاط سے دوبارہ محفوظ کر لیا۔ اپنے اطراف نظر دوڑا کر دیکھا اندھیرا آنگن میں اتر آیا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔
آخر رین بسیرا اس کا بھی مسئلہ تھا۔
آج۔۔۔

سلویا نے بہت دن بعد بالوں کو گولڈن براؤن ڈائی کیا۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنے اور ایک عزم مصمم کے ساتھ چرچ پہنچ گئی۔
سنڈے سروس تھی۔ چرچ ہال لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ بھی ایک مناسب جگہ دیکھ کر بیٹھ گئی۔ جوں ہی سروس ختم ہوئی لوگ ٹکڑیوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے سکھ دُکھ بانٹنے میں مصروف ہو گئے تب۔۔۔
سلویا چپکے سے اُس طرف بڑھ گئی جہاں چرچ کے ایک کونے میں سفید چادر تان کر ایک باکس بنا دیا گیا تھا۔ یہ کنفیشن باکس تھا۔ وہ بے حد نروس تھی۔ اُس وقت اُسے محسوس ہوا کہ اعترافِ گناہ، احساسِ گناہ سے کہیں زیادہ اذیّت ناک ہے۔ بلکہ بذاتِ خود سزا ہے۔
کنفیشن باکس تک پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہو گئی۔
باکس کے قریب پہنچ کر اُس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ کچھ خود سے اور کچھ اوروں سے شرماتے ہوئے، چوروں کی طرح دبے پاؤں بڑھ کر اس نے کنفیشن باکس میں منہ ڈال دیا۔
''او جیز ز۔۔۔فر گیومی۔ میں نے بہت سے۔۔۔'' وہ سسک پڑی اور کچھ ہی لمحوں میں چکرا کر گر پڑی۔
دوبارہ۔۔۔
جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا وہ چرچ کے بنچ پر لیٹی ہوئی تھی اور فادر اس پر جھکے اس کے گال تھپتھپا کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔
''اوہ فادر۔۔۔!!''
وہ گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔
''آئی ایم سوری فادر''
''ریلکس۔۔۔کوئی بات نہیں''
انہوں نے سلویا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
فادر کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر جانی پہچانی مسکراہٹ دیکھ کر وہ سہم گئی اور پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے یک ٹک دیکھتی رہی۔
''پپ۔۔۔پپ۔۔۔پی۔۔۔پیٹر تم۔۔۔؟!!''
فادر کا چہرہ ایک دم پُر جلال ہو گیا۔ پیشانی کی رگوں میں تناؤ آ گیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ انہوں نے اپنا ہاتھ سلویا کی پیشانی سے کھینچ لیا۔
''فادر پیٹر اینڈرسن۔۔۔!!''
انہوں نے گرج دار آواز میں اعلان کیا اور بھاری قدموں سے چرچ ہال کی طرف بڑھ گئے۔ سلویا حیرت سے کھلے ہونٹ اور حسرت سے پھیلی آنکھوں سے بڑی دیر انہیں دیکھتی رہی۔ اُس نے دیکھا۔۔۔
ایک سایہ چرچ کے سنٹر میں نصب یسوع مسیح کے مجسمے کے پیچھے سے آتی مدہم سی روشنی میں کہیں گھل مل گیا۔

جنت کے بھکاری

نازیہ پروین
(فیصل آباد)

اس نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی جو آواز سنی تھی وہ کسی مرد کے منہ سے نکلنے والا گالیوں کا سیلاب تھا جس کی طغیانی کسی عورت کی ہنسی، وقار اور عزت کو بہا کر لے جاتی اور باقی صرف ندامت، بے بسی اور یاسیت رہ جاتی۔اور یہ روز کا معمول تھا۔ اس آواز سے اس کے دل نے اس چیخ و پکار سے سہنا سیکھا۔ ہر روز دن کے کسی پہر یا شام ڈھلے عدالت لگتی اور جرع میں گالی گلوچ سے مقدمے کو تڑکا لگایا جاتا پھر رات بھر کسی کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔احتیاط کے طور پر ایک دو پہر کا کھانا چھوڑ دیا جاتا۔مگر گھر میں کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ماہ و سال کی اس دوڑ میں کئی رونی صورتوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سارا دن چارپائی کے ساتھ بندھی جھولی میں یا چارپائی پر پڑے ریں ریں کرتے رہتے اور تھک ہار کر منہ میں انگوٹھا دبائے سو جاتے۔مکھیاں بھنبھناتی رہتیں جنہیں کبھی کبھار کسی نظر کے پڑ جانے پر اپنی راگنی ادھوری چھوڑنی پڑتی۔اور منہ کو کسی گندے اور پسینے کے بدبودار دوپٹے سے ڈھانپ دیا جاتا اور مکھیاں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتیں۔ وہ بھی ان رلتے کھلتے ہوئے بچوں میں سے ایک تھی۔اور ابتدائی بچپن سے ہی کم سونے کی عادی تھی۔ وہ تب سے ان چیختی اور غصے سے بھل بھل پڑتی آوازوں سے سہم جاتی اور ڈرتی کہ نجانے آج کون معتوب ٹھہرائی جائے گی۔ وہ عورتیں جن کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی وہ سارا دن گھر کے پہاڑ جیسے کاموں کو نبٹاتیں اور منہ میں بڑبڑ بھی کرتی جاتیں یا وہ سارے یاجوج ماجوج جو اس گھر میں پائے جاتے تھے ان کے لیے کھانا پکاتیں۔انھیں وقت کہاں ملتا کہ سارا سارا دن سر کھاتے بچوں کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا کر دیں۔ان عورتوں کے پاس گنتی کی یادیں تھیں جب یہ چیختے چنگھاڑتے مرد اپنے جسمانی ریمانڈ کے لیے کتے کے طرح دم ہلاتے اور اشارے کنایے کرتے نظر آتے تو ان بے زبان عورتوں کے جلتے بدن پر برسات کے چند چھینٹے پڑتے وہ اس خیرات پر بھی خوش ہو جاتیں جو چوروں کی طرح ان کے بستروں میں منہ چھپاتے اور اپنے بوجھ کو ان کے تعفن زدہ جسموں میں اتار کر خوب خراٹے لیتے گزرتی اور وہ بچاری جسے یہ خیرات ملی تھی نلکا بھی اتنی آہستہ آواز میں چلاتی کہ بمشکل موت کی دھار کی طرح پانی باہر آتا جو بمشکل اس کے تن کو گیلا کر پاتی اور اگر سردیاں ہوتیں تو کوہرے کی طرح جمنے کے قریب پانی بم کی طرح اس کے سر پر پڑتا۔۔۔ساتھ ہی اسے ظالم جلاّد (ساس) کے جاگنے کا دھڑکا لگا رہتا اور اگر کبھی ساس بہادر تک اس چوری کی خبر پہنچ جاتی تو صبح ہوتے ہی بہو نامی عورت کو ساس نامی عورت ہلکی کتی کا خطاب دینے کے ساتھ ساتھ دو چار گالیوں سے نوازتی اور شیر بیٹے کے اٹھ کر آنے پر چوری سے تواضع کی جاتی جیسے کوئی میدان فتح کر آیا ہو۔۔۔اس بیج کنی اور چوری چکاری سے چلائے گئے ہل اور پانی سے آبیاری ہو جاتی تو بھی نو ماہ اسے اس طعنے سے دوچار ہونا پڑتا کہ کتی کی طرح سارا سال ایدھا سوو آ نہی مک سکدا اگلے دا نک صاف نہی ہوندا۔یہ الفاظ گولیوں کی طرح اس کے سینے میں بوچھاڑ کر دیتے اور اس کا دل چھلنی چھلنی ہو کر عمر بھر رستا رہتا۔اور اپنے مرد سے بیزاری ایک درجہ نصف بہتر سے نصف آخر تک پہنچ جاتی۔شومیٔ قسمت اگر بہو کے میکے سے کوئی چچا زاد خالہ زاد چلا آتا تو عقاب کی نظر سے بہو کو دیکھا جاتا اس کی جاسوسی شروع کی جاتی اور اگر کبھی اکیلے میں وہ عورت جو سارا دن طعنے تشنے سننے کی وجہ سے آنکھوں کو بھگوئے رکھنے کی عادی تھی جبکہ اس کے لب اپنے بچپن کے ہجولی کے ہمراہ چند سیکنڈ کے لیے دل سے مسکراتے تو پھر وہ دنگل شروع ہوتا کہ مہمان کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اس بچاری کے وہ لتے لیے جاتے کہ آنے والا ہمدرد ہجولی ہمیشہ کے لیے اپنی عزیز کی مزید رسوائی کے ڈر سے آنا چھوڑ دیتا۔تو یہ وحشی بھینسے جیسا اشتہاری اور اس دیو کی ظالم ماں خوش ہوتے کہ دیکھا اس لکی کبوتری کے پر نکلنے سے پہلے ہی کاٹ دیئے ہیں۔

زندگی کے رواں دھارے میں بہتے بہتے کب عمر کے سولہ سال گزر گئے اسے پتہ ہی نہیں چلا۔وہ اپنی سی کوشش کرتی کہ ان عورتوں پر لدے بوجھ کو کچھ کم کر سکے۔ اس بوجھ کو کم کرنے کا حل اس نے یہ نکالا کہ ان کے ذمے کام میں ہاتھ بٹانے لگی کبھی کسی کے حصے کی جھاڑو لگا دیتی کبھی آٹا گوندھ دیتی کبھی روٹیاں پکانے بیٹھ جاتی۔گیارہ سال کی عمر میں وہ مہارت سے روٹیاں پکا لیتی تھی۔ہر طرف زینی کے نام کی پکار شروع ہو جاتی۔زینی یہ کر دو۔زینی وہ کر دو۔گیارہ یا بارہ سال تک تو اس نے اپنی کوشش سے راوی کو چین لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔مگر تیرھویں سال میں پہلے گھر والیوں نے نظر کا زاویہ بدلا۔اب چاچیوں اور تائیوں نے اس کے اٹھنے بیٹھنے پر اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ یہ ہنستی بہت ہے۔آہستہ چلنے کی بجائے بھاگ کر گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتی ہے۔دوپٹے کو صحیح سے نہیں اوڑھتی۔پھر ایسا ہی گھر کی ہر لڑکی کے ساتھ ہونے لگا۔ڈیرے پر جانے اور باغ کی طرف نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔سارا دن گھر کے کام کاج کروائے جاتے تھے۔پھر پتہ نہیں کیسے اس گھر قانون کے خلاف اور دادا جی کی حکم عدولی کی جرآت والد صاحب میں پیدا ہوئی کہ گھر کی بیٹیوں کو سکول جانے کی اجازت مل گئی۔لڑکے تو رو دھو کر پہلے ہی سکول جاتے تھے۔لڑکیاں بڑی تھیں دو سال میں ہی پانچویں جماعت میں پہنچ گئیں۔تایا زاد زرینہ جو سرخ و سفید شباب کی مالک تھی دھیمی سی مسکان ہر وقت اس کے لبوں پر رہتی تھی۔شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ وہ تنہائی میں گنگناتی رہتی اُس کی آواز بہت خوبصورت تھی۔وہ پہروں ٹکٹکی باندھے زرینے کو تکتی رہتی مگر اپنے حال میں مست رہتی۔ پھر اس کی مسکراہٹ کو کسی کی نظر کھا گئی۔اب گھر کی عدالت لگی تو سرگوشیوں میں مذکرات ہوئے اور صبح یہ دھماکہ ہوا کہ جمعہ کو کچھ لوگ زرینے کو بھی دیکھنے آ رہے ہیں۔زرینے کی رنگت دنوں میں

سرسوں کے پھول جیسی ہوگئی۔وہ ہونٹ جن پر مسکراہٹ اور سرمستی کے نغمے ہوتے وہاں سسکیاں رہنے لگیں اور آنکھیں پرنم۔جمعہ کو ایک ریوڑ گاڑی میں آیا اور زرمینے کو بھی پسندیدگی کی سند دے گیا۔دادا نے صرف دو ہفتے کی وارننگ دی جو کارگر ثابت ہوئی یوں زرمینے کو گھر بدر کر دیا گیا۔سولہ سال کی زرمینے کا پینتیس سالہ شخص مالک بنا دیا گیا۔میں خوش تھی کہ زرمینے کی اس بار گھر سے جان چھوٹ گئی۔مگر یہ پول بھی جلد کھل گیا کہ زرمینے کا کسی کو پسند کرنا جرم تھا جو اس کے لیے سزا بن گیا۔پھر گھر میں سے ہی کسی عورت نے اس کے شوہر کو بتا دیا۔جس کے ظلم کی ابتدا اس بات سے ہوئی کہ گاؤں آنے پر پابندی لگ گئی۔اور یوں زندگی کے پندرہ سال اس نے قید بامشقت میں کاٹے۔ان سالوں میں دبنگ تایا جی نے دو بہوؤں کا اضافہ کر لیا۔وہ گاؤں۔کھیت اور حویلی کی وجاہت میں ماری گئیں۔

گزرے سالوں نے ان سے نزاکت،ملکویت چھین کر کرختی دے دی گئی۔اسے آج بھی اپنی مسیحا استانی کی موت یاد ہے،جس نے نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔اور وہ حیران تھی کہ ابھی تو پوری چھٹیاں ختم بھی نہیں ہوئی۔وجہ کیا تھی کہ اپنے ساتھی کولیگ سے شادی کا جرم کیا۔جسے اس کے بہن بھائیوں نے قبول نہیں کیا۔ یہ وہی بہن بھائی تھے جن کی خاطر مس شازیہ نے نوکری کی۔انھیں پالا اور برسر روزگار کیا۔ان کی شادیاں کیں مگر کسی کے پاس فرصت نہیں تھی کہ کوئی مس شازیہ کے بارے میں بھی سوچتا کہ اسے بھی شادی کی ضرورت ہے اور زندگی کے چالیس سال گزر گئے۔جب خود شادی کی تو اسے گھر سے نکال دیا۔سسرال نے بھی قبول نہیں کیا۔شوہر پہلے سے شادی شدہ تھا۔مس شازیہ وہ بہادر خاتون تھی جس نے ضرورت پڑنے پر کھیتوں میں خود کام کیا۔پانی تک لگا دیتی تھی جس کی بے داغ جوانی کی مثال پورا گاؤں دیتا تھا۔کیسے خودکشی کر سکتی ہے۔شاید خونی رشتوں کی بے رخی ایسے جزباتی فیصلوں کو جنم دیتی ہے۔موت سکون دیتی ہے یا نہیں۔وہ یہ تو نہیں جانتی مگر کیوں لوگ اس کی بے رحم آغوش میں جانے کی چاہ کرتے ہیں۔اسے بچپن کی بیو یاد ہے جسے بے آبرو کرنے والا سگا چچا تھا اور حمل ظاہر ہونے پر زہر دے کر مارنے کی کوشش کی گئی جو سخت جان اور جوان تھی کئی دن خون کی الٹیاں کرتے کرتے موت سے نہیں بچ پائی اور رات کے اندھیرے میں منوں مٹی تلے بیچاری کو سولا دیا گیا۔اے موت تو کتنی بے رحم ہے۔جو موت کی آغوش میں چلی گئی وہ دنیا سے مکتی پاگئیں مگر جو گھروں میں بندیں ہیں نہ انھیں کھانے کو پورا ملتا نہ خرچے کے نام پر دھیلا۔وہ جو نازک کلیاں تھیں چند سالوں میں مسکرانا بھول گئیں۔ان کے پاس اس جبر کے خلاف زبان ہی ایسا ہتھیار نظر آیا جسے چلایا جا سکتا ہے۔وہ روز مرتیں۔خوب زبان کے جوہر دکھاتیں اور جابر حکمرانوں سے پٹتیں۔اسی دنگل میں اولادیں جوان ہوگئیں مگر گھر میں ہاہاکار نہ مٹ سکی۔زینی نے کتابوں میں پناہ لینی چاہی تو اس کے لیے بھی زندہ موت کا چناؤ کیا۔اس سے پوچھے بغیر شادی طے کر دی۔وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہ کر سکی۔پھر اس نے اپنے خواب کو اپنے بچوں میں منتقل کر دیا۔نوکری بھی کی۔ وہ سارا دن سخت محنت کرتی پھر گھر آ کر بھی یہ مشقت رات گئے جاری رہتی۔وہ کبھی سوچتی کہ بنانے والے نے اتنا سخت جان کیوں بنایا کہ وہ گدھے کا بوجھ ڈھونے پر جوت دی گئی۔نو ماہ تکلیف سہتے اور کرلاتے جسم سے ایک اور وجود کو اگل دیتی ہے اور وہی اسے ساری زندگی کتے ٹھکرے پانی پلاتا ہے۔اسے جاننا ہے کہ عورت کی تخلیق میں دل کو کس مادے سے تخلیق کیا گیا۔کئی ایسی بھی ہیں۔جن میں زرینہ۔تہمینہ اور رخشندہ کمانے کے بعد شوہروں کی جیب گرم کرنے کے ساتھ ساتھ چولہا بھی گرم رکھتیں پھر بھی آئے روز پٹتیں۔بنک کی خالدہ جس کا شوہر اس کی ساری تنخواہ اڑانے کے بعد قرضہ لے چکا ہوتا ہے جسے خالدہ نے اتارنا ہے۔ڈاکٹر فاخرہ جو لوگوں کے لیے مسیحا ہے جبر سے مسکراتی ہے مگر دل میں حساب یہ کہ نند کی فیس دینی ہے دیور اور ساس سسر کی دوائیوں کے ساتھ گھر اور بچوں کے اخراجات اور دوسرے خرچے پورے کرنے کے لیے وہ سولہ گھنٹے کام کرتی ہے سرکاری ہسپتال کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ کلینک میں ڈیوٹی دے کر جب گھر جاتی ہے تو خالی برتن اور بچوں اور شوہر کا خراب موڈ کہ گل چھرّوں سے فرصت مل گئی گھر یاد آ گیا۔ روز اس بے عزتی کے آنسو پیاز کی کڑواہٹ میں دھو لیتی ہے۔ایسی کئی عورتیں جو اس کی جاننے والی ہیں۔کیوں شوہروں کی شکل میں زندہ موت کو گلے لگائے عمر کاٹ دیتیں ہیں اور عمر کے آخری حصے میں اولاد کے ہاتھوں ذلت۔مرد کتنے فخر سے کہتا ہے کہ دوزخ کا زیادہ حصہ عورتوں کے لیے بنایا گیا۔مرد کی طرح بنانے والا مرکر بھی ظالم کہ دنیا میں بھی دوزخ۔موت کے بعد بھی دوزخ میں۔جب ہر جگہ دوزخ ہی اسکا مقدر ہے تو جنت کی چابی اس کے قدموں میں کیوں۔

زینی نے موت کا راز پا لیا ہے اور سب عورتوں کو بتانے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کے مردوں کی جنت میں نا کہ لگا دو اور چابی کو پاؤں سے نکال کر ٹانگوں کے درمیان میں چھپا دو۔جنت کے یہ بھکاری ٹانگوں کے درمیان اس چابی کو تلاش کرنے میں ساری زندگی ہلکان ہونگے۔ان بھول بھلیوں میں ڈوبتے ابھرتے ان کو جنت کی چابی نہیں ملنے والی۔عورت تو دوزخی ہے اسے موت سے کیا ڈرنا۔ڈریں تو یہ جنت کے بھکاری جو رات کو چابی کی تلاش میں وحشی درندے اسی دوزخی بدن کو نوچتے کھسوٹتے ہیں انہیں دوزخی چھاتیوں پر منہ مارتے منمناتے ہیں۔

عورت نے خود موت کے دامن میں پناہ کیوں لی۔اسے پتہ ہے کہ جنت کے متوالی بھوکے بھیڑیے اس کی تلاش میں ہیں اور یہ تلاش پاؤں سے شروع ہو رہی ہے۔مگر اب عورت بے خوف ہے کہ موت اس کی سہیلی جو ہے۔

فحش کتابیں

پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

بنجارن

نیّر اقبال علوی
(لاہور)

چائے کا کپ بنا کر ابھی میز پر دھرا ہی تھا کہ صدر دروازے پر لگی گھنٹی کی کرخت آواز نے یکا یک چونکا ڈالا۔ میں نے پہلے تو دروازہ کھولنے کا قصد ترک کر ڈالا، کیوں کہ چائے پینے اور کتابی مطالعہ کے درمیان کسی کا مخل ہونا مجھے عمر بھر اچھا نہ لگا۔

گھریلو ملازم کی آمد کے خیال سے بادلِ نخواستہ کرسی سے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی خاطر ڈرائنگ روم سے باہر نکلا۔ لان میں پہنچا ہی تھا کہ میرا پارہ چڑھ گیا کیونکہ گیٹ کے نیچے سے پھٹے خاک آلود، جانور نما چار عدد انسانی پنجے مجھے تاک رہے تھے۔

دروازہ کھول کر میری نگاہیں سخت غصے اور حقارت کے عالم میں باہر کھڑی عورت پر جا کر مرکوز ہوگئیں جس کے گندمی سڈول بازوؤں میں ایک نحیف سا نومولود بچہ، جبکہ گندے غلیظ کپڑوں میں دوسرا بچہ اس کے پہلو میں تصویرِ حسرت بنا کھڑا تھا۔ میری شعلہ بار آنکھوں کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی نگاہیں زمین پر گاڑ دیں۔ پھر۔۔۔ بابو صاحب خدا کے واسطے۔۔۔ لرزتی ہوئی نسوانی آواز۔۔۔ آہنی گیٹ کی چرچراہٹ اور میری انسانیت سوز ڈانٹ میں دب کر رہ گئی۔ دروازہ بند کر کے بھکارن کو برا بھلا کہتے، مغلظات بکتے، تیز تیز قدم اٹھاتے، ہانپتے کانپتے واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے کا گھونٹ بھرا تو۔۔۔ اطمینان کا احساس ہوا۔۔۔ دوسری چسکی بھرنے کے بعد منتشر حواس بحال ہوئے، بلڈ پریشر نارمل ہوا اور آنکھوں کے سامنے چھائی باؤلے پن کی سرخ دھند چھٹی تو چیتھڑوں میں ملبوس دو پایہ حیوانوں کے بے ترتیب وغیر متوازن، بے ڈھنگے پیکر آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ ہویدا ہونے لگے۔ جذبات سے مغلوب، میرے دونوں کان مجھے اس لاچار کی فریاد سنانے سے عاری رہے تھے، جس کا اب مجھے شدید رنج ہونے لگا۔ مجھے احساس ہوا جیسے میں نے اس دکھیاری کی زبان گدی سے کھینچ کر آوارہ کتوں کے سامنے پھینک دی ہو۔ مجھے اس مفلس ومفلوک الحال خاتون کے ساتھ لاشعوری طور روا رکھا جانے والا اپنا رویہ انتہائی گھٹیا اور پست محسوس ہوا۔ معاً میرے ضمیر نے مجھے کچوکا لگاتے ہوئے کہا!

ویسے تو اپنے قلم سے دوسروں کو آئینہ دکھانے کا قصد کرتے ہو۔ کبھی آئینے میں اپنی شکل بھی ملاحظہ کرو؟ ایک باہوش وصاحبِ دل انسان اپنے ہم جنسوں سے تو درکنار، کسی حیوان سے بھی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا، جیسا تم نے اس بے یارومددگار خاتون سے روا رکھا۔

اپنے ضمیر کے ہاتھوں میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، مجھے اپنے آپ سے کراہت ہونے لگی۔ زندگی میں پہلی بار ادھوری چائے چھوڑنے کا مجھے قطعاً ملال نہ ہوا۔ تیز ڈگ بھر کر عجلت میں گیٹ کھول کر باہر جھانکا۔ میری نگاہیں چیتھڑوں میں لپٹی عورت کی تلاش میں سرگرداں ہوگئیں۔ ذرا دیر بعد۔۔۔ چوتھے یا پانچویں گھر کے گیٹ سے برآمد ہوتے ہوئے وہ مجھے دکھائی پڑی۔ بلا سوچے سمجھے تیزی سے میں اس کے قریب پہنچا۔ مجھے دیکھ کر لمحے بھر کو وہ ٹھٹھکی۔۔۔ مگر اس کی گہری، بھوری آنکھوں میں بے نیازی، جب کہ میری آنکھوں میں لجاجت تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔۔۔ میرے چہرے مہرے پر نرمی کے آثار دیکھ کر اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا۔۔۔ میرا دایاں ہاتھ ہولے ہولے جیب کی طرف بڑھا، لیکن۔۔۔ نامراد لوٹ آیا۔ میرا بٹوہ گھر ہی میں رہ گیا تھا۔ لڑکی میری بدحواسی پر متعجب کھڑی مجھے بِٹر بِٹر تک رہی تھی۔ میں نے اسے ہمراہ چلنے کی ترغیب دی جسے اس نے بلا ردوکد قبول کر لیا۔ آٹھ نو ماہ کا بچہ تیز گرمی کے باوجود اس کے سینے سے چمٹا اطمینان سے سو رہا تھا، جبکہ پانچ چھے سالہ بچی خاموشی سے اس کے میلے دوپٹے کا پلو تھامے ساتھ میں چل رہی تھی۔ میرا دل مجھے بار بار اکسا رہا تھا کہ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہوں، اس میں عجب سی جاذبیت تھی، جوں جوں میں اسے تکتا توں توں وہ مجھے اپنی جانب کھینچتا۔

آہنی گیٹ کھولنے کے بعد میں نے اسے اندر آنے کو کہا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ، ذرا سراسیمگی کے ساتھ وہ لان میں اُگی نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ سوئے ہوئے بچے کو اس نے گھاس کی ہری چادر پر لاپرواہی سے لٹا دیا۔ وہ شائد۔۔۔ ایسا کرنے کی متمنی تھی کیونکہ میں اس کے مضطرب چہرے پر راحت کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ واپس آنے کا کہہ کر میں اندر چلا آیا۔ میز پر دھرے چرمی بٹوے سے پچاس کا نوٹ نکال کر جیب میں رکھا پھر۔۔۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم باورچی خانے میں رکھی فریج کی جانب اٹھ گئے۔ کوکا کولا کی بوتل نکال کر کانچ کے دو گلاس اس بھورے مشروب سے بھرے، گلاسوں کو ٹرے میں رکھے لان کی جانب یوں بڑھا جیسے اپنے بہت محبوب دوست کی میزبانی کرنا مقصود ہو۔

گھاس پر براجمان ویران وبڈھال خاتون سے نظریں ملیں تو بے اختیار میرے سنجیدہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آشکار ہوگئی، اس کا چہرہ بھی یک بہ یک تمتما اٹھا۔

پچاس کا نوٹ میں نے اس کی حنا آلود ہتھیلی پر دھرا اور گلاس ماں بیٹی کی جانب بڑھا دیے۔ دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے یقینی کی حالت میں مجھے گھور رہی تھیں۔ کوکا کولا کے ٹھنڈے گھونٹ بھرنے کے دوران میں نے بہ غور اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ مجھے احساس ہوا جیسے فطرت نے سیاہ چکنی مٹی سے اس کا خمیر گوندھ کر اپنے ہاتھوں سے چاک پر کسی ماہر کوزہ گر کے مانند بڑی مہارت و دلجمعی کے ساتھ سندر اور من موہنے خدوخال وضع کر کے اسے حسن کا مجسمہ بنا ڈالا۔ گندے تالاب میں کھلنے والے تر وتازہ کنول سے مشابہ اس کی آنکھوں میں ایسی وسعت وگہرائی کہ جاتے ہوئے جب اس نے مسکراتے ہونٹوں سے بابو صاحب! اللہ تیرا بھلا کرے۔۔۔ کہا تو میں نے خود کو کسی پاتال میں ڈوبتے ہوئے محسوس

کیا۔ یکا یک میرا جی چاہا کہ اس غلیظ گٹھڑی کو اپنی بانہوں میں بھرلوں۔

گیٹ بند کرنے سے قبل میں نے پوچھا۔

تم پہلے تو کبھی یہاں نہیں آئیں؟

وہ طلسماتی آنکھیں گھما کر بولی:

پچھلے ہفتے ہی سڑک کی دوسری جانب گندے نالے کے کنارے پڑاؤ ڈالا ہے۔

بلا سوچے سمجھے میں نے اسے اگلے روز پھر آنے کی دعوت دی۔ کچھ کہے سنے بغیر ریں ریں کرتے بچے کو گود میں اٹھائے، دوسری بچی کے ہمراہ وہ چلی گئی۔

اندر واپس آ کر اپنے لیے دوبارہ چائے بنائی۔ گرم گرم چسکیوں کے دوران مجھے اپنی غلطی کے پراشچت کرنے پر روحانی تسکین ہوئی۔ اس لڑکی کی دل شکنی کے بعد اس کی دل جوئی پر میں نے خود کو ہدیہ تبریک پیش کیا، اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا۔

اگلے روز گھنٹی بجی تو اس کی آواز حیران کن طور پر نہایت مسحور کن سی لگی۔ چائے کے دوران رخنہ اندازی پر زندگی میں پہلی بار مجھے غصہ نہ آیا بلکہ اس کے برعکس میں نہایت پھرتی سے دروازے کی جانب لپکا، گیٹ کھولنے سے قبل میرے چہرے پر خود بہ خود مسکراہٹ آن سجی۔ بڑی خندہ پیشانی سے میں نے وہاں کھڑی چیتھڑوں میں لپٹی عورت پہ نگاہ ڈالی۔ وہ بُت بنی مجھے گھور رہی تھی۔

کیا حال ہے۔۔۔ تمہارا؟ میں نے یوں دریافت کیا جیسے وہ میری کچھ لگتی ہو۔

ہم جیسوں کے حال احوال نہیں ہوا کرتے۔۔۔ بابو صاحب!

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی بولی: ہم ٹوٹے پھوٹے مقدّروں مارے، انسان تھوڑے ہی ہیں۔ وہ بے بسی کے ساتھ اپنی انگلیوں سے ابھری ہوئی چھاتیوں کے درمیان میں کالی ڈوری سے لٹکے چاندی کے چوکور تعویذ کو ٹٹول رہی تھی، جیسے اپنے رب سے شکوہ کر رہی ہو۔ جب کہ فرطِ مسرت سے مغلوب میں نے اس کی بانہوں میں سوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر پچاس روپے کا نوٹ اس کو تھماتے ہوئے کچھ پینے کے لیے دریافت کیا۔

اس کی ٹانگ سے چمٹی کم سن بچی نے مثبت انداز میں اپنے چھوٹے سے سر کو جنبش دی جبکہ نوخیز ماں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور۔۔۔ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے پیچھے سے اسے کل پھر آنے کو کہا۔

اب یہ روزانہ کا معمول بن گیا کہ وہ بھکارن مجھ سے پچاس روپے لے کر چلی جاتی۔ میں اس سانولے سلونے چہرے پر سجی دو موٹی موٹی سبزی مائل بھُوری آنکھوں، پسینے کی ننھی ننھی بوندوں سے تر بہ تر فیروزی رنگ کا لونگ پہنے تیکھی ناک، دنداسے کی رنگت سے نکھرے بھرے بھرے شگفتہ ہونٹ، چھوٹا سا منہ جس میں موتیوں سے جھلملاتے چمکیلے دانت اور مسوڑھوں پر بھی دنداسے کی چڑھی ہوئی رنگت والے انوکھے حسن کا شدت سے منتظر رہتا۔ اس کا بدن مفلسی کے باوجود فربہ وگداز، جبکہ جلد بہت چمکدار تھی۔ گندے غلیظ لباس کے اندر چھپے اس کے خدوخال سارا دن میرے دماغ پر چھائے رہتے۔ میں اس انتظار میں دن گزارتا کہ جلد صبح ہو۔۔۔ وہ آئے اور میں اس کی ہتھیلی پر پچاس روپے رکھ کر اس کی مفلسی کا تھوڑا بہت مداوا کرسکوں۔

اک روز باتوں باتوں میں میں نے اس سے پوچھا:

تم بھیک مانگتی ہو، تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟

وہ جھٹ سے سیانا انداز اختیار کر کے کہنے لگی:

جو ہمارا ہر مرد کرتا ہے۔ پھر ہلکا سا قہقہہ مار کر مزید بولی: عورت پر چڑھنے اور۔۔۔ چرس پی کر سونے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔

اس کی بے بضاعتی اور عورت ہونے کے ناتے مرد کے ہاتھوں اس کے استحصال پہ مجھے سخت طیش آیا۔ ایسے لگا جیسے اس کا ناہنجار مرد میرا رقیب ہو اور اگر اس وقت وہ میرے سامنے آجائے تو گولی مار کر اسے جہنم واصل کر ڈالوں۔

دن بہ دن میرے دل میں اس گندی، متعفّن مگر۔۔۔ جاذبِ نظر عورت کے لیے جذبۂ ہمدردی ابھرنے لگا۔ میں اکثر و بیشتر اس کے بچوں کے لیے بازار سے ایک آدھ کھلونا یا چاکلیٹ کا پیکٹ لے آتا۔ اس نے کبھی مجھ سے کسی قسم کی فرمائش نہ کی۔ اس کی یہ بے نیازی، میرے لیے حیران کن تھی کیونکہ میرا دل اکثر یہ چاہتا کہ وہ مجھ سے کچھ طلب کرے، کچھ مانگے لیکن۔۔۔ غالباً اس کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ آرزو، فرمائش، خواہش بھی انسانی جذبوں کے نام ہیں۔ وہ لان کی گھاس پہ بیٹھ کر مجھ سے بے تکلف بات چیت کرنے لگی تھی۔

ایک روز اس نے لجاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ باؤ صاحب آپ اس کوٹھی میں اکیلے رہتے ہو؟ کیا تمہاری گھر والی کہیں گئی ہوئی ہے؟ اور۔۔۔ اس لمحے میری نم آلود آنکھیں چغلی کھاتے ہوئے اسے بتا گئیں۔

ہاں! میری شریک حیات وہاں گئی ہوئی ہے جہاں سے کبھی کوئی واپس۔۔۔

اس بھکارن کا غلیظ وجود میرے لیے مداوے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، جبکہ اس کا تصور میری تنہائی دور کرنے کا موجب۔ میں شدت کے ساتھ اس کا انتظار کرتا، جیسے کوئی نو گرفتارِ محبت محبوب کے ہجر میں پگھلتا ہو۔ اپنے احساسات، اپنے جذبات پر مجھے قطعاً قابو نہ رہا تھا۔ بس ایک تڑپ تھی ایک لگاؤ تھا۔ نہ جانے یہ اُس کی جمالیاتی کشش تھی یا میری جذباتی وابستگی کہ وہ مجھے۔۔۔ بے حد بھانے لگی۔ حیرت انگیز طور پر اس کی قربت کے احساس کی بدولت عمر کے آخری حصے کا چڑچڑاپن طبیعت سے جاتا رہا اور میں اکثر و بیشتر ہشاش بشاش اور خوشگوار موڈ میں رہنے لگا۔

سخت گرمیوں میں ایک صبح۔۔۔ وہ آئی، پیسے لیتے ہوئے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی:

بابو صاحب! کل ہم اس بستی سے کوچ کر رہے ہیں۔

کہاں؟ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ مجھے حیران و پریشان دیکھ کر

کہنے لگی، جہاں خاندان کے بڑے کا حکم ہوگا۔ یہاں چار ماہ گزر چکے ہیں اب ڈیرہ ڈنڈا اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔

میں یہ بات قطعاً فراموش کر چکا تھا کہ یہ بنجارے ہیں۔ یکا یک میں سخت دلبرداشتہ ہو گیا۔ کیا تم لوگوں کو یہاں اچھی کمائی نہیں ہو رہی تھی؟ اپنا غم چھپانے کی خاطر میں نے دریافت کیا۔

بابو! دو وقت کی روٹی جہاں بھی چلے جائیں۔۔۔اللہ دے ہی دیتا ہے۔ اس نے مکمل ایقان کے ساتھ کہا۔ مگر یہاں سے کوچ کرنے پر تم اداس نہیں ہو؟

یہ کون سی ہماری ذاتی بستی ہے، جس کے اجڑنے کا ہم ماتم کریں۔ چھوٹا سا تمبو نما گھر، جسے اکھیڑ کر گدھا گاڑی پر مع کاٹھ کباڑ رکھیں گے اور اگلی منزل کو روانہ ہو جائیں۔۔۔اللہ اللہ خیر صلا۔ بنجارے کبھی ایک جگہ سے۔۔۔دل نہیں لگاتے بابو صاحب! اور اچانک۔۔۔میرے دل پر شدید چوٹ لگی۔

گھاس پر لیٹے گندے کپڑوں کی گٹھڑی کی مانند اپنے بچے کو اٹھا، دائیں ہاتھ سے اپنی قمیض جھاڑتے، اٹھ کر خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

سنو! تمہارا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا؟ میں نے ناگہاں پوچھا۔

خبر نہیں۔۔۔لیکن شاہ کہہ رہا تھا، پرانے کاہنے کے قریب میں کوئی کپڑے کی فیکٹری ہے جس کے ساتھ بہت بڑا میدان ہے، وہاں جائیں گے۔

کسی قسم کی افسردگی، کسی قسم کی مسرت ظاہر کیے بغیر۔۔۔وہ چل دی اور۔۔۔کھلے گیٹ کے درمیان کھڑا میں اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو میری آنکھیں نم ناک ہو رہی تھیں، اس کے جانے کے بعد میں بے حد مغموم ہوا۔ ایسے لگا جیسے کوئی بہت قریبی ساتھی بچھڑ گیا ہو۔ کیچڑ میں کھلا ہوا وہ کنول، وہ دھول کا پھول، ہر دم میری آنکھوں میں لہراتا اور میں اکثر و بیشتر اپنے دماغ پر زور دیتا کہ میں نے اس عورت کو پہلے پہل کہاں دیکھا تھا؟ بارہا یہ خیال لوحِ تصور پہ ابھرتا کہ شاید گزشتہ جنم میں میں بھی بنجارہ تھا؟

جب اس کی طلب نے شدت اختیار کی تو ایک روز میں نے صبح سویرے گاڑی باہر نکالی اور کاہنے کی جانب روانہ ہو گیا۔ پرانے کاہنے اور نئے کاہنے، حتیٰ کہ قصور تک سڑک کے دو رویہ آنے والی تمام ٹیکسٹائل فیکٹریوں سے ملحقہ خالی قطعات اراضی کو چھان مارا، لیکن۔۔۔وہاں بنجاروں کی کوئی بستی دکھائی نہ پڑی۔ بالآخر تھکا ہارا، مایوس ہو کر واپس آنے والی سڑک کنارے دھول میں اٹی پگڈنڈی پر ایک سن رسیدہ دیہاتی کو روک کر میں نے دریافت کیا:

بابا جی! کیا اس علاقے میں بنجاروں کے کسی قبیلے نے پڑاؤ تو نہیں کیا؟

اس بوڑھے شخص نے پہلے میری گاڑی اور پھر مجھے تشویش کی نگاہ سے دیکھا اور کاندھے پر دھرے پٹکے کو درست کر کے تجسس بھرے لہجے میں بولا:

کہاں سے آئے ہو۔۔۔تم؟ لاہور سے۔۔۔ میں نے عاجزی سے جواب دیا۔ بوڑھا اپنے گلے کو کھنگارتے ہوئے رازدرانہ انداز میں کہنے لگا:

اوئے مورکھا! کبھی بنجاروں کے اتے پتے بھی ہوا کرتے ہیں، وہ تو ہوا کے آزاد جھونکوں کے مانند ہوتے ہیں۔ ابھی ادھر۔۔۔ابھی اُدھر۔۔۔ابھی کدھر۔ آج یہاں تو کل۔۔۔کل وہاں۔

خاموشی سے گاڑی سٹارٹ کی اور گھر پلٹ آیا۔ نہا دھو کر چائے بنائی۔ ایک چسکی بھری تھی کہ دل بھر آیا۔ آنکھیں بھیگی تو۔۔۔عارض بھی بھیگنے لگے۔ اُبال بڑھنے لگا تو میرے اندر کا آدمی بیدار ہونے لگا۔ چائے کی گرم گرم چسکیوں سے میں نے اُسے دوبارہ سلانے کی سعی کی، مگر جذبات کے جس پنجرے کا میں قیدی بن چکا تھا وہ ایکا ایکی مجھے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے سوچ، میرے ادراک، میرے ہوش پہ پڑے پردے آہستہ آہستہ سرکنے لگے اور پھر۔۔۔اپنے اندر سے مجھے آواز آئی:

ارے او! خود فریبی و خود غرضی میں مبتلا بھڑوے! تو اس مفلس و لاچار متعفن عورت کی دل جوئی کہاں کر رہا تھا؟ الٹا تجھے اپنے دلِ تار تار، کاٹ کھانے والی تنہائی اور عالی شان گھر میں رہنے کے باوجود اپنی غربت کے زخموں پر رحم اور ہمدردی کے پھاہے درکار تھے۔ درحقیقت تیرے سینے میں جذبہ انسانیت ابھرا تھا نہ کسی قسم کی حبِ خدمت اور نہ ہی من میں اس بھکارن کی دادرسی کی تمنا مچلی تھی۔ بلکہ پہلی مرتبہ گیٹ کھولتے ہی تم اس کے جمالی چہرے کے اسیر اور اپنی بوڑھی ہونے والی ہوس کے غلام بن گئے تھے۔ تم اس کے پیچھے اس کی مدد کرنے کو نہیں بھاگے تھے بلکہ پچاس روپے میں تمہاری شہوانی حرص اس خوبرو غلیظ عورت کو اپنا مددگار، اپنا مسیحا بنانے کے حیلے بہانوں میں مصروفِ عمل رہی۔ اصل میں وہ بنجارن بے نیاز تھی، جبکہ تم نیازمند۔ وہ تو معمولی بھکارن تھی جبکہ۔۔۔تم غیر معمولی فقیر نکلے۔ وہ سوالی بن کر تمہارے در پر آئی اور تم کشکول لے کر اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ غریب فاتح رہی اور تم امیر کبیر مفتوح۔۔۔وہ غالب اور تم مغلوب۔

بالآخر زچ ہو کر میں نے کپ سے چائے کا آخری گھونٹ بھرا جو ٹھنڈا ہونے کے ساتھ ساتھ۔۔۔بدمزہ بھی ہو چکا تھا۔

چند دنوں بعد۔۔۔ایک صبح کتاب پڑھنے کے دوران گیٹ پہ لگی گھنٹی کی کرخت آواز نے چونکا ڈالا۔ غیر اداری طور پر دروازے کی جانب زقند بھری۔ ایک بوڑھی بھکارن وہاں کھڑی پوپلے منہ سے مجھے دعائیں دے رہی تھی۔ لحہ بھر کو میرے اندر کی جبلّت نے سر نکالا۔ میرا پارہ فوراً چڑھ گیا، آ دیکھا نہ تا دمنہ میں جو آیا بڑھیا کی عمر کا خیال بالائے طاق رکھتے ہوئے اُسے کہہ ڈالا۔ نہ جانے جی میں کیا کہتی وہ جلدی سے آگے کو سرک گئی۔ طیش کی جلتی آگ میں گیٹ بند کر کے واپس چلا آیا اور۔۔۔نہایت اطمینان کے ساتھ مطالعے میں مشغول ہو گیا۔

حقیقت

جب جب ہم چپ رہ کے سب برداشت کر لیتے ہیں تب دنیا کو بہت اچھے لگتے ہیں مگر ایک آدھ بار بھی حقیقت بیان کر دی تو سب سے برے لگنے لگتے ہیں۔ (آسکر وائلڈ)

گھر کو چلا میں

تسنیم کوثر
(لاہور)

دسمبر کا تیسرا ہفتہ تھا۔

دھند روئی کے گالوں کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔شام کے چار بجے ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔جاڑے کی سرد ہوا ہڈیوں کا گودا منجمد کر رہی تھی۔میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور میں ہی کیا؟ یہاں میرے جتنے ساتھی تھے سب کا یہی حال تھا۔یہ وقت تو لحاف میں دُبک کے گرما گرم چائے پینے کا تھا اور ہم یہاں دفتری کاروائیوں میں الجھے ہوئے تھے۔

ہمارے دفتری اوقات تو آٹھ سے ڈھائی بجے تک کے تھے مگر سرکار کے نوکر شروع اور آخر میں ایک آدھ گھنٹہ کھا ہی جاتے ہیں۔میں بھی دو بجے اپنا کام سمیٹ کر گھر کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ۔۔۔ایک دفتری SMS نے میری پھرتیوں کو بریک لگا دی۔

صاحب نے ارجنٹ میٹنگ کال کر لی تھی۔

میرا سارا پروگرام خراب ہو گیا تھا۔میں ماریہ کو تین بجے تک تیار ہونے کا کہہ کر آیا تھا کہ ہمیں کرسمس کی تیاری کرنا تھی۔بچوں کو شاپنگ کرانا تھی مگر۔۔۔اس ارجنٹ میٹنگ نے سارا پروگرام الٹ پلٹ کر دیا تھا اور۔۔۔میں گھر جانے کے بجائے ہیڈ آفس چلا آیا تھا۔

ہیڈ آفس میں چالیس پچاس کے قریب میرے ساتھی برآمدے میں شور کی محفل سجائے ہوئے تھے۔سرکاری دفاتر میں ایسے میلے لگے رہتے ہیں اور چھوٹے سکیل کے ملازمین اسی ہلّے گلّے میں خوش رہتے ہیں۔

کبھی ہمارا سکیل بھی چھوٹا ہوا کرتا تھا مگر۔۔۔

اب ہماری ترقی کر دی گئی تھی۔سکیل بڑھ گیا تھا، سرکاری موٹر سائیکل مل گئی تھی۔پٹرول بھی ہمیں دفتر سے ملتا تھا اور اس کے ساتھ ہی بہترین سرکاری موبائل بھی اب ہماری دسترس میں تھا۔یہ الگ بات کہ ہمیں اب فیلڈ ورک کرنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ یہ موبائل ہماری ہر جنبش پہ نظر رکھتا تھا۔ان سہولیات نے گویا ہمیں شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔کبھی ہماری نوکری بڑی شاہی ہوا کرتی تھی۔ہم سارا دن دفتر میں بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے۔۔۔کاغذی فیلڈ ورک کرتے،جنم پرچیاں بناتے اور اپنی مرضی کی فیسیں وصول کرتے تھے۔مٹھائیاں اور تحائف الگ مل جاتے تھے۔نہ ملتے تو ہم مانگ لیا کرتے تھے۔کوئی لیٹ یا ارجنٹ کیس آ جاتا تو بھاری جرمانے بھی وصول کرتے تھے۔ایسے میں اگر کوئی چوں چاں کرتا یا پھنّے خاں بننے کی کوشش کرتا تو ہم اسے دفتر کے اتنے چکر لگواتے تھے کہ وہ بے حال ہو جاتا۔اس کے کام میں ایسے رخنے ڈالتے کہ بے چارے کے سارے کس بل نکل جاتے اور وہ ہمت ہار دیتا پھر۔۔۔اسے ناک رگڑ کے منت سماجت کر کے ہم سے ہی اپنا کام مکمل کرانا پڑتا تھا۔دنیا بھر میں ویکسینیشن مفت کی جاتی ہے مگر ہم۔۔۔ہم تو۔۔۔ویکسینیشن کے بھی پیسے وصول کرتے تھے۔گھر جا کے ویکسینیشن کرنے کی صورت میں معاوضہ دگنا ہو جاتا تھا یوں تنخواہ سے کئی گنا زیادہ ہماری دیہاڑی بن جاتی تھی مگر اب۔۔۔

اب تو پانسہ ہی پلٹ گیا تھا۔اختیارات ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔آبادی زیادہ ہونے کے باعث لاہور کے مختلف ٹاؤن بنا دیے گئے تھے اور ہر ٹاؤن کے انتظامات واختیارات الگ الگ افسران کے سپرد کر دیے تھے اور یہ افسران اپنی اپنی ریاست میں خدا بنے بیٹھے تھے۔پولیو مہم کے لیے ملنے والے فنڈز نے سب کے وارے نیارے کر دیے تھے۔جب سے پولیو گیم شروع ہوئی تھی افسران کی جیبیں بھرنے لگی تھیں۔ہر مہینے پولیو مہم آ جاتی۔ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن یونیسف اور دیگر ادارے ہماری جانچ پڑتال میں لگ جاتے۔بھاری تنخواہوں کے عوض ہم پر پہریدار مسلط کر دیے گئے تھے جو ہماری کڑی نگرانی کرتے۔خوب کام لیتے اور ہماری خامیاں نکال کے اپنی کارکردگی میں اضافہ کر لیتے۔بڑے عہدے والے مال بھی بڑا سمیٹتے جبکہ ہمیں پورا پورا دن گلیوں میں پھرنا پڑتا اور رات گئے تک رپورٹ بنانا پڑتی تھی۔ہمارے سارے اختیارات چھن گئے تھے اور ہم کٹھ پُتلی بنے حکام بالا کے اشاروں پہ ناچتے رہتے تھے۔ہمیں صرف پولیو ڈے اور گلیوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔

جن سہولتوں کے ملنے پہ ہم خوش ہوئے تھے وہ اب ہمیں بار لگنے لگی تھیں۔ہماری دن رات کی انتھک محنت کے باوجود ملک سے پولیو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا یا شاید۔۔۔

بل گیٹس کے پُرکشش فنڈز اسے ختم ہی نہیں ہونے دے رہے تھے اچانک ہی کسی کونے سے کوئی پولیو کیس برآمد کر لیا جاتا تھا۔پوری دنیا سے تقریباً یہ مہلک مرض ختم ہو گیا تھا مگر پاکستان ابھی تک پولیو فری نہیں ہو سکا تھا یا پھر۔۔۔ہونے نہیں دیا جا رہا تھا جس کے نتیجے میں ہماری بھاگ دوڑ جاری تھی۔اس آئے دن کی دردسری سے ہم اب تنگ آنے لگے تھے۔میرے بہت سے ساتھی تو دلبرداشتہ ہو کے ریٹائرمنٹ لینے کے چکر میں تھے۔اس پولیو نے تو ہمارے سارے ٹھاٹھ باٹھ ہی ختم کر دیئے تھے۔محنت زیادہ اور معاوضہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ہمارے افسران ہمارا حق غصب کرنے کے چکروں میں رہتے تھے۔مہینے میں ہمیں پندرہ لیٹر پٹرول دیا جاتا تھا مگر۔۔۔ہمیں آدھے سے بھی کم ہی نصیب ہوتا تھا۔افسران اور چہیتے ملازموں کی ملی بھگت سے اکثر اوقات ہمارے حصے کا پٹرول ہی لیا جاتا تھا۔

ہماری حالیہ میٹنگ پولیو ڈے کے حوالے سے تھی۔۔۔ساتھ ہی پٹرول ملنے کی قیاس آرائیاں بھی ہو رہی تھیں۔دو گھنٹے گزر گئے تھے سب صاحب

کے انتظار میں تھے مگر صاحب کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہ تھا۔ جانے کب آ ئیں گے صاحب؟ میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا بار بار بچوں کا خیال آ رہا تھا۔ ماریہ کی خفگی کا احساس ستا رہا تھا۔ میرے سارے ساتھی میری طرح اکتائے اکتائے گیٹ پہ نظریں جمائے بیٹھے تھے کہ۔۔۔اچانک ہارن کی تیز آواز نے ہم سب کی اکتاہٹ کو خوشی میں بدل دیا۔ صاحب آ گئے تھے۔

صاحب کے آتے ہی برآمدے میں موجود چالیس پچاس نفوس کے ہوتے ہوئے بھی ہُو کا عالم چھا گیا۔ میٹنگ شروع ہو گئی۔ تین گھنٹوں کے انتظار کے بعد دس منٹ کی اس میٹنگ میں ہمیں صرف یہ بتایا گیا بلکہ ڈرایا گیا کہ اس بار پولیومہم غیر ملکی نمائندوں کی نگرانی میں ہوگی اور کام صحیح نہ ہونے کی صورت میں نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ صاحب ہمیں ہدایات دے کر جاتے ہوئے پٹرول کی لسٹ تیار کرنے کا حکم بھی صادر کر گئے تھے۔ پٹرول ملنے کی خوشی نے ہماری افسردگی دور کر دی۔ لسٹ بنانے کی ذمہ داری صاحب کا چہیتا ڈرائیور نبھاتا تھا اور بہت جانچ پڑتال کے بعد حاضر ملازمین کے نام درج کرتا تھا۔ کوئی ویکسینیٹر اس وقت موجود نہ ہوتا تو اس کا پٹرول ڈرائیور کے کھاتے میں چلا جاتا تھا۔ مستقل سرکاری ملازم ہونے کے باوجود وہ ہمیں ذرا سی رعایت نہ دیتا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی رخصت پر ہونے کی وجہ سے اس وقت موجود نہ تھا مگر اس نے ہم سب ساتھیوں کے اصرار کے باوجود اس کا نام لسٹ میں نہیں لکھا تھا۔

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر چاہنے کے باوجود اسے کچھ نہ کہہ سکا تھا کہ اپنی بائیس سالہ نوکری کو داؤ پہ لگانا میرے بس میں نہ تھا۔ اتنی عمر بتا دی تھی اب تو صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ لہٰذا مصلحتاً خاموشی کی چادر تان رکھی تھی۔ ہم سب کی اس مصلحت کوشی نے ہی تو ان حق تلفی کرنے والوں کو دلیر بنا رکھا تھا۔

لسٹ تیار ہو گئی تھی اور صاحب کی میز پر رکھ دی گئی تھی مگر۔۔۔ صاحب فون پر کسی ضروری گفتگو میں مصروف تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے جسم کے آر پار ہو رہے تھے مگر پٹرول کی کشش نے سب کو وہاں بٹھا رکھا تھا۔ اچانک گھنٹی بجی۔

ڈرائیور بھاگم بھاگ کمرے میں پہنچا اور لسٹ لہراتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ ہم سب نے ڈرائیور کو گھیرے میں لے لیا اور بے صبری سے اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ باری باری نام پکار رہا تھا اور اس کی آواز پر لپک کر پرچی وصول کی جا رہی تھی جس کا نام پکارا جاتا وہ مجمے کو چیرتا پھاڑتا آگے بڑھتا۔ اپنے نام کے ساتھ دستخط کرنے سے پہلے ایک لال نوٹ ڈرائیور کی مٹھی میں دے کر مطلوبہ پرچی حاصل کرتا اور اپنی راہ لیتا۔ رات کے آٹھ بجے تھے جب میرا نام پکارا گیا۔۔۔ میں نے بھی وہی کیا جو سب کر رہے تھے۔ پیسے اس کی مٹھی میں تھمائے، پرچی وصول کی اور تیزی سے دفتر کی عمارت سے باہر نکل آیا مگر اس وقت بھی میری منزل گھر نہیں بلکہ وہ پٹرول پمپ تھا جہاں سے مجھے پٹرول وصول کرنا تھا۔ افسرانِ بالا کی ملی بھگت والا پٹرول پمپ میرے گھر سے سترہ کلومیٹر دور تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا وہاں جانا ضروری تھا کہ آج پٹرول وصول نہ کرنے کی صورت میں پرچی کینسل ہو جاتی۔

میرے پہنچنے تک میرے کافی ساتھی پٹرول پمپ پہ موجود تھے اب پھر ایک لمبی قطار میرے سامنے تھی۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہوا پٹرول وصول کر کے کانپتا ٹھٹھرتا جب گھر پہنچا تو۔۔۔

رات کے دس بجے تھے۔

بچے سو چکے تھے۔

ماریہ منہ پھُلائے بیٹھی تھی۔۔۔ میرا دل بجھ سا گیا۔۔۔ میں تو خوشی خوشی گھر کی طرف آیا تھا مگر سات لیٹر کا سیلاب میری خوشیاں بہا لے گیا تھا۔

- بقیہ -

''یوں نہیں، یوں! اور کچھ دیگر''

ڈاکٹر صاحب نے بعض اشعار میں کیے گئے تصرف اور لفظی تبدیلی کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ مرزا غالبؔ کی ایک مشہور غزل، ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک'' کی ردیف مختلف نسخوں میں ایک جیسی نہیں ہے۔ کلامِ غالبؔ کا ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناتے، میں بھی اُلجھن کا شکار رہا۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ کُھلا کہ سب سے پہلے یہ تصرف فلم سٹار ثریا نے کیا جب ۱۹۵۴ء کی ہندوستانی فلم ''مرزا غالبؔ'' کے لیے یہ غزل گائی گئی۔ گلوکارہ نے اصل ردیف ''ہوتے تک'' کی جگہ ''ہونے تک'' ادا کی، جب ہی سے یہ بدل گئی اور مختلف نسخوں میں در آئی۔ یہاں تک کہ نامور ادیب، مصنف اور کالم نویس بھی اسی طرح لکھنے لگے۔

''یوں نہیں، یوں! اور کچھ دیگر'' تصحیحاتِ شعری اور مزاح پر مشتمل مضامین کا گلدستہ ہے جو قاری کو اوّل تا آخر اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ مصنف کی تحقیقی مہارت اور بصیرت، کتاب میں جگہ جگہ ظاہر ہوتی ہے۔ حواشی اور حوالے بڑی محنت اور تحقیقی اسلوب کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ جس محنت اور خلوص سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا اظہار اس کے ہر ہر صفحے سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب، بلاشبہ، اعلیٰ سطحی جامعاتی تحقیق اور مزاح کے قارئین کے لیے یکساں راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔

''برقِ تپاں''

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

زندگی میں ہیں امتحاں کتنے — اک زمیں اور آسماں کتنے
ہیں رواں کب سے دل کی بستی میں — آرزوؤں کے کارواں کتنے
جن پہ اپنا گماں گزرتا ہے — ہم سے رہتے ہیں بدگماں کتنے
اُن کی آنکھیں بھی اُن کا چہرہ بھی — بہرِ سجدہ ہیں آستاں کتنے
اس سے پہلے کہ خواب پورے ہوں — چھوڑ جاتے ہیں یہ جہاں کتنے
جو بھی آنکھوں سے اشک بہتے ہیں — میرے دل کے ہیں ترجماں کتنے
وہ کہ دل کے قریب ہیں لیکن — فاصلے پھر بھی درمیاں کتنے
جب کریں بات حق پرستی کی — لوگ ملتے ہیں ہم زباں کتنے؟
برق جن کو جلا نہیں پائی — ہیں ابھی ایسے آشیاں کتنے
ہم نے کیا کیا فریب کھائے ہیں — دل پہ زخموں کے ہیں نشاں کتنے
جن میں ہے فکر وفن کی گہرائی — شعر ہیں بحرِ بیکراں کتنے
ساتھ تھا میرِ کارواں لیکن — لُٹ گئے پھر بھی کارواں کتنے
ساتھ ہے جب دعا بزرگوں کی — میرے سر پر ہیں سائباں کتنے
آج جو بات تک نہیں کرتے — کل تھے مجھ پہ وہ مہرباں کتنے
پاسبانوں کی سازشوں کے طفیل — صحرا بنتے ہیں گلستاں کتنے
جن میں شامل ہو طنز کا پہلو — لفظ ہوتے ہیں وہ گراں کتنے
جو ہیں ماہر فریب کاری میں — دیکھنے میں ہیں مہرباں کتنے
عرشؔ برقِ تپاں کی فطرت ہے — یہ جلاتی ہے آشیاں کتنے

شہلا شہناز
(گوجرانوالہ)

خواب کے دریا میں پاؤں ڈال کر بیٹھی تھی میں — جسم و جاں کی تھاہ تک خود کو بھگو سکتی تھی میں
یہ زمیں چھوٹا سا نقطہ مجھ کو آتی تھی نظر — پورے پر لے کر فلک کی اوج تک اڑتی تھی میں
ایسے بھی کچھ پاگلانہ پل مری مٹھی میں تھے — لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے گالیاں بکتی تھی میں
میری چھوٹی چھوٹی کجیاں بھی مجھے بھاری نہ تھیں — اپنے سب اندوختے کیساتھ ہی چلتی تھی میں
نیم شب میرا گزر ہوتا تھا تیرے خواب سے — تیری خواہش کی ندی میں ڈبکیاں لیتی تھی میں
تیری چشمِ مہرباں کی رت میسر تھی مجھے — بور بھی آتا تھا مجھ پر اور بہت پھلتی تھی میں
میری مٹی میں سخن کی روشنی گوندھی گئی — سو غزل شہلا بہت بے ساختہ کہتی تھی میں

○

فرح کامران
(نیویارک)

میرے آنگن مین جوآتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
کتنا کہرام مچاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
موج خوں ساحلِ مژگاں پہ ٹھہرتی ہی نہیں
ایسا طوفان اٹھاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
عکس بنتے ہیں بگڑتے ہیں در و بام پہ روز
ایک تصویر بناتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
چائے کی میز پہ وہ خالی پیالی تیری
دیکھتی ہوں تو رلاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
جب شب تار بکھرتی ہے کراں تا بہ کراں
مانگ تاروں سے سجاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
دشت امکان میں کھلتا ہے تیری یاد کا پھول
شمع امید جلاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
ڈھلتا سورج جو شب غم کی خبر دیتا ہے
کس قدر اشک بہاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
ختم ہوتے ہی نہیں دن کے بکھیڑے ہم سے
کہ ستانے چلی آتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
جب کبھی ٹوٹ کے گرتا ہے چمکتا تارہ
پھر وہی سوگ مناتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام
ہم سے کٹتی نہیں اب یہ شبِ فرقت جاناں
آ بھی جاؤ کہ بلاتی ہے یہ ڈھلتی ہوئی شام

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

انحصار اب تو ہے دوانے پر
ہے رقیب اُس کے نشانے پر
خوش گمانی ہے یا غلط فہمی
منحصر ہے یہ اُس کے آنے پر
یہ پسند آئے یا نہ آئے مگر
کام میرا ہے گھر سجانے پر
جنگ میں سچ کی یہ تو ہونا تھا
فیصلہ چھوڑ دو زمانے پر
آگ برسائے یا زمیں پر پھول
مسئلہ یہ تو ہے فسانے پر
سلسلہ ختم ہو گیا پھر بھی
لوگ کیوں ہیں بضد ستانے پر
آئے گا یا نہ آئے گا وہ سروشؔ
وہ مرے گھر مرے بلانے پر

○

رئیس صدیقی
(بھوپال، بھارت)

دُنیا سمجھ رہی تھی جو بارِ گراں مجھے
اَب وہ سُنا رہی ہے، میری داستاں مجھے
جب سے خیالِ یار مرا ہم سفر بنا
مُڑمُڑ کے دیکھتا ہے، ہر اِک کارواں مجھے
میں ہوں وفا پرست، ستم بھی ہے عزیز
منظور ہے زمانے کا ہر امتحاں مجھے
دوگام مرے ساتھ چلے راہِ عشق میں
ملتا نہیں ہے ایسا کوئی راز داں مجھے
تجھ سے بچھڑ کے، جب سے ہوں خاموش
رئیسؔ، دنیا کہنے لگی ہے بے زباں مجھے

○

عارف شفیق

(کراچی)

اس لیے وقتِ سحر جاگ رہا ہوتا ہوں
میں پرندوں سے ترا ذکر سنا کرتا ہوں

دل تو لے جاتا ہے ہر روز خدا کے گھر میں
جانے کس خوف سے میں بُت سا بنا رہتا ہوں

جا چکے ہوتے ہیں مسجد سے نمازی سارے
اور اک میں ہوں کہ سجدے میں پڑا رہتا ہوں

در معبد پہ لگی ہے جو فقیروں کی قطار
ایک مجذوب کی صورت میں چھپا بیٹھا ہوں

میرے مولا نے وہ آدابِ فقیری بخشا
ہر کسی در پہ کہاں میں بھی صدا دیتا ہوں

پیٹ بھر لیتا ہوں ہر روز کسی لنگر سے
اک عجب مستی میں حجرے میں پڑا رہتا ہوں

رقص کرتا ہوا بازار میں سب دیکھتے ہیں
میں کہیں دور بہت دور گیا ہوتا ہوں

بس یہی راز چھپانا ہے مجھے دنیا سے
وہی ہو جاتا ہے جو سوچ رہا ہوتا ہوں

میں نے بھی دل سے پکارا ہے اسے یوں عارفؔ
جیسے گنبد میں اذانوں کی طرح گونجا ہوں

○

سحر تاب رومانی

(کراچی)

خامشی سے کہو ذرا خاموش
سُن رہا ہے مرا خدا خاموش

ایک میں ہی تھا بولنے والا
وہ بھی تُو نے کرا دیا خاموش

کر رہی تھی کلام خاموشی
اِس لیے ہونا پڑ گیا خاموش

میں نے دیکھا ہے، لوگ ہوتے ہیں
اُس سے کر کے مکالمہ خاموش

زندگی کی یہی کہانی ہے
ابتدا شور، اِنتہا خاموش

گفتگو کرنی تھی مجھے لیکن
میں تری بزم سے اُٹھا خاموش

کرب ہی کرب سہہ رہا ہوں میں
پاؤں زنجیر راستہ خاموش

○

ارشد جمال

(ممبئی، بھارت)

بعید از قیاس تھے جتنے بھی دشمن سامنے آئے
چلو اچھا ہوا اپنوں کے یہ فن سامنے آئے

جوانی کی کڑی رُت میں کسے لغزش نہیں آئی
جو ناصح ہو مرا بے داغ دامن سامنے آئے

قفس میں نا اُمیدی کے ادب سے سر جھکا دینا
در اُمید کا جب کوئی روزن سامنے آئے

بدلتے وقت نے قدروں کو اتنا مسخ کر ڈالا
جو کل تک راہبر تھے بن کے رہزن سامنے آئے

جمالؔ اک بار دیکھوں میں بھی تصویرِ تمنا کو
غزالی چشم آسا کوئی درپن سامنے آئے

○

زیبا سعید
(کراچی)

قطرۂ شبنم کو بحرِ کراں سمجھی تھی میں
آگ کے دامن میں اپنا آشیاں سمجھی تھی میں

چل پڑی تھی پتھروں پر کہکشاں سمجھی تھی میں
بے خودی میں اس زمیں کو آسماں سمجھی تھی میں

میں نظر کے پیچ وخم میں اس قدر اُلجھی رہی
رہزنوں کی ٹولیوں کو کارواں سمجھی تھی میں

جانتی تھی پھر بھی لیکن اس سے دھوکہ کھا گئی
خود ہی اپنے دشمنوں کو ہم عناں سمجھی تھی میں

یاد ہے مجھ کو ابھی تک پیار کا پہلا عمل
جب نظر میں ڈوب کر دل کی زباں سمجھی تھی میں

لوگ بھولا پن کہیں یا اس کو میری سادگی
راز دے کر ہر کسی کو رازداں سمجھی تھی میں

میرے دل میں گونج اُٹھیں تیرے دل کی دھڑکنیں
اب سے پہلے اس فضا کو بے اذاں سمجھی تھی میں

ایک ہی بس چوٹ کھائی اور زخمی ہو گیا
موم کے دل کو کتنا سخت جاں سمجھی تھی میں

میں نے پلکوں سے قدم چومے جوان کے کیا ہوا
ان کے قدموں کو نظر کا آستاں سمجھی تھی میں

وہ تو زیبا مجھ سے کوسوں دور ہی پائے گئے
عمر بھر جن کی لگن آرام جاں سمجھی تھی میں

○

انیس اشفاق
(لکھنؤ، بھارت)

اسی زمیں پہ اسی آسماں میں رہنا ہے
ترا اسیر ہوں تیرے جہاں میں رہنا ہے

میں ایک پل تری دنیا میں کیا قیام کروں
کہ عمر بھر تو مجھے رفتگاں میں رہنا ہے

میں جانتا ہوں بہت سخت دھوپ ہے لیکن
سفر میں ہوں تو صف رہ رواں میں رہنا ہے

اتر گئی ہے تو سینے سے مت نکال اسے
کہ میرے خون کو تیری سناں میں رہنا ہے

نہ میرے ہاتھ سے چھٹنا ہے میرے نیزے کو
نہ تیرے تیر کو تیری کماں میں رہنا ہے

کھلے رہیں جو کھلے ہیں قفس کے دروازے
وہ کب چھٹیں گے جنہیں قید جاں میں رہنا ہے

تو پھر یہ زندگی جاوداں کا ملنا کیا
جو ہر نفس نفس رائیگاں میں رہنا ہے

○

سبھاش گپتا شفیق
(ہوشیار پور، بھارت)

کبھی وہ میری وفاؤں کو پروقار کرے
یہ اک دعا ہے جو دن رات خاکسار کرے

وہ میرے سامنے خنجر لئے کھڑا کیوں ہے
جو مارنا ہی ہے مجھکو تو مجھ پہ وار کرے

وہ بے خبر ہے کہ اسکے لئے کوئی کتنے
پہاڑ سر کرے اور کتنے دریا پار کرے

نہیں ہے کوئی یہاں اسکو پوچھنے والا
وہ جسکو چاہے جہاں چاہے سنگسار کرے

ہمارے عہد کا ہے ایک المیہ یہ بھی
وہی ہے لوٹنے والا جو ہوشیار کرے

اب آدمی کو فقط آدمی سے ڈر ہے شفیق
کہ آدمی کا یہاں آدمی شکار کرے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

اس پہ چلنے میں ہی اِفادہ ہے — کیوں کہ یہ سیدھا سچا جادہ ہے
کوئی تو بات ہی نئی ہوتی — سارے کا سارا ہی اِعادہ ہے
کچھ تو تخلیق بھی کیا ہوتا — استفادہ ہی استفادہ ہے
رُوپ بہروپ سب رہے مخفی — اُوڑھ رکھا یہ کیا لبادہ ہے
کیسے مبہم نظر سے آتے ہیں — کہیے! کیا آپ کا اِرادہ ہے
بھولے سے بھی نہ آئیں جھانسے میں — وہ دِکھاوے کا صرف وعدہ ہے
حالِ باطن کی ہے خدا کو خبر — دیکھنے میں تو لگتا سادہ ہے
دُور تک خار دار رستہ ہے — اُس پہ پھر مستزاد پیادہ ہے
جو بھی ہے، اعتدال میں ہی رہے — کچھ ہے یہ کم، نہ کچھ زیادہ ہے!

○

رحمان فارس

(الٰہ آباد، بھارت)

جب خزاں آئے تو پتے نہ ثمر بچتا ہے — خالی جھولی لیے ویران شجر بچتا ہے
نکتہ چیں! شوق سے دن رات مرے عیب نکال — کیونکہ جب عیب نکل جائیں، ہنر بچتا ہے
سارے ڈر بس اِسی ڈر سے ہیں کہ کھو جائے نہ یار — یار کھو جائے تو پھر کونسا ڈر بچتا ہے
روز پتھراؤ بہت کرتے ہیں دُنیا والے — روز مر مر کے مِرا خواب نگر بچتا ہے
غم وہ رستہ ہے کہ شب بھر اسے طے کرنے کے بعد — صبحدم دیکھیں تو اتنا ہی سفر بچتا ہے
بس یہی سوچ کے آیا ہوں تری چوکھٹ پر — دربدر ہونے کے بعد اک یہی در بچتا ہے
اب مرے عیب زدہ شہر کے شر سے، صاحب! — شاذ و نادر ہی کوئی اہلِ ہنر بچتا ہے
عشق وہ علمِ ریاضی ہے کہ جس میں فارسؔ — دو سے جب ایک نکالیں تو صفر بچتا ہے

○

اصغر شمیم

(کولکتہ، بھارت)

چلو کام کچھ ہم بھی ایسا کریں — زمانے میں قد اپنا اونچا کریں
فلک خود بخود زیرِ پا آئے گا — چلو اس زمیں کو ہی الٹا کریں
یہی سوچتے عمر کٹتی رہی — کبھی خود کے بارے میں سوچا کریں
مسائل سے ہرگز نہ گھبرائے دل — ہم اپنے ارادوں کو پختہ کریں
مجھے سانس پہ آس اصغرؔ نہیں — تو کیوں زندگی کی تمنا کریں

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۶

چند لمحوں کے لیے تو مجھے یہ سب سپنا لگا۔ مجھے تو بس اتنا یاد تھا کہ رمیش لاج پہنچ کر موہن نے مجھے طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کچھ دیر آرام کرنے، سونے یا لیٹنے کا مشورہ دیا تھا۔ اٹھنا چاہا تو پتہ چلا کہ مجھے گلوکوز کی بوتل لگی ہے۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر روپا نے کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ کر افسردہ آواز میں مجھے لیٹا رہنے کی تاکید کی۔ میری سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آ رہا تھا کہ سب کیا ہے، مجھے گلوکوز کی بوتل کیوں لگی ہے اور روپا یہاں کیسے پہنچی ہوئی ہے۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرے گلے میں کانٹے پھنسے ہوں۔ میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی لیکن میں اس کوشش کے نتیجے میں بے تحاشہ کھانسنے لگا۔ غور سے روپا کا چہرہ دیکھا تو اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ میری بیماری کے باعث اداس تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ کمرے میں لٹکتا ہوا گھڑیال آٹھ بجا رہا تھا۔ ہم لوگ رات کے بارہ بجے یہاں پہنچے تھے۔ کیا میں پچھلے آٹھ گھنٹوں سے اسی حالت میں ہوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور میرے گلے سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی کہ میں روپا سے اپنے سوالات کے جوابات مانگوں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر پپوٹوں کا بوجھ محسوس ہوا اور میں ایک بار پھر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو گھڑیال بارہ بجا رہا تھا اور روپا ابھی تک میرے بستر کے برابر پڑی ہوئی کرسی پر اونگھ رہی تھی۔ گلوکوز کی بوتل شاید ختم ہونے پر میرے جسم سے ہٹا لی گئی تھی۔ لیکن اس کا اسٹینڈ اب بھی میرے بستر کے سرہانے کھڑا تھا۔ میں غسلخانے جانے کی حاجت پوری کرنے کے لیے بستر سے اٹھنے کی کوشش کر کے کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ چلنے کی کوشش کی تو مجھے نقاہت ضرور محسوس ہوئی لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں چل بھی نہ سکوں۔ غسلخانے سے نکلا تو دروازے پر کھڑی روپا مجھے بازو سے پکڑ کر بستر پر لے آئی تو میں بستر پر سونے کی بجائے بیٹھ گیا۔ اب کیسے ہو؟ اس نے پوچھا، ڈرتے ڈرتے بولنے کی کوشش کی تو اس بار میں کمزور سی آواز نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں تو اچھا ہوں لیکن یہ سب کیا ہے؟ مجھے اچانک کیا ہوا تھا اور تم یہاں کہاں کیسے پہنچی ہوئی ہو؟ شاید اپنی آواز واپس آنے پر میں اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ ایک ہی سانس میں روپا سے اتنے سارے سوال کر ڈالے۔

مجھے بستر پر بٹھا کر وہ پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ پہلے تم بستر پر آرام سے لیٹ جاؤ، میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔ میں اس کی کروٹ لیٹا تو اس نے کرسی میرے بستر کے قریب گھسیٹ لی، میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، ہاں! اب تمہارا تپ بھی کم ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں بھوک تو نہیں لگی۔ تم نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا۔ چوبیس گھنٹوں سے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ تو اور کیا؟ کل رات تم تقریباً اسی وقت یہاں پہنچے تھے۔ ماتا جی نے تمہارے لیے دلیہ اور کھچڑی بنوا کے رکھی ہوئی ہے۔ ماتا جی بھی یہاں ہیں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ تمہارے سوالات کے جواب کچھ کھلانے کے بعد دوں گی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے کھانے کا نام لیا تو مجھے واقعی بھوک ہونے لگی۔ ہاں مجھے بھوک بھی لگی ہے اور میں کچھ کھاؤں گا بھی، میں نے جواب دیا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کے قریب لگا ہوا بٹن دبایا۔ کچھ دیر میں ایک خادمہ آئی تو روپا نے اسے دلیہ اور کھچڑی لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد خادمہ ایک ٹرے میں دلیہ اور کھچڑی کا ایک ڈونگا اور ایک خالی پیالہ لے آئی۔ روپا نے پیالے میں دلیہ اور کھچڑی ڈالی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ سے پیالہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پیالہ دُور ہٹاتے ہوئے کہا، نہیں، آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔ میں نے ہنس کر ہاتھ واپس کھینچ لیا اور منہ کھول دیا۔ وہ مجھے چمچ بھر بھر کر کھلاتی رہی۔ پیالہ ختم ہوا تو اس نے مجھے پینے کو پانی دیا۔

مجھے لیٹنے کو کہہ کر اس نے خالی پیالہ اور پانی کا گلاس واپس ٹرے میں رکھے اور میرے بستر کے قریب کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ہاں، اب میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دوں گی۔ کل رات جب ہمیں رمپا جی کی ارتھی پہنچنے کی اطلاع ملی اور ہم ارتھی لینے حویلی سے باہر جا رہے تھے تو میں نے تمہیں موہن کے ساتھ برآمدے سے اندر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہیں وہاں دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ لیکن میرے قریب سے گزرتے ہوئے تم نے مجھے دیکھا اور کچھ کہے بنا کسی انجان کی مانند پاس سے گزرتے چلے گئے تو مجھے دکھ ہوا۔ میرے ساتھ ماتا جی بھی تھیں۔ میں نے ان سے تمہاری شکایت کی کہ تم مجھے دیکھ کر منہ پھر کے چلے گئے ہو۔ ماتا جی نے بھی تمہیں دیکھا تھا۔ وہ بولیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی تھی اس لیے شاید اس نے ہم پر توجہ نہیں کی۔ پیچھے مڑ کر میں نے تمہیں ایک کمرے میں جاتے دیکھا۔ موہن سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم ہی رمپا جی کی ارتھی ڈربن سے یہاں لائے ہو اور راستے میں تمہاری طبیعت واقعی خراب تھی اس لیے تم آرام کرنے چلے گئے ہو۔ واپسی پر ماتا جی اور میں ایک ساتھ تمہیں دیکھنے آئے تو تمہارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور تم بستر پر عجیب سی حالت میں لیٹے تھے۔ تمہارا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا۔ ماتا جی نے تمہارے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے مجھے کہا، راموکا جسم تپ رہا ہے ہمیں جلدی کسی ڈاکٹر کو بلا کر اسے دکھانا چاہیے۔ ڈاکٹر شرما نانا کے دوست ہیں اور وہ رمپا جی کے مرنے کی خبر سن کر باقی لوگوں کے ساتھ یہاں موجود تھے۔

ان کو اندر بلوا کر دکھایا۔ تمہیں دیکھ کر انہوں نے ماتا جی کو بتایا کہ تمہارا

تپ 105 درجے پر ہے اور تمہارے خون کا دباؤ بھی خاصا کم ہے اور تمہارے گلے میں انفیکشن ہے۔انہوں نے تمہارے لیے گلوکوز کی بوتل میں اینٹی بایاٹک اور سونے کی دواڈال کرتمہیں لگائی۔اورتم پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میری تیمارداری کر رہی ہو، میں نے درمیان میں گرہ لگائی۔نہیں ماتا جی بھی میرے ساتھ ہیں اس نے جواب دیا۔میں نے کہا، میں اب ٹھیک ہوں۔اچھاتم اب کسی اچھی بچی کی طرح اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔وہ کہنے لگی،نہیں جب تک تم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے میں نہیں جاؤں گی۔میں نے کہا، پگلی میں بالکل ٹھیک ہوں۔دیکھو بول بھی رہاہوں اور کھاپی چکاہوں۔وہ بولی، اچھاجب تم سوجاؤ گےتب جاؤں گی۔لومیں سوگیا، میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔وہ ہنستے ہوئے بولی، اچھابابا اچھا، میں جاتی ہوں۔چلتے چلتے اس نے میرے ماتھ پر ایک بار پھر ہاتھ رکھا تو میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کا ہاتھ چوم لیا۔روپانے مسکراتے ہوئے جواباً میرا ہاتھ چوما اور کمرے کی بتی بجھا کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور شاید نیندوالی دوا کا ابھی تک اثر تھااس لیےایک بار پھر سوگیا۔

نیم غشی کے عالم میں سامنے مناسہ دیوی کو دیکھا۔اس نے مجھے منہ کھولنے کو کہا، منہ کھولا تو اس نے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز میرے منہ میں ڈال دی۔ میرے منہ کا ذائقہ پہلے نیم جیسا کڑوا ہوا اور پھر شہد جیسا میٹھا ہو گیا۔صبح میری آنکھیں کھلی تو میرے منہ کا ذائقہ ویسے ہی میٹھا تھا۔میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ مناسہ واقعی آئی تھی یا میں نے کوئی سپنا دیکھا تھا۔لیکن ایک بات واضح تھی کہ نہ اب میرے گلے میں درد تھا اور نہ ہی میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔میں نے اپنے جسم پر نظر ڈالی تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں ابھی تک دو دن پہلے والے لباس میں تھا۔میں جلدی سے اپنے سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر غسلخانے میں گھس گیا۔شیو اور دانت صاف کرنے کے بعد جی بھر کر نہاتا رہا۔کپڑے پہن کر غسلخانے سے باہر آیا تو سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔

کمرے کا گھڑیال اس وقت صبح کے سات بجا رہا تھا۔یعنی مجھے یہاں آئے ہوئے تیس گھنٹے سے اوپر گزر چکے تھے اور اب تک میں اسی کمرے کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا تھا۔مجھے باہر کا حال بھی معلوم نہیں تھا۔میں اس وقت تک باہر بھی نہیں جانا چاہتا تھا جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رمپا کا کریا کرم ابھی ہوا ہے یا نہیں اور رمپا کے بعد اب میرا رمیش لاج میں کیا کام ہوگا؟ لیکن رمپا کے رمیش لاج میں سانپوں کی ہوا پھیلانے کی لاج رکھنے کے لیے میں نے طے کیا تھا کہ سارے رمیش لاج میں ہرمل کی دھونی دلوادوں گا۔تاکہ انجہانی رمپا پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے اور لوگ سمجھیں کہ ہرمل کی دھونی نے رمیش لاج سے سانپوں کو بھگا دیا ہے۔

روپا اور اس کی ماتا کی یہاں موجودگی میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث ہونے کے علاوہ میری ڈھارس بھی تھی۔کم از کم اب میں یہاں خود کو مکمل طور پر اجنبی محسوس نہیں کر رہا تھا۔رمپا نے مجھے کل بتایا تھا کہ راجہ کی بیٹی اور نواسی ہندوستان سے آج کل یہاں آئی ہوئی ہیں۔روپا رمیشن کو نانا کہہ رہی تھی۔اس لیے روپا کا اپنے نانا کے گھر ہونا سمجھ آنے والی بات تھی۔مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپا اور اس کی ماتا کی ملاقات نیتو سے بھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اگر دونوں کی ملاقات ہوئی تو کیا ان کی گفتگو میں کہیں میرا ذکر بھی آیا تھا اور اگر آیا بھی تھا تو کس انداز سے؟ مجھے ایک بات کا اطمینان تھا کہ میں نے اب تک دونوں میں سے کسی کو کسی قسم کا کوئی جھانسہ نہیں دیا تھا اس لیے مجھے دونوں صورتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔انہی سوچوں کے دوران دروازے پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو روپا اپنی ماتا کے ساتھ کھڑی تھی۔دونوں اندر آئیں تو میں نے دونوں کا اپنی تیمارداری کرنے پر ایک بار پھر شکریہ ادا کر کے قریب پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔رانی نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میرا ماتھا چومتے ہوئے پوچھا، شکریے کو چھوڑو مجھے یہ بتاؤ کہ اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میں نے کہا، آپ کی دیکھ بھال اور بھگوان کی کرپا سے اب بالکل بھلا چنگا ہوں۔ہاں اب تم پہلے والے رامولگ رہے ہو، انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔چلو اور ہمارے ساتھ چل کر نران کرو، وہاں پر میرے پتا جی سے بھی ملنا۔وہ تمہارا کل سے پوچھ رہے ہیں۔کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔تو اور کیا؟ انہوں نے ہی تو تمہیں رمیش لاج میں سانپوں کے سلسلے میں ہندوستان سے یہاں بلوایا تھا۔ جی ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا انہیں یہاں پر میری آمد کی اطلاع تھی؟ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔رانی جی بولیں، ہاں انہوں نے ہی موہن کو رمپا کے ساتھ تمہیں ڈربن سے لانے کو بھجوایا تھا۔وہ تو رمپا کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ گیا۔مہاراج کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم ان کی پیاری رمپا کی ارتھی یہاں لائے تھے، رمپا ان کی چہیتی پتنی تھیں۔مہاراج بیماری کے دوران تمہیں دیکھنے بھی آئے تھے۔چلو چل کر نران کرتے ہیں انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ہم تینوں کمرے سے نکلے تو میں نے روپا سے پوچھا، کیا رمپا جی کا کریا کرم ہو گیا ہے؟ ہاں وہ تو کل آٹھ بجے ہو گیا تھا۔افریقہ کی گرمی میں جتنی جلدی کریا کرم ہو جائے بہتر ہوتا ہے۔

نران کی میز پر مہاراج کو دیکھا وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھے تھے جوان کی گرتی ہوئی صحت کی گواہی دے رہی تھی۔وہ پہلے سے خاصے کمزور دکھائی دیتے تھے۔انہوں نے مجھے نہیں پہچانا تھا یا پھر عمر کے ساتھ ان کی یادداشت کام نہیں کر رہی تھی اور میں نے بھی انہیں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہماری ملاقات پہلے بھی کہیں ہو چکی ہے۔وہ اداس بھی نظر آ رہے تھے۔انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کمزور آواز میں پہلے میری صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر میرا ہندوستان سے یہاں آنے کا اور رمپا کی ارتھی لانے پر شکریہ ادا کیا۔ان سے اس سے زیادہ بات نہ ہو سکی۔نران کرنے کے بعد میں اٹھنے لگا تو روپا بھی میرے ساتھ کھڑی ہو گئی۔وہاں سے نکلے تو میں نے روپا سے پوچھا، تم لوگ کب یہاں

پہنچے تھے۔تمہارے آنے سے ایک روز پہلے،اس نے جواب دیا۔اس کا مطلب تھا کہ نیتو کے جانے کے بعد روپا یہاں پہنچی تھی۔

کہاں جارہے ہو؟اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔ اپنے کمرے میں جانے کی سوچ رہا تھا،اگر تم کہیں لے جانا چاہتی ہو تو میں تیار ہوں۔اچھا تو میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو،میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔میں نے کہا تو چلو۔میں اس کے پیچھے ہولیا اور ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہونے لگی۔دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ وہ شکوہ کرے گی کہ میں اس کی حویلی سے کیوں بھاگ کھڑا ہوا تھا؟ہم نے راستے بھر کوئی بات نہیں کی۔وہ چند راہداریوں سے گزرتے ہوئے مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔کمرے میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے کہا،کیا تم مجھ سے ابھی تک خفا ہو؟تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں تم سے کبھی خفا تھا روپی؟میں نے حیرت سے پوچھا۔کیونکہ میں تمہیں اپنی حویلی میں چھوڑ کر اپنی سہیلی سے ملنے جو چلی گئی تھی نااس لیے؟اس نے میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔میں حیران بھی تھا اور اندر سے خوش بھی تھا کہ روپا میرے حویلی سے اچانک چلے جانے کا ذمہ دار خود کو ٹھہرا رہی تھی۔میں نے کہا،نہیں تو۔میں نے تو کبھی بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔وہ بولی تو پھر تم مجھے اس طرح اچانک چھوڑ کر کس لیے چلے گئے تھے؟میں نے جواب دیا،ماتا جی نے تمہیں گوبندر جی کے ہاں کا سارا حال بتایا ہوگا۔کہنے لگی ہاں،لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ تم ایک دوروز بعد پھر واپس آ ؤ گے۔

پروگرام تو تھا لیکن مہاراج کے ایک ساتھی کو سانپوں کے سلسلے میں میری مدد درکار تھی۔اس لیے مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔پھر میں نے جانے سے پہلے تمہارے لیے ایک پتر لکھ کر شلپا کو دے آیا تھا۔روپا بولی،وہ تو مجھے ملا تھا اور اسی پتر سے تو میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم مجھ سے خفا ہو کر گئے ہو۔میں نے پوچھا،وہ کیسے؟میں نے اپنے پتر میں تو کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس سے میری ناراضگی ظاہر ہوتی۔یاد ہے اس پتر میں تم نے مجھے راجکماری جی لکھا تھا۔تم تو مجھے روپی کہتے ہو نا۔اس لیے وہ بولی۔اوہ وہ،میں نے کہا۔ہاں وہ۔۔۔اس نے میری نقل کرتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میں ہنس پڑا۔اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟اس نے حیرت سے پوچھا۔مجھے تمہاری معصومیت پر ہنسی آئی ہے۔پھر میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا،تم میرے لیے روپی ہو اور روپی رہو گی۔اگر میں وہ پتر تمہارے ہاتھ پر رکھتا تو میں تمہیں ہی روپی لکھتا۔لیکن میں نے وہ پتر شلپا کو دیا تھا اور وہ کسی کو بھی دے سکتی تھی میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کارن تم پر کوئی انگلی اٹھائے یا تم پر کسی قسم کی آنچ آئے۔اور میں سمجھی تھی شاید تم مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے تھے اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

پھر وہ چہکتے ہوئے بولی اور میں اتنا عرصہ خواہ مخواہ خود کو کوستی رہی کہ اگر میں سونیا کے ہاں نہ جاتی تو تم اتنی جلدی واپس نہ چلے جاتے۔دراصل میں سونیا کو اپنی پسند دکھانا چاہتی تھی اس لیے اگلے روز اسے اپنے ساتھ حویلی لائی تھی۔

پسند کے لفظ پر میں چونکا تو میں نے کہا۔خبردار جو آج کے بعد میری روپی کو کبھی کوسا،میرے جواب پر وہ مسکرائی تو میں نے کہا چلو اچھا ہوا تمہاری غلط فہمی تو دُور ہوئی۔میں نے پتا جی سے کہا تھا کہ وہ اس بار گرمیوں میں تمہیں بلوائیں۔انہوں نے تمہیں پتر بھی لکھا تھا۔لیکن تم نے پچھلے ایک ماہ سے ان کے کسی پتر کا جواب کیوں نہیں دیا؟روپا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا،اس لیے کہ وہ مجھے کالج کے پتے پر لکھتے ہوں گے اور میں کالج سے فراغت پا چکا ہوں۔لیکن تمہارے لکھے ہوئے پتر تو انہیں مسلسل ملتے رہتے ہیں اس نے پوچھا تو میں نے کہا،وہ اس لیے کہ میں جہاں بھی ہوتا ہوں مہاراج کو باقاعدگی سے ہر دو ہفتے میں ایک بار ضرور لکھتا ہوں۔

وہ بولی،اگر میں یہاں نہ آتی تو پتا جی سے کہہ کر تمہیں جے پور بلواتی۔میں نے کہا،چلو کم از کم اب تم مجھے بلوانے کی زحمت سے بچ گئی ہو۔اچھا یہ بتاؤ کہ میرے آنے کے بعد تمہاری حویلی میں سانپ آنا بند ہوئے کہ نہیں۔کہنے لگی،تمہارے آنے کے بعد سے اب تک ایک سانپ بھی حویلی سے نہیں نکلا۔اس لیے پتا جی تمہارے گُن گاتے ہیں۔اگر یہ بات ہے تو پھر آج رمیش لاج میں ہرمل کی دھونی کے لیے تیار ہو جاؤ،میں نے کہا تو روپا ہنس کر بولی،لگتا ہے تم جہاں جاتے ہو وہاں ہرمل کی بو اور سانپ لے کر جاتے ہو۔میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا،نہیں سانپ وہاں پہلے سے موجود ہوتے ہیں میں تو بس ہرمل لے کر جاتا ہوں۔سپیرے اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔اور ہاں مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس حویلی میں کسی ایسے نوکر کو جانتی ہو جو مجھے بازار لے جائے؟میں بازار سے ہرمل لانا چاہتا ہوں۔کہنے لگی میں یہاں پہلی بار آئی ہوں اور یہاں کسی نوکر کو نہیں جانتی۔ماتا جی کو نانا کے لچھن نہیں بھاتے تھے اسی کارن نانا اور ماتا جی کی ایک دوسرے سے کبھی نہیں بنی تھی۔میں نانا سے ملنا چاہتی تھی۔ماتا جی کو دس برس بعد میری وجہ سے نانا سے صلح کرنی پڑی۔یہ تو اچھا ہے کہ تم نے باپ بیٹی کو ملوایا ہے اور وہ بھی اس وقت جب رمپا جی کے جانے کے بعد انہیں اپنی بیٹی کی کمی محسوس ہونی تھی میں نے کہا۔رمپا کے اچانک اس طرح چلے جانے سے ان کو بڑا دکھ ہوا ہے۔وہ تو بھگوان کی کرپا تھی کہ ایسے کٹھن وقت پر ماتا جی یہاں تھیں۔اب تو وہ ماتا جی سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ماتا جی ان کی اکلوتی اولاد ہیں اور اب ماتا جی انہیں ہمارے ساتھ ہندوستان واپس آنے کا کہہ رہی ہیں۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو چلو باہر جا کر موہن کو ڈھونڈتے ہیں اور اگر تم بھی چلنا چاہو تو میرے ساتھ بازار چلو۔میں وہاں سے ہرمل لانا چاہتا ہوں۔ہاں میں تمہارے سنگ چلوں گی۔نانا اور ماتا جی ایک دوسرے سے پرانے زمانے کی داستانیں بیان کر رہے ہیں اور میں ان کی راہ میں حائل نہیں رہنا چاہتی۔ہم اس کے کمرے سے نکل کر باہر آئے۔میں نے باہر کھڑے ہوئے نوکروں سے موہن کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا،سرکار آپ ٹھہریں میں ابھی موہن کو بلاتا ہوں۔کچھ دیر بعد وہ موہن کے ساتھ واپس آیا۔موہن مجھے دیکھ کر بولا،سر

آپ اب کیسے ہیں؟ میں نے جواب دیا، روپا جی کی تیمارداری اور تمہاری وجہ سے اب اچھا ہوں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس شہر میں کہیں سے ہرمل ملنے کی توقع ہے؟ کیوں نہیں سر، یہاں تو بہت بڑا مندر ہے۔ یہ مندر مہاراج رمیش کے کھرچ (خرچ) سے چلتا ہے۔ اس مندر میں پنڈت ہر وقت لوبان اور ہرمل کی دھونیاں لگائے رکھتے ہیں وہاں پر کسی سے مل جائے گی۔ مندر میں صرف پنڈت ہی نہیں کئی جوگی، بھکشی اور منتری بھی رہتے ہیں۔ میں نے کہا، اچھا تو پھر ہمیں مندر لے چلو۔ موہن بولا، کیوں نہیں سر، آپ ایک منٹ ٹھہریں میں ابھی گاڑی لے کر آتا ہوں۔

موہن گاڑی لایا تو میں اور روپا پچھلی سیٹ میں بیٹھ گئے۔ مندر رمیش لاج سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مندر کی عمارت عالی شان تھی۔ عالی شان عبادت گاہیں دراصل دیکھنے والوں پر اپنے اوپر دولت سرف کرنے والوں کی دولت کا پرچار زیادہ کرتی ہے۔ بھگوان اگر بڑی بڑی عمارتوں میں ملتے تو رام چندر جی اور مہاتما بدھ کو اپنے اپنے محلوں میں ملتے۔ خدا موسیٰ سے طور کی چٹیل چوٹی پر ہمکلام نہ ہوتا اور محمدؐ کو غارِ حرا جیسی پتھریلی اور بے آب جگہ پر منصبِ پیمبری نہ ملتا۔ ہم موہن کے ساتھ راجہ رمیش کے بنائے ہوئے عالی شان مندر کی عمارت میں داخل ہوئے۔ مندر کی عمارت چار حصوں میں منقسم تھی۔ درمیان والا حصہ پوجا پاٹ کے لیے تھا اور مندر کا صدر دروازہ بھی یہاں تھا۔ دائیں جانب ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جو پجاریوں کے میل جول کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بائیں جانب چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے جو ہر اتوار کے روز علاقے کے بچوں کی مذہبی تعلیم کے لیے وقف تھے۔ مندر کی عمارت کے پیچھے مندر کے پنڈتوں، جوگیوں، منتریوں کی مستقل آماجگاہ تھی۔ موہن ہمیں پچھلے حصے میں لے جاتے ہوئے مجھ سے بولا، سر مہاراج ان کی ہر جرورت (ضرورت) کا کھیال (خیال) رکھتے ہیں اس لیے پنڈتوں کو کچھ دان کرنے کی جرورت نہیں ہے۔ دوسرے حصوں کی نسبت مندر کے اس حصے میں زیادہ چہل پہل تھی۔ شاید لوگ تارکِ دنیا لوگوں سے اپنی اپنی دنیاوی مرادیں مانگنے آئے تھے۔ ہم بھی لوگوں کے ساتھ عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر پنڈت، جوگی اپنے آگے لوبان اور ہرمل کی دھونی لگائے اپنے اپنے چیلوں میں گھرے اپنی اپنی جوت جگائے، اپنی اپنی پوجا پاٹ میں مصروف تھے۔ ہر جوگی کے آگے کچھ لوگ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی میری نظر ہرمل کی دھونی لگائے ہوئے ایک جوگی پر پڑی تو میں غیر ارادی طور پر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے قریب جا کر غور سے دیکھا تو میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ میرے سامنے سیتا رام بیٹھا تھا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، سیتا رام، یہ تم ہو؟۔۔۔تم نے تو۔۔۔تم نے تو کانپور میں مناسہ کے درشن کرنے کے بعد میری باہنوں میں اپنی آتما لوٹا دی تھی۔ سیتا رام نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا، جے پربھو کا نعرہ بلند کیا اور کہا، تلک رام کے بھاگوں پر بھو آوت ہیں۔ پھر میرے ہاتھ پر مناسہ کے ہونٹوں کی مہر چومتے ہوئے کہنے لگا، میں سیتا رام کا جڑواں بھائی تلک رام ہاں، سرکاراں۔ تلک رام تیرے درسن کے کارن پچھلے بیس ورس (ورش) سے یہاں بیٹھا تیری راہ تک رہا تھا۔ میری سرکاراں۔ میں اُس کے اس ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھا۔ غلطی دراصل میری تھی۔ میں اسے سیتا رام سمجھ کر حیرت سے بے قابو ہو گیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ سیتا رام کا جڑواں بھائی تلک رام ہے تو کبھی بھی اسے اپنی جانب متوجہ نہ کرتا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ میں نے موہن اور روپا کی جانب دیکھا تو وہ عجیب مخمصے کے عالم میں کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی تلک رام کو۔ مجھے تو کم از کم کبھی کبھار ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

تلک رام کے اس ردِعمل کی وجہ سے وہاں پر موجود باقی پنڈتوں اور جوگیوں نے تلک رام کی نقل میں میرے ہاتھ پر مناسہ کی مہر کو چومنا شروع کر دیا۔ پھر سب نے ایک ایک کر کے میرے اطراف گھیرا ڈال کر اپنے اپنے سر میرے قدموں میں ڈال دیے۔ تو یہاں بیٹھ بڑی سرکاراں، میں تیرے چرن دھو کر پیاس گا، تلک رام نے اٹھ کر قریب پڑے ہوئے ایک موڑھے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔ جواب سننے سے پہلے ہی اس نے مجھے اپنے قریب پڑے ہوئے ایک موڑھے پر بٹھا دیا یا گرا دیا اور میرے پاؤں سے جوتے اتار دیے۔ پھر اس نے میرے پیر اپنے کشکول میں رکھ کر پاس پڑے ہوئے ایک گھڑے سے پانی نکالا اور میرے پاؤں دھونے لگا۔ پاؤں دھو کر اس نے کشکول اپنے ہاتھ میں لیا اور دھودھن کو کسی آبِ حیات کی طرح غٹا غٹ پینے لگا۔ سیر ہو کر پینے کے بعد اس نے کشکول میں بچے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر گیلا ہاتھ اپنے منہ پر ملا اور باقی پانی دوسرے پنڈتوں کو دیا۔ زم زم یا گنگا جل کی طرح میرے پاؤں کی دھودھن ایک سے دوسرے ہاتھ میں گھونٹ گھونٹ پی جانے لگی۔ پنڈتوں کے بعد وہاں پر موجود عوام نے وہ دھودھن گھونٹ گھونٹ پی۔

گو کہ انجانے میں لیکن اس کھڑاگ میں میں نے ہی خود ہاتھ ڈالا تھا اس لیے اب بھاگنے کا یا پیچھے ہٹنے کا سمے نہیں تھا۔ ایسی حالت میں جتنا کم کہا جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی زبان بالکل بند کر لی تھی اور خاموشی سے تلک رام اور اس کے چیلوں کے علاوہ وہاں پر موجود لوگوں کے تاثرات دیکھتا رہا۔ اس دوران روپا میرے ساتھ چمٹی رہی جبکہ موہن باقی لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر میرے پاؤں کی دھودھن کو کسی پرشاد کی طرح لٹانے میں مصروف تھا۔ دھودھن پینے کے بعد تلک رام نے دوبارہ میرے پاؤں میں جوتے ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر بولا، پچھلے تین جنموں سے سیتا رام بھگوان سے بس دیوی کے درسن (درشن) مانگتے تھا۔ پہلا جنم کھالی (خالی) گیا، دوسرے جنم میں اس نے کھوسبو (خوشبو) سونگھی اور تیسرے جنم میں سرکاراں نے اس کو دیوی کے درسن کروائے۔ تلک رام کا پچھلا جنم کھالی گیا تھا، اس جنم میں اس کی کھوسبو ملے گی، اور تو ہی اس کی کھوسبو لاوے گا سرکاراں۔ اور اگلے جنم میں اس کے درسن ہوویں گے۔ یہ کہہ کر

وہ بے خودی کے عالم میں میرے گرد ناچتے ہوئے مناسہ کی خوشبو کی تکرار کرنے لگا۔ میں نے کہا، تلک رام جی میں اس کی خوشبو کہاں سے لاؤں۔ بڑی سرکاراں وہ تیری بین کی دیوانی ہے۔تو جب بھی بین بجاوے ہے، وہ آوے ہے۔ میں نے بھی تیری بین سنی تھی سرکاراں۔ میں نے حیرت سے پوچھا، تم نے میری بین کہاں سنی تھی تلک رام؟ پنچمی میں سنی تھی سرکاراں، تلک رام بولا۔ کیا تم پنچمی میں تھے؟ میں نے پوچھا۔ نہیں سرکاراں، اکھیاں بند کر کے کاناں سے سنی تھی۔ تو جب بھی بین بجاوے ہے، ساری دھرتی کے پوتر لوگاں سنے ہیں۔

میرے لیے یہ نئی اطلاع تھی کہ مناسہ میری بین کی دیوانی ہے اور میں جب بین بجاتا ہوں تو بین کی آواز دھرتی کے ہر کونے میں موجود مناسہ کے دیوانے سن سکتے ہیں۔ تلک رام کہنے لگا، تو بین بجادے سرکاراں۔ میں نے کہا، اس وقت میرے پاس بین نہیں ہے۔ اس نے اپنے جھولے سے بین نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، پچھلے بیس ورش سے تیرے، بجاون کے کارن یہ بین اپنے جھولے میں رکھی پڑی ہے، سرکارں۔ میں نے سوچا، تلک رام پچھلے بیس برس سے اس سمے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس تلک رام کے لیے بین بجانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ روپا ابھی تک مجھ سے چمٹی محوِ حیرت کھڑی تھی۔ موڑھے سے اٹھ کر میں نے روپا کو اس پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ کسی معمول کی طرح میرا حکم مانتے ہوئے اور بغیر کچھ کہے موڑھے پر بیٹھ گئی تو میں نے تلک رام کے ہاتھوں سے بین لے کر روپا کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے تلک رام سے کہا، تلک رام، میرے قریب بیٹھو۔ تلک رام میرے ٹخنے سے ٹخنہ جوڑ کر بیٹھا تو میں نے آنکھیں بند کیں اور بین بجانے لگا۔ نہ جانے کب تک بین بجتی رہی۔ پھر مناسہ کی خوشبو نے ماحول کو معطر کر دیا اور بین ایک جھٹکے سے میرے منہ سے نکل گئی۔

آنکھیں کھولیں تو سیتا رام میرے سامنے فرش پر پڑا ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ جس کی کھوسبو اتنی سندر ہے وہ کھود (خود) کتنی سندر ہووے گی۔ بھگوان نے میری اس جنم کی آشا تیرے چرنوں کی دھودھن کے صدقے پوری کر دی ہے، سرکاراں۔ اس کے بعد جیون بھر کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ باقی لوگ بھی مندر کے فرش پر اپنے ماتھا ٹکائے ہوئے تھے۔ بین کے جادو سے ماحول کچھ دیر تک یونہی ساکت رہا۔ مناسہ کی خوشبو اب بھی سارے ہال میں بسی ہوئی تھی۔ بین تلک رام کے آگے رکھتے ہوئے میں نے کہا، تری آشا پوری ہو گئی ہے تلک رام جی۔ کل تو رمیش لاج میں ہرل کی دھونی دینے آ جائیو۔ تری کھاطر کوئیں میں کود پڑاں گا سرکاراں، پر تلک رام کل جندہ (زندہ) ہی کہاں رہے گا؟ تلک رام نے جواب دیا۔ نہیں تم زندہ رہو گے تلک رام، تم زندہ رہو گے، میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میرے اٹھتے ہی روپا بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور میں اس کا ہاتھ پکڑے باہر کے دروازے کی جانب بڑھا۔ لیکن ہم اتنے لوگوں کی بھیڑ میں دب کر رہ گئے۔ لوگ دیوانہ وار میری جانب بڑھ کر میرے چرن چھونے لگے، موہن بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میں نے موہن سے چلنے کو کہا۔ بھیڑ سے نکل کر کار تک آنے میں ہمیں خاصا وقت لگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ پنچمی کے دوران نیتو اور میں اکیلے تھے اس لیے میں نیتو کو بات اپنے تک رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ ایک اور بات یہ بھی تھی کہ پنچمی کے بعد ہمارا اپنے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہونا آسان تھا۔ یہاں کا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ موہن ہمارے ساتھ موجود تھا اور مندر میں موجود سب لوگ موہن کو راجہ رمیش کے حوالے سے یقیناً جانتے ہوں گے۔ بات اگر ہم تینوں سے نکل کر رمیش لاج تک نہیں پہنچے گی تو باقی لوگ پہنچا دیں گے۔ اس لیے مجھے روپا بلکہ رمیش لاج کے باقی باسیوں کے کئی سوالوں کے جواب تیار کرنے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ موہن مجھ سے کچھ سوالات کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ لیکن روپا، اس کی ماتا اور باقی لوگوں کی آنکھوں میں سوالات کی بھرمار ہو گی۔ میرے لیے اس سے بہتر کوئی اور راہ نہیں تھی کہ خاموشی اختیار کر کے جتنی جلدی ہو سکے افریقہ سے چلا جاؤں۔

یہاں سے جانے کے خیال پر مجھے جمال کی یاد آئی، نیتو کے بقول اس کے پاس میرا مصر جانے کا ٹکٹ تھا۔ میں نے موہن سے جمال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑے ادب سے کہا، سرکار گھر پہنچ کر آپ کو جمال میاں سے ملا دوں گا۔ روپا اب تک خاموش تھی۔ اس کی خاموشی ہی بھلی تھی کیونکہ میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ ایسے میں ہم رمیش لاج پہنچ گئے۔ موہن نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا، چلئے سرکار میں آپ کو جمال میاں کے دوارے لے جاتا ہوں۔ روپا بھی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ برآمدے سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ موہن باہر ہی کھڑا رہا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو جمال بولا، جی سرکار، وکرم بابو نے آپ کا ٹکٹ بنوانے کو دیا تھا۔ مصر کا ٹکٹ لینے سے پہلے مصر کا ویزہ لگنا ضروری ہوتا ہے۔ آپ کا چونکہ مصر کا ویزہ ابھی تک نہیں لگا اس لیے ٹکٹ بھی نہیں بنا۔ اگر آپ مجھے ابھی اپنا پاسپورٹ دے دیں تو میں سب انتظام کر دوں گا۔ میں نے کہا، اب ویزہ لگوانے میں دیر ہو جائے گی تم وکرم بابو کو اوورسیز کال کر کے بتا دو کہ ویزہ نہ ہونے کی وجہ سے میں مصر آنے کی بجائے یہاں سے ہندوستان واپس چلوں گا۔ یہ سندیسہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ مصر میں میرا انتظار نہ کرتے رہ جائیں۔ اس نے کہا، اچھا جناب۔ میں ان سے ہر شام کاروباری سلسلے میں بات کرتا رہتا ہوں۔ آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔

وہاں سے نکلے تو موہن جا چکا تھا اور میں روپا کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے میں آتے ہی روپا نے میرا بازو پکڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے کہا، روپی جی، مجھ سے کچھ مت پوچھنا کیونکہ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب ابھی تک نہیں ہے۔ جب ہو گا میں تمہیں بتا دوں گا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، چلو نہیں پوچھتی۔ لیکن ایک بات ضرور کہوں گی کہ تم بین کے جادوگر ہو۔ تمہاری بین کا جادو، ہائے رام کیا بتاؤں، سر چڑھ کر بولتا ہے۔

میرے سر پر تو سوار ہو گیا ہے۔ جب تم بین بجا رہے تھے تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے تم یہ بین میرے لیے بجا رہے ہو۔ تم نے میرے لیے ستار چھیڑا تھا اور میں نے تمہارے لیے بین بجائی ہے، میں نے کہا۔ روپا میرے ہونٹوں کے پاس اپنے ہونٹ لہراتے ہوئے بولی، میں چاہتی ہوں کہ اب کے بعد میں صرف تمہارے لیے ستار چھیڑا کروں اور تم بھی بین صرف اور صرف میرے لیے بجایا کرو۔ ان باتوں کے دوران وہ میرے اتنے قریب آ گئی تھی کہ مجھے اس کا دل اپنے سینے میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ میں نے کہا تمہیں شاید اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ تمہیں یہاں دیکھ کر میرے من کو کتنی شانتی ملی تھی۔ سچ، مجھے دیکھ کر شانتی تمہیں ملتی ہے؟ روپا نے مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ کر چوما اور اپنے گال پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔ ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے جواب دیا۔ اور تمہیں دیکھ کر مجھے زندگی ملتی ہے، اس نے جذباتی انداز میں کہتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ روپا کا بدن شدتِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔

برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز آئی تو روپا مجھ سے کچھ دُور ہٹ کر کھڑی ہو کر کہنے لگی، تم اب ہمارے ساتھ کچھ دن اور یہاں رہو گے نا؟ ہاں ابھی تو کچھ دن یہاں ہوں۔ لیکن ایک بات ہے، کبھی کبھار دیوتا مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ اس صورت میں بات میرے بس سے باہر ہو جاتی ہے۔ کہنے لگی، تمہاری اس بات کا اندازہ مجھے آج مندر میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہو گیا ہے۔ اگر کچھ نہ ہوا اور تم یہاں رہے تو تمہاری وجہ سے کم از کم میرا وقت اچھا کٹ جائے گا۔ نانا اور ماتا جی ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پسر میں مصروف ہیں اور میں اکیلی بے مقصد رمیش لاج میں بور ہو کر پھرتی رہتی ہوں۔ تمہاری وجہ سے پچھلے دو روز سے میرا وقت اچھا گزر رہا ہے۔

نیم وا دروازے کے قریب ایک خادمہ نے آ کر ہمیں بتایا کہ مہاراج دوپہر کے کھانے پر ہمیں یاد کر رہے ہیں۔ ہم دونوں جیسے کھڑے تھے ویسے ہی خادمہ کے پیچھے ہو لیے۔ کھانے کی میز پر مہاراج کے ساتھ روپا کی ماتا جی بھی تھیں۔ مہاراج اپنی پہیوں والی کرسی پر سر جھکائے کسی سوچ میں گم تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی پارو جی نے پوچھا، تم دونوں نے آج کا دن کہاں گزارا ہے؟ میں نے جواب دیا، رمیش لاج میں دھونی دینے کے لیے ہرمل لینے مندر گئے تھے۔ میں تلک رام سے کہہ آیا ہوں وہ کل مندر سے آ کر رمیش لاج میں دھونی دے جائے گا اور پھر رمیش لاج میں سانپوں کی آمد ختم ہو جائے گی۔ روپا نے میری جانب دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، بس اتنی مختصر سی بات۔ جواب دینے کی بجائے میں نے اپنی آنکھیں جھکا دیں۔ کھانا کھانے کے بعد میں وہاں سے اٹھا تو روپا بیٹھی رہی۔ وہاں سے اٹھ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر اکیلے بیٹھ کر مراقبہ کروں گا۔ لیکن کمرے میں ابھی پوری طرح سے بیٹھا ہی نہیں تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر جا کر دیکھا تو میرے سامنے رمپا کی ملازمۂ خاص پدمنی کھڑی تھی۔ دروازے سے ہٹ کر میں نے اسے اندر کو کہا۔ پدمنی کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس بھون میں رمپا کی موت کا سب سے زیادہ دکھ پدمنی کو ہوا ہو۔ آپ کیسی ہیں پدمنی جی، میں نے ہولے سے کہا۔ آپ مجھے پہچان گئے رامو بابو، اس نے حیرت سے پوچھا۔ اگر رمپا جی نے تمہارے بارے میں مجھے نہ بتایا ہوتا تو بھی میں تمہیں پہچان لیتا۔ تم رمپا کے ساتھ میرے ہاں سندر بن آئی تھیں۔

جی سرکار! سورگباشی رمپا دیوی، اپنا فقرہ پورا کیے بنا اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر ایک گلاس میں اسے پانی دیتے ہوئے کہا، اسے تم پر بڑا مان تھا پدمنی جی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں اپنی ماتا سمان سمجھتی ہے۔ اچھا جی، انہوں نے آپ کو یہ سب کب بتایا تھا؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔ جانے سے ایک روز پہلے میں نے جواب دیا۔ وہ آپ کی دیوانی تھی، سرکار۔ رات تو رات وہ تو دن میں بھی آپ کے سپنے دیکھا کرتی تھی، پدمنی نے روتے ہوئے کہا۔ ہاں پدمنی جی وہ تمہیں بھی تو چاہتی تھی۔ وہ سب کو چاہتی تھی۔ پدمنی جی، اچھے لوگ جلدی اٹھ جاتے ہیں۔ پر ان کی آتمائیں ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ کاش آپ اسے اس جیون میں ملتے تو کم از کم اس کی آتما کی آگ تو بجھ جاتی۔ ہم اس جیون میں ہی ملے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ میں مرنے والی کی آتما کو ننگا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بات پھیرتے ہوئے کہا، آپ دھیرج رکھیں پدمنی جی، اس کی آتما اب شانتی میں ہے۔ اس نے پیلے پھولوں والے سفید سوتی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا، وہ ہر انیس اپریل کے روز آپ کے ملن کی سالگرہ منا کر آپ کو ایک تحفہ دینے کے لیے میرے پاس رکھوا دیتی تھی۔ ایک بار میں نے اسے پوچھا تھا کہ تم یہ تحفہ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتی ہو تو اس نے جواب دیا تھا اس لیے کہ میں تو اسے دیکھتے ہی اپنی آتما تیاگ دوں گی۔ وہ اپنی بات کی اتنی پکی تھی کہ اس نے آپ سے ملن کے بعد اپنی آتما سچ مچ تیاگ دی۔ اس کے ساتھ ہی پدمنی نے اپنے ہاتھوں میں دبائی ہوئی ہاتھی دانت کی بنی ایک ڈبیا نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا، اس میں آپ کی پیاری نے آپ کے پیار کے تحفے میرے پاس امانت کے طور پر رکھوائے تھے، رامو بابو۔ ڈبیا میرے ہاتھوں پر رکھتے ہی وہ اٹھ کر چلتے ہوئے بولی، اچھا سرکار اب میں جاتی ہوں۔

پدمنی کے جانے کے بعد میں نے ڈبیا کھولی تو اس میں دل کی شکل میں تراشے ہوئے چار بڑے بڑے ہیرے تھے۔ جیسے رمپا سال بھر کانوں سے نکلنے والے ہیروں میں سے بڑا ہیرا میرے لیے چن چن کر ترشوا کر رکھتی رہی تھی۔ ڈبیا اپنے تکیے کے نیچے رکھی اور میرا جی بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں اور وہیں بیٹھ کر چند لمحوں کے لیے رمپا کے پیار میں کھو گیا۔ میری یہ کیفیت نہ جانے کب تک رہتی اگر روپا کمرے میں داخل نہ ہوتی۔ اس نے مجھے یوں اداس بیٹھے دیکھ کر پوچھا، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا، ہاں میں ٹھیک ہی ہوں۔ تو تم پھر اتنے خاموش اور اداس کیوں نظر آ رہے ہو؟ تمہاری

آنکھوں سے لگتا ہے جیسے تم رو رہے تھے، روپا نے میرا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بس کسی خیال نے کچھ اداس کر دیا تھا، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ وہ میرے قریب آ کر بولی تم اپنی ساری اُداسیاں مجھے دے دو۔ تمہیں اداسیاں نہیں خوشیاں ملنی چاہئیں روپی، میں نے جواب دیا۔ تو پھر تم بھی اداس نہ ہویا کرو نا۔ تمہیں اداس دیکھ کر میں بھی اداس ہو جاتی ہوں اس نے جذبات سے میرا گال سہلاتے ہوئے کہا، پھر بولی اور ہاں میں نے جب ماتا جی کو مندر میں پیش آنے والا واقعہ بتایا تو وہ حیران رہ گئیں۔ پھر میری جانب دیکھ کر پوچھا، تم نے برا تو نہیں مانا؟ میں نے جواب دیا، نہیں۔ اتنے لوگوں نے یہ سب کچھ دیکھا تھا، اگر تم نہ بھی بتاتیں تو انہیں کوئی اور بتا دیتا۔ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے کبھی کبھی اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ لوگ بات بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، نہیں میں نے کوئی بات بڑھا چڑھا کے نہیں کہی۔ ماتا جی کو وہی کچھ بتایا ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا، میں نے روپا سے کہا۔

اچھا اب اٹھو اور میرے ساتھ چلو، اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ کہاں؟ میں نے پوچھا۔ مجھے بازار سے کچھ لینا ہے، اس نے جواب دیا۔ چلو، لیکن ایک شرط پر، مجھے کچھ اور نہیں کرنا تھا اس لیے میں نے اپنے کمرے میں نظر بند رہنے کی بجائے باہر جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ کونسی شرط؟ روپا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، تمہاری خریداری میرے ذمے ہوگی۔ اور تمہاری خریداری میرے ذمے، اس نے مسکرا کر اپنے جسم کو میرے جسم سے ٹکراتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مجھے کچھ نہیں لینا تھا اس لیے میں نے کہا چلو منظور۔ رمیش لاج کے صدر دروازے پر پہنچ کر ہم نے موہن کے بارے میں پوچھا، موہن نہیں تھا۔ موہن کے بجائے ایک اور ڈرائیور ہمیں بازار لے گیا۔ بازار میں روپا نے چند ہلکی پھلکی چیزیں خریدیں جن کا بل میں نے ادا کیا۔ روپا بولی، اب مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا لینا ہے۔ میں نے کہا، مجھے آج تو کچھ نہیں لینا، اگر کبھی لینا ہوا تو حسبِ وعدہ تمہیں اس کا بل بھجوا دوں گا۔ وہ بولی، اچھا اگر تمہیں کچھ نہیں لینا تو میں تمہیں اپنی پسند کا کچھ لے کر دیتی ہوں۔ میرے انکار کے باوجود اس نے مجھے ایک ٹائی لے کر دی۔ ہم اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہوئے چند گھنٹوں بعد رمیش لاج پہنچے۔ گاڑی سے اتر کر ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ موہن ہمارے قریب آ کر بولا، راموسرکار، کچھ لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے ملنے کے لیے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ میرا حیران ہونا اس لیے بھی بجا تھا کہ میری معلومات کے مطابق اس پورے ملک میں مجھے گنتی کے لوگ جانتے تھے۔ جی سر، آپ سے ملنے کے لیے، موہن بولا۔ اچھا تم مہمانوں سے ملو، میں اندر جاتی ہوں، روپا یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔

کہاں ہیں وہ؟ میں نے موہن سے پوچھا۔ جی وہ بیٹھک میں آپ کے منتظر ہیں، موہن نے جواب دیا۔ چلو میں اس کے پیچھے چلنے لگا۔ صدر دروازے کے بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ میں موہن کے پیچھے برآمدے سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا جہاں پانچ جوگیوں کی ایک ٹولی مجھے دیکھ کر ہاتھ جوڑے کھڑی ہوگئی۔ ان میں سے ایک نے زرد رنگ کی صاف ستھری چادر اوڑھی تھی۔ وہ ان سب میں بوڑھا تھا، اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا اور اس کی بے تحاشہ بڑھی ہوئی سفید داڑھی اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ اس نے پچھلی کئی دہائیوں سے اپنی داڑھی کے بال نہیں کٹوائے۔ داڑھی بڑھانے کے باوجود صاف ستھرا تھا۔ سانپوں کی دنیا میں رہتے اب تک میرا واسطہ کئی منتریوں، جوگیوں، سنیاسیوں، بھکشوؤں اور نہ جانے کتنی اقسام کے رشیوں سے پڑا تھا۔ ان میں سے اکثر کے جسم اور کپڑوں سے سالوں نہ نہانے کی وجہ سے اتنی ہمک آتی تھی کہ ان کے پاس بیٹھنا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس ان پانچوں جوگیوں کے لباس اور جسم نہ صرف صاف تھے بلکہ ان سے چنبیلی کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ پانچوں نے رسی کے بٹے ہوئے چپل پہنے ہوئے تھے۔ چار سفید پوشوں نے اپنے سروں کے ساتھ اپنے چہرے پر بھی استرا پھیرا ہوا تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا لیکن وہ نہیں بیٹھے۔ زرد پوش میرا ہاتھ پکڑ کر مناسہ کی مہر پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بولا، میرا نام پنچ ہے۔ چلیں سرکاراں، تلک رام کاسے آ گیا ہے۔

''سونا ضروری ہے''

امریکہ کی یونیورسٹی آف وسکانسن کے سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ایک دن کی نیند نہ لینا بھی انسانی دماغ پر منفی اثرات ڈالتی ہے اور جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتی ہے۔ تجربات کے مطابق نیند گئے دنوں کی فالتو معلومات کو صاف کر کے دماغ میں نئی یادوں اور معلومات کی جگہ بناتی ہے۔ سوتے ہوئے چوہوں پر کیے گئے تجربات کے مطابق دماغی خلیات کے درمیان رابطوں (سائنپسس) کے درمیان سکڑاؤ کو نوٹ کیا گیا جو بیداری کے مقابلے میں اٹھارہ فیصد بھنچے ہوئے ملے۔ رات گزرنے کے ساتھ ہمارے دماغ میں موجود روابط اٹھارہ گھنٹے کے مناظر، واقعات اور تجربات سے لبریز ہو جاتے ہیں اور نیند ان رابطوں کو کمزور کر کے دماغ کی جھاڑو کا کام کرتے ہوئے ذہن کو خالی کر دیتی ہے۔ ایک تحقیق نوجوانوں پر کی گئی سات گھنٹے گیمز کھیلانے کے بعد چوبیس گھنٹے مسلسل جگایا گیا تو پتہ چلا کہ ان کے خلیاتی روابط سخت، مضبوط اور معلومات سے بھر گئے ہیں لہٰذا تحقیق سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک دن کی نیند نہ لینا بھی انسانی دماغ پر بہت منفی اثرات ڈالتی ہے۔

کالا بلّا

(ایڈگرایلن پو)

ترجمہ: ابوحماد

(یو ایس اے)

میں جو کچھ حوالہء قلم کرنے جا رہا ہوں اس کے لئے نہ صرف مجھے کسی ستائیش کی تمنا ہے نہ ہی مجھے اس کی امید ہے کہ اس پر کسی کو یقین آئیگا۔ اس لئے کہ ان واقعات پر تو مجھے خود بھی یقین نہیں آتا اور جب میں کچھ سنجیدہ ہو کر عقلی اور منطق طور پر اسکا تجزیہ کرتا ہوں تو میں شک و شبہ میں پڑ جاتا ہوں کہ ایسا کیسے ممکن ہے، مگر یقین کریں ایسا ہوا اور یہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میں حواس باختہ یا پاگل نہیں ہوں، مگر اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ کل میری زندگی کا آخری دن ہے کیونکہ کل مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا میں یہ کہانی سنا کر اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔

میں قدرت کی طرف سے بہت ہی نرم دل اور حساس طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے لوگ مجھے بہت ہی خاکسار اور سب کا درد محسوس کرنے والا فرد سمجھتے تھے۔ خاص طور سے مجھے جانوروں سے بڑی محبت تھی، اسی وجہ سے میں نے بہت سے جانور پالے ہوئے تھے۔ ان میں کتے بلیاں بندر خرگوش اور مور تھے۔ جنہیں میں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ جانوروں سے یہ پیار جوانی میں مزید پختہ ہو گیا۔ جانوروں سے یہی انسیت میری خوشی کا سب سے بڑا سہارا تھی۔ میں جب انہیں کھلاتا، انکو تھپکتا تھا یا ان پر ہاتھ پھیرتا تو مجھے انجانی خوشی میسر ہوتی۔ وہ بھی مجھے اپنی مسکراتی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنی زبان نکال کر میرے ہاتھوں کو چومتے۔ ان کئی قسم کے پالتو جانوروں میں ایک کتا بھی تھا۔ جن لوگوں کو کسی محبت کرنے والے پالتو کتے کا تجربہ ہے تو وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر وفادار ہوتا ہے اور کس شد و مد سے مالک سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ میں جب گھر آتا تو کتا میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور اسقدر میرے آگے پیچھے پھرتا کہ مجھے خوف آتا کہ وہ کہیں میرے پیروں سے کچل نہ جائے۔

میں نے شادی بھی جلدی کی اور مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ میری بیوی بھی جانوروں کے لئے میری ہی جیسی ہمدردی اور لگاؤ رکھتی ہے۔ اس نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اور شاید مجھے خوش کرنے کے لئے گھر میں مزید جانور جمع کر لئے تھے۔ ان میں خرگوش، ایک چھوٹا بندر، گولڈفش، کچھوا، کتا اور ایک بلّا شامل تھا۔ یہ بلّا میری بیوی کہیں سے لیکر آئی تھی۔ بلا دراصل بیحد خوبصورت تھا ہم نے اسکا نام "پلوٹو" رکھدیا تھا۔ یہ مکمل طور پر سیاہ فام تھا۔ اسکی جلد سیاہ ریشمی بالوں سے ڈھکی تھی اور اسکی آنکھیں ہلکی سبز تھیں۔ اسکے علاوہ وہ اسقدر ذہین تھا کہ ہمارے اشارے سمجھتا تھا۔ اسکی ذہانت کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی میری بیوی کہتی کہ مجھے اسکی ذہانت سے ڈر لگتا ہے۔ میں اس پر ہنس پڑتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے کلچر میں یہ روایت مشہور تھی کہ ساری سیاہ فام بلیاں، بلی کے بھیس میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔ مگر یہ بلّا تو خاص طور سے مجھ سے اسقدر محبت کرتا تھا کہ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر میرے آنے کا انتظار کرتا اور میرے آتے ہی میرے پیچھے پیچھے پھرتا اور موقع ملتے ہی اچھل کر میری گود میں بیٹھ جاتا اور پیار سے ہلکے ہلکے غرّاتا رہتا۔ رات کو اگرچہ اسکا چھوٹا سا گدّا تھا اور وہ اسی پر سوتا تھا مگر رات کے کسی پہر وہ چپکے سے میرے لحاف میں گھس جاتا اور میری ٹانگوں کے بیچ لیٹ کر سو جاتا تھا۔ قدرتی طور پر مجھے بھی اس سے اسی قدر لگاؤ ہو گیا تھا۔

اسی طرح کئی سال بیت گئے، شاید مجھ پر بڑھاپا آ رہا تھا یا کوئی اور وجہ تھی کہ میری فطرت میں تبدیلی آ رہی تھی۔ مجھے بات بات پر غصہ آنے لگا تھا میری برداشت کم سے کم ہو گئی تھی اور چھوٹی اور معمولی بات کھلنے لگی تھی۔ اپنی بیوی پر بھی میں بات بے بات برس پڑتا تھا۔ میں اسقدر بدمزاج ہو گیا تھا کہ ایک دن اپنی بیوی پر معمولی بات پر ہاتھ بھی اٹھا بیٹھا، مگر وہ محبت کی ماری اسے بھی سہہ گئی۔ قدرتی بات ہے کہ میرے مزاج میں اس تبدیلی کو میرے گھر کے جانوروں نے بھی محسوس کیا اور مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔

اگرچہ میں اسکا اقرار کرتا ہوں کہ بندر، خرگوش، حتیٰ کہ کتا بھی میری بد مزاجی سے نہ بچ سکے تھے مگر پلوٹو سے اب بھی مجھے پہلے جیسا تو نہیں پھر بھی تھوڑا بہت پیار باقی رہا تھا اور وہ میرے غیض و غضب سے بچا ہوا تھا۔

بڑھتی عمر اور جوڑوں کے درد کے علاوہ میری شخصیت کی منفی تبدیلی میں بڑی وجہ شراب کا بے دریغ استعمال بھی تھا۔ شراب تو انسان کی شخصیت کے لئے سم قاتل ہے مگر اب میں اسکا اسقدر عادی ہو چکا تھا کہ اسکا چھوڑنا بھی محال تھا۔ حالات اسقدر خراب ہو چکے تھے کہ اب تو پلوٹو نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا اور وہ مجھ سے بچ بچ کر چلا کرتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ مجھ سے دور رہے۔ میری بیوی کے پاس تو اسے برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ مگر مجھے پلوٹو کا یہ سلوک اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک مرتبہ جب رات گئے میں شراب خانے سے نشے میں سرشار گھر میں گھسا تو پلوٹو مجھے دیکھتے ہی ڈر کر دور بھاگا، مجھے یہ برا لگا اور میں نے دوڑ کر اسے گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا، اس گھبراہٹ اور خوف میں اس نے ڈر کر میری کلائی پر اپنے دانت گاڑ دئے، بہت ہی معمولی خراش تھی، معلوم نہیں کیا ہوا، اس لمحے، میں غصے سے اپنے حواس کھو بیٹھا، مجھے ایسا لگا کہ انسانی روح جو میری شخصیت کا حصہ تھی وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی اور ایک شیطانی روح میرے جسم میں سرائت کر گئی ہے۔ مجھے کوئی ہوش نہ رہا، میرے جسم کا ہر ریشہ جیسے غصے سے کپکپا رہا ہو، میں نے اسکا سر مضبوطی سے پکڑے رکھا، جیب سے ایک چھوٹا قلمی چاقو نکالا اور اسکی سیدھی آنکھ میں گھسیڑ کر پورا ڈھیلا نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ اسکی ایسی چیخ

نکلی جس سے میرے گھر کے در و دیوار لرز اٹھے۔یقین کریں یہ لکھتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے سخت نفرت محسوس ہورہی ہے اور میرے لئے یہ سب آسان نہیں ہے مگر صبح سے پہلے جب مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائیگا میں سب کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔دوسرے دن جب میں نیند سے بیدار ہوا اور نشہ بھی اتر چکا تھا تو میں اپنی اس ظالمانہ حرکت کی وجہ سے اسقدر شرمندہ ہوا کہ جی چاہتا تھا کسی کو اپنا چہرا نہ دکھاؤں مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔میری بیوی جو ایک بہت ہی ضبط اور برداشت کرنے والی عورت ہے کچھ نہ بولی صرف مجھ سے نظریں چراتی رہی۔

اس کے کچھ دن بعد پلوٹو کی آنکھ کا زخم بھر گیا، اگر چہ آنکھ کا وہ خانہ جہاں کبھی ایک چمکدار سبز موتی جیسی آنکھ تھی اب ایک خالی گڑھا رہ گیا تھا جو نہایت بدشکل لگتا تھا۔اسے اب درد تو نہ تھا مگر وہ میرے قریب جانے پر دہشت سے ایک چیخ مار کر دور بھاگتا تھا۔اس کے اس رویہ پر کبھی مجھے غصہ اور کبھی افسوس ہوتا تھا کہ یہ بلاّ جو کبھی میرا پسندیدہ پالتو جانور تھا اب مجھ سے دور بھاگتا ہے مگر اس بےزبان پر جو خوف اور دہشت طاری تھی اس پر میں اسے کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا۔کبھی کبھی وہ مجھے ذرا دور بیٹھ کر اپنی واحد آنکھ سے گھورتا تو مجھے ایسا لگتا کہ وہ طعنہ دے رہا ہے کہ میری اس حالت کا سبب تم ہو۔میں جس قدر سخت دل اور ظالم ہو چکا تھا اس کے لحاظ سے مجھے اسکی پروا تو نہیں ہونی چاہیئے تھی مگر جانے کیوں اسکے اس طرح اپنی کانی آنکھ سے گھورنے کی وجہ سے مجھے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس ہوتی تھی۔اس کے بعد وہ نہ صرف مجھے گھورنے لگا بلکہ کبھی کبھی غرّانے بھی لگا۔مجھے معلوم تھا کہ اسکے گھورنے یا غرّانے سے وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا مگر کسی وجہ سے اسکی یہ حرکت میرے اعصاب پر سوار ہوگئی اور اسکی اس حرکت سے جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور میں غصے میں اسکی طرف جھپٹتا تھا کہ اسکی گردن مروڑ دوں تا کہ یہ غراہٹ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے مگر وہ نہایت مکاّری سے چھلانگ لگا کر میری پہنچ سے دور ہو جاتا تھا جس سے مجھ پر مزید جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ایک دن کیا ہوا اور میں نے کیا کیا، یہ بتاتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے۔گرچہ میرے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا سوائے اسکے کہ ہر انسان میں ایک شیطان چھپا ہوتا ہے مگر انسانیت، ہمدردی اور اسکی سوچ اس پر حاوی رہتی ہے پر کبھی کبھی بدی نیکی پر حاوی ہو جاتی ہے۔شاید ایسا ہی میرے ساتھ ہوا۔ایک روز پلوٹو اسی طرح فرش پر بیٹھا مجھے اپنی کانی آنکھ سے گھور رہا تھا اور اپنی گردن گھما گھما کر مجھے اپنا وہ چہرہ دکھا رہا تھا جہاں خالی بدصورت گڑھا تھا۔اس کے علاوہ آج اسکی غراہٹ میں بھی غصے اور بے رحمی کا عنصر زیادہ ہی نمایاں تھا۔مجھ پر شیطانیت سوار ہوگئی میں نے جھپٹا مار کر اسکی گردن کو قابو کیا وہ بڑا مچلا مگر میں نے پاس ہی پڑی ایک ریشمی ڈوری سے ایک پھندا بنایا اور اسکے گلے میں ڈالا اور اسے قریبی درخت کی اونچی شاخ پر اس طرح پھینکا کہ وہ گردن کے بل اس پر لٹک گیا۔پھندا گلے میں اس طرح پھنسا کہ اسکی چیخ بھی نہ نکل سکی اور اسکا جسم شاید منٹ سے بھی کم تڑپا اور پھر اسکی بے جان لاش اس شاخ سے لٹک کر جھولنے لگی۔

اسی رات جب میں گہری نیند میں تھا، میں ایک شور سے جاگ اٹھا معلوم ہوا کے میرا گھر آگ کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔بڑی مشکل سے میں اور میری بیوی جان بچا کر بھاگے۔میرا گھر اور میرے تمام اثاثے جل کر راکھ ہو گئے۔ میرے پاس نا امیدی اور مفلوکی کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔مگر میں ایک حقیقت پسند اور جدید خیالات کا انسان ہوں اور میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اس تباہی کی وجہ یہ تھی میں نے اس بلےّ کو اتنے ظلم کے ساتھ ہلاک کیا ہے۔

دوسرے دن میں اپنے جلے ہوئے گھر کا کھنڈر دیکھنے گیا۔تقریبا تمام دیواریں چھت اور فرش جل چکا تھا مگر حیرت تھی کہ ایک دیوار سالم تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ وہ دیوار تھی جسکے سہارے ہمارا بیڈ تھا اور ہمارے بیڈ کا سرہانہ اس دیوار کے ساتھ تھا۔مگر بیڈ اور یہ سرہانہ بھی جل کر خاکستر ہو چکے تھے اور لوگوں کا ایک ہجوم اس دیوار کو تک رہا تھا۔ایسے جملے سننے میں آرہے تھے کہ ''کمال ہے''۔''حیرت ہے'' بھئی یہ کیا ہے'' میں بھی لوگوں کو چیرتا ہوا اس دیوار کے پاس پہنچا، میں نے دیکھا کہ شعلوں اور دھوئیں کے نشان کے درمیان ایک تصویر سی بن گئی تھی۔۔۔ایک تصویر جو ایک بلےّ کی تھی جسکی گردن میں پھانسی کا پھندا اپڑا تھا۔

سچ یہ ہے کہ میں اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکا کہ یہ خاکہ کیسے بن گیا۔مگر پھر مجھے خیال آیا کہ بلےّ کی لاش درخت سے لٹکی تھی اور آگ لگنے پر جب لوگ جمع ہوئے ہونگے تو انہوں نے اس لٹکتی ہوئی لاش کو جلتے ہوئے کمرے میں پھینکا ہوگا اور شاید لاش دیوار سے ٹکرائی ہوگی اور اسطرح اس کے جسم کے خطوط دیوار پر چسپاں ہوگئے، اس لئے میں نے کسی قسم کے بھی وہم کو دل سے نکال دیا۔

میں بھی عجیب ہوں کہ اسقدر ظالمانہ قدم اٹھانے کے باوجود میں کبھی کبھی پلوٹو کو یاد کرتا تھا۔مجھے خیال آتا تھا کہ ایک زمانے میں وہ مجھے بہت پیارا تھا۔آپ مجھ پر ہنسیں گے کہ میں جانوروں کے اسٹور بھی گیا کہ مجھے ویسا ہی سیاہ ریشمی بالوں والا بلاّ مل جائے مگر ایسا بلاّ نظر نہیں آیا آخر کار میں اسکو بھول گیا۔اپنے گھر کے جلنے کے بعد میں اور میری بیوی ایک بوسیدہ سے پرانے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ایک شام جھٹپٹے کے وقت جب دونوں وقت ملتے ہیں میں اپنی سٹڈی میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، گھر میں اندھیرے اور روشنی کے سائے سے بڑھ رہے تھے مجھے لگا کہ میری شراب کی بوتلوں کی الماری کے اوپر کوئی کالی سی چیز چل رہی ہے میں لیمپ اٹھا کر اس کے پاس گیا تو دیکھا کے اس کے اوپر ایک کالا بلاّ بیٹھا ہے۔اسکا فر بالکل سیاہ اور ریشمی تھا اور اسکا قد و قامت بالکل پلوٹو جیسا تھا۔اگر اسکے سینے پر ایک سفید دھبہ نہ ہوتا تو میں اسے پلوٹو ہی سمجھتا خاص طور سے جبکہ حیرانی کے ساتھ میں نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ پلوٹو ہی کی طرح اسکی بھی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی۔میں نے ڈرتے ڈرتے اسکی کمر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے ہلکے سے پیار بھرے انداز سے خرخر کر کے میرے ہاتھ کو چومنے کی کوشش کی۔میں جب واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھا تو وہ کود کر میرے پیروں میں آ کر بیٹھ

گیا اور اپنی کمر میری ٹانگوں سے رگڑنے لگا۔ مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ جلد ہی ہم سے مانوس ہو گیا مگر مجھے ایسا لگا کہ وہ میری بیوی سے مجھ سے کہیں زیادہ مانوس ہے اور اس سے بہت پیار کرنے لگا ہے۔ وہ دن بھر اسکے پیچھے پیچھے پھرتا، رات کو سوتے وقت کود کر اس کے بستر میں گھس جاتا۔ میری بیوی اور اسکے درمیان پیار کا رشتہ بڑھتا گیا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ دودھ کی پیالی میں بھی صرف اس وقت منہ ڈالتا تھا جب میری بیوی اسے چمکار کر دودھ ڈالتی تھی۔ ادھر شروع کے چند دن تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوئی بس کبھی کبھی اسے چمکار لیتا تھا مگر نہ جانے کیوں وقت کے ساتھ مجھے اس سے نفرت سی ہونے لگی۔ اسکی پھوٹی آنکھ مجھے اپنا گناہ اور ظالمانہ حرکت یاد دلاتی تھی۔ وہ پھر بھی مجھ سے محبت کا اظہار کرتا تھا اور اچھل کر میرے سینے پر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے نرم پنجوں سے میرے کرتے کو کھسوٹتا رہتا مگر مجھے یہ سب حرکتیں زہر لگتی تھیں اگر مجھے اپنی ماضی کی ظالمانہ حرکت کا احساس جرم نہ روکے رکھتا تو میں اسے اس دفعہ بھی ہلاک کر دیتا، مگر اسے ہلاک کرنے کا خیال میرے دل میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کیونکہ اسکا چہرہ مجھے اپنا جرم یاد دلاتا تھا کہ کس طرح میں نے ایک بے زبان جانور کو صرف اپنے غیظ و غضب اور شراب کے نشے میں مار ڈالا تھا۔ میں اس خیال سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے یہ یاد دلائے مگر یہ کم بخت بلاّ جو پلوٹو کا روپ تھا مجھے بھولنے نہیں دیتا تھا۔

ایک دن میں اور میری بیوی کچھ لینے کے لئے اپنے گھر کے تہہ خانے میں اتر رہے تھے، یہ تہہ خانہ بوسیدہ، تاریک اور نم تھا مگر ہماری غریبی کی وجہ سے ہم اس سے بہتر تہہ خانے والے گھر کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ یہ منحوس بلاّ مستقل میرے پیروں میں لپٹ جاتا تھا اور میں سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچتا تھا میری بیوی، اف میری صابر اور وفا شعار بیوی جو میری تمام برائیاں اور بے وجہ غصہ برداشت کر لیتی تھی میرے ساتھ ساتھ تھی کہ یہ بلاّ اس طرح مجھ سے الجھا کے میں سر کے بل نیچے کرتا اور اپنی گردن توڑ لیتا۔ میں سنبھل تو گیا مگر یہ میری برداشت کی حد تھی میں نے طیش میں آ کر دیوار میں ٹنگی کلہاڑی اٹھائی اور گھما کر اس بلّے کے سر پر ماری مگر افسوس، صد افسوس میری بیوی اس بلّے کو بچانے کے لئے بیچ میں آ گئی اور بلاّ جھکائی دے کر بچ نکلا، کلہاڑی کا پھل میری بیوی کی کھوپڑی کے عین بیچ میں پڑا اور اسکی کھوپڑی کسی تربوز کی طرح دو حصوں میں بٹ گئی وہ بغیر آواز کے بے جان ہو کر زمین پر گری۔۔۔جی ہاں بے جان، مردہ۔۔۔میں نے اسے قتل کر دیا تھا۔

جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ اب مجھے یہ سوچنا تھا کہ اس قتل کو کیسے چھپاؤں، اس لاش کو کیسے ٹھکانے لگاؤں۔ میں نے کئی طریقے سوچے۔ یہ تو یقینی تھا کہ دن یا رات میں میں لاش کو گھر سے نہیں نکال سکتا تھا، میں نے سوچا کہ اسکے کئی ٹکڑے کر کے اسے کسی بڑے کھوکے میں بند کر کے کسی مزدور کے ذریعے کہیں دور لے جاؤں مگر اس میں بھی خطرہ تھا۔ زمین میں قبر بنا کر دفن کرنا نہ صرف دشوار تھا کہ فرش سخت پتھر کا تھا اور کوئی بھی اس کا اندازہ لگا سکتا تھا کہ فرش کی کھدائی کی گئی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ قدیم زمانے میں چرچ کے پادری اپنے دشمنوں کو تہہ خانے میں بنے طاقوں میں چنوا دیا کرتے تھے جس سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے تہہ خانے میں بھی ایک طاق بنا تھا۔ میں نے اس طاق کے سامنے سے اینٹیں ہٹائیں، بیوی کی لاش کو سیدھا کھڑا کر کے اسمیں فٹ کیا، اسکے سامنے دوبارہ اینٹیں جڑیں اور پھر اس چالاکی سے پلاسٹر تیار کیا کہ وہ پرانے پلاسٹر سے میل کھا لے اور دیوار برابر کر دی۔

دیوار کو کئی طرح سے جانچا اور مطمئن ہو گیا کہ کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اب میرا اگلا کام یہ تھا کہ اس کمبخت اور منحوس بلّے کو تلاش کروں جس کی وجہ سے مجھ پر یہ آفت ٹوٹی تھی تا کہ میں اسے جہنم واصل کروں۔ مگر کوشش اور تلاش بسیار کے باوجود وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں نے سمجھ لیا کہ وہ دہشت کی وجہ سے یا تو کہیں چھپ گیا ہے یا موقع پا کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ میں نے سونے سے پہلے نیچے جا کر ایک بار پھر تہہ خانے کی دیوار کو دیکھا جو میں نے اس قدر صفائی سے مرمت کی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی اسکو دیکھ کر کسی شبہ کا اظہار کرے۔ سچ کہوں، مجھے اپنی مشاقی پر رشک ہوا۔ اسی وجہ سے مجھے اس رات ایسی میٹھی اور پرسکون نیند آئی جو کئی دنوں سے نہیں آئی تھی۔

دوسرے دن میری بیوی کے نظر نہ آنے پر معمولی سی تفتیش ہوئی مگر پھر جیسے یہ معاملہ بھلا دیا گیا۔ تیسری صبح پولس کی ایک پارٹی آئی گھر کی پہلی منزل کے بعد وہ تہہ خانے میں اترے اور چل پھر کر کونہ کونہ دیکھا، میں مکمل اطمنان سے ان کے ساتھ ساتھ رہا اور انکے سوالوں کے، جو معمولی سے تھے مسکرا کر جواب دیتا رہا۔ اس تفتیش کے دوران میں اپنے دونو ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا مسکراتا رہا۔ جب وہ واپس جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگے تو میں نے بڑے فخر سے کہا، جناب یہ گھر اس زمانے میں بنا تھا جب تعمیر بہت ہی مضبوط اور پائدار ہوتی تھی۔ وہ بھی مسکرا کر مجھ سے اتفاق کرنے لگے، جانے پھر کیا ہوا میں اپنی کامیابی کے نشے میں قابو سے باہر ہو گیا اور پاس ہی پڑے ایک مضبوط ڈنڈے کو اٹھا کر طاق کی بیرونی دیوار پر، جس پر میں نے بڑا مضبوط پلاسٹر کیا تھا دو دفعہ مارا اور پولس والوں کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھا؟"۔ شاید ایک یا دو منٹ کچھ بھی نہیں ہوا مگر پھر دیوار کے پیچھے سے ایک آواز آئی ایک ایسی آواز جس نے میرا خون منجمد کر دیا، پولس والے بھی وہیں ٹھٹک کر رہ گئے مگر پھر یکے بعد دیگرے ایسی آوازیں آئیں جیسی کوئی جانور کسی شکنجے میں پھنس کر تکلیف میں دہائی دیتا ہے۔ یہ آوازیں ناقابل برداشت تھیں۔ پولس والے واپس آئے اور قریب پڑے کدال سے دیوار کو توڑنے لگے۔ چند اینٹوں کے گرنے کے بعد دیوار ڈھے گئی اور میری بیوی کی لاش جسے میں نے سیدھا کھڑا کیا تھا گر کر میرے کندھوں پر جھول گئی اور اسکے ساتھ ہی کالے بلّے کی لاش بھی زمین پر گری۔۔۔اس کی بے جان کانی آنکھ مجھے تک رہی تھی۔ میں نے جلد بازی میں بیوی کے ساتھ اس بلّے کو بھی دیوار میں چن دیا تھا۔۔۔

(زیر نظر کہانی ۱۸۲۲ میں لکھی گئی)

داؤد کا چاند

رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

جس کی نظموں میں پنجاب کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہے، جس کی غزلوں میں جائے پیدائش سے بچھڑنے کا درد کبھی لہو بن کر ٹپکتا ہے تو کبھی اُس کی یادیں بادِنسیم بن کر اُس کے وجود کو اپنی محبت کی اوس سے تر بہ تر کر دیتی ہے، جس کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں زندگی کے فلسفے کا ذائقہ چکھاتی ہیں تو کبھی حقیقت کو بے نقاب کرتی ہیں، جس کی کہانیوں میں رشتوں کی مہک ہے، جس کی کہانیوں میں پنجاب کی روداد، چاشنی جا بجا اُس کے پنجابی ہونے کی گواہی دیتے ہیں، جس کی تحریر کے الفاظ سادے اور معنی گہرے ہوتے ہیں اُس ادیب کو دنیا رتن سنگھ کے نام سے جانتی ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس عہد کے نامور ادیب جس نے اپنے فن پاروں سے اُردو اور پنجابی ادب کے دامن کو یکساں طور پر مالا مال کر دیا اُن کے حلقۂ کرم میں ہم بھی شامل ہیں۔

حلقۂ کرم سے مراد یہ ہے کہ ستائش بھی دل کھول کر کرتے ہیں اور خامیوں کی نشان دہی بھی کھلے ڈُلے انداز میں کرتے ہیں۔ سچے ادیب اور رہنما کی یہ ہی تو خوبیاں ہیں۔ اُن کی زندگی کے تجربات، گہرے مشاہدے، بے لوث تنقید، بے لاگ رائے کا ہم نے بھی خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

رتن سنگھ جی کے پاس قصوں کی پٹاری لبالب بھری پڑی ہے۔ جب جب اُن سے ملاقات کا موقع ملا تو ہم نے بھی بنا موقع گنوائے اُس پٹاری کا منہ کھلوا ہی لیا اور اُن کی زندگی سے جڑے قصے، کہانیاں اور چٹکلے اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔ اگر آپ بھی ان قصوں، کہانیوں، چٹکلوں میں دلچسپی رکھتے ہیں تو ہم آپ کو حصہ دار بنانے کو تیار ہیں۔

رتن سنگھ جی کا شمار اُردو ادب کی دنیا میں Living Legend میں کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ۱۵۔نومبر ۱۹۲۷ء میں قصبہ داؤد تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ میں آنکھیں کھولیں جب ملک غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ داؤد کی مٹی میں کھیل کود کر جوان ہوئے۔ زندگی جینے کا سلیقہ اسی مٹی سے سیکھا۔ جب آنکھ کھولی تو دو دادیوں کی شفقت نصیب ہوئی۔ دونوں جوانی میں ہی بیوہ ہو چکی تھیں۔ ایک اَن پڑھ تو دوسری کو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ نظر کمزور ہونے کے باعث وہ پڑھ نہیں پاتی تھیں۔ لہٰذا جب رتن سنگھ جی پڑھنے لکھنے کی عمر میں پہنچے تو دادی کو قصے کہانیاں پڑھ کر سناتے۔ پورن بھگت، وارث شاہ، قادر یار، پیلو دمودر، شاہ محمد، سسی پنوں، سات آٹھ سال کی عمر میں ہی پڑھ ڈالے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ادب کا تخم کم سنی میں ہی اُن کے خمیر میں پڑ گیا تھا۔

داؤد کی گلیوں میں ہم جولیوں کے ساتھ گُلی ڈنڈا، کھڈو کھُنڈی، آنکھ مچولی (جیسے پنجاب میں لُکن مٹی کہتے ہیں) کھیل کر بچپن گزارا۔ دادی کھانے پلانے میں پورا چاؤ کرتی مگر دیکھتی گہری نظر سے تھی۔ دیا جلنے سے پہلے اگر گھر نہ لوٹتے تو دادی خاطر داری بھی اچھی طرح سے کرتی۔ بچپن سے ہی شرارتی تھے۔ گھر کے باہر دوستوں کے ساتھ اور گھر میں دادی کے ساتھ شرارتیں ہوتیں۔

ایک مرتبہ دادی نے دیسی گھی میں بیسن کے لڈو بنائے اور اُن کو الگ سے دے کر باقی مٹی کی کوٹھری میں تالے میں رکھ دئے۔ اپنے حصّے کے لڈو کھانے کے بعد اُن کی نظر باقی لڈوؤں پر تھی۔ چابی ہاتھ لگتے ہی لڈوؤں پر ہاتھ صاف ہونے لگے۔ دادی اس بات سے پریشان کہ بچے کو بھوک نہیں لگ رہی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھاتا۔ ایک روز پریشان حالت میں دادی دوائی دلوانے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ حقیقت تو اُس وقت کھُلی جب گھر پر مہمان آئے ہوئے تھے اور دادی نے اُنہیں لڈو کھلانے کے ارادے سے تالا کھولا تو وہاں سارے لڈو صفا چٹ ہو چکے تھے۔

رتن سنگھ جی کا بچپن دادی یا نانا نانی کے ساتھ ہی گزرا۔ اُن کے والدین لاہور میں رہتے تھے اور اُن سے ملاقات چھٹیوں میں ہی ہوتی تھی۔ رتن سنگھ جی کے تین بھائی اور بھی تھے اور اُن کا نمبر دوسرا تھا۔ تینوں بھائی اُنہیں خود سے کم تر سمجھتے تھے اور ''پینڈو'' کہتے تھے۔ جب بھی اُن سے چھٹیوں میں ملتے تو انہیں کہیں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے۔

ایک مرتبہ چھٹیوں میں وہ دادی کے سنگ ماں باپ کو ملنے لاہور گئے۔ اُس وقت اُن کی عمر پانچ چھے سال رہی ہوگی۔ ماں سے ملنے اُس سے لپٹنے کی چاہ میں دادی کو پیچھے چھوڑ گھر کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ بوڑھی دادی گٹھری اٹھائے دھیرے دھیرے پیچھے آ رہی تھی۔ جب وہ ماں کے سامنے پہنچے تو ماں اُنہیں پہچان نہ پائی۔ وہ سمجھی گلی مُحلے کا کوئی لڑکا ہے اور اُن کے بیٹوں کو ملنے آیا ہے۔ اور اُن کی بانہیں جو ماں سے لپٹنے کے لیے کھُلی تھیں وہ کھُلی ہی رہ گئیں۔ اس تشنگی کا احساس اُنہیں عمر بھر رہا۔

ساتویں جماعت میں وہ نانی کے پاس ڈیرہ بابا نانک آگے کی پڑھائی کے لیے چلے گئے اور دسویں تک وہیں رہے۔ اُن کے ایک ماما جسونت سنگھ راہی، پنجابی کے انقلابی شاعر تھے۔ اُن کو اسٹیج پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ رتن سنگھ جی اُن کی نظمیں گردوارے میں جا کر پڑھتے اور اکثر انعام یا میڈل خود بٹور کر لے آتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی ہوگی۔

انیس بیس سال کی عمر میں پہنچے تو مولوی برکت علی نے زبردستی اُنہیں ریلوے میں کلرکی کے امتحان میں بٹھا دیا۔ امتحان پاس کرتے ہی ریلوے میں ملازمت مل گئی۔ ابھی دو تین ماہ ہی ہوئے تھے ملازمت کرتے کہ ملک کا بٹوارا ہو گیا۔ حالات بگڑنے لگے تو گاؤں کے نمبردار مُراد علی نے سب کو اکٹھا کر کے دوسروں کے ہمراہ راوی تک پہنچا دیا جو گاؤں سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر

تھا۔سب سے پہلے اُن لوگوں کو کشتی میں سوار کرایا اور اس طرح وہ گاؤں ہمیشہ کے لیے اُن سے چھوٹ گیا۔اپنی مٹی سے جدا ہو کر بھی وہ عمر بھر اُس سے جڑے رہے جس کی خوشبو اُن کی تحریروں کو آج بھی مہکاتی ہے۔

ہندوستان آنے کے بعد ڈیرہ بابا نانک اپنے ننھیال میں کچھ دن قیام کیا اور اس کے بعد کچھ مہینے کی گئی ریلوے کی نوکری کے بنا پر روزی روٹی کا جگاڑ ہو گیا۔دوبارہ ریلوے میں ملازمت ملی اور سارا کنبہ لکھنؤ دو کمرے کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔بڑے بھائی کی ملازمت گجرات میں تھی وہ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر پر اسّی (۸۰) روپے بھیجتے تھے۔گھر کی ساری ذمہ داری ان پر آن پڑی۔اُن کی تنخواہ اور بھائی کے بھیجے پیسے سے بیس افراد کا خرچ کھینچ تان کر پورا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ رتن سنگھ جی اپنے بڑے بھائی کے پاس گجرات گئے۔ سمندر کے ساحل پر گھومتے،لہروں کی اٹھکیلیاں دیکھتے،سرشاری سی طاری ہو گئی۔ کچھ گنگنانے کی خواہش جاگی مگر لبوں پر پُرانے گیت اور اشعار جو سالوں پہلے وارث شاہ،قادر یار پڑھ کر زبانی یاد تھے،وہ خلاؤں میں گم ہو گئے۔کوشش کر کے اُنہیں پکڑنا چاہا تو کچھ ہاتھ نہ لگا۔خواہش نے زور پکڑا،بے کلی بڑھی تو کسی غیبی طاقت نے ایک دعائیہ نظم اُن سے کہلوا ڈالی۔اُس دن پہلی پنجابی نظم وجود میں آئی۔اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔مختلف پنجابی رسائل میں نظمیں چھپتی رہیں۔ ایک پنجابی گیت کسی رسالے میں پڑھ کر پنجابی کے نامی گرامی ادیب پروفیسر موہن سنگھ نے نہ صرف خوبصورت گیت تحریر کرنے کے لیے بدھائی دی بلکہ شکریہ بھی کہا۔وہ گیت کچھ یوں تھا:

آئی ملن دی رات
بُلیاں اُتے کمبنی لے کے
نیناں وچ برسات
آئی ملن دی رات

جُگا لمبی پریت اساڈی
جُگا لمبی اڈیک اساڈی
برہوں کٹھے سمیاں پچھوں
اک پیاری جھاٹ
آئی ملن دی رات

عشق تے روپ نے پاگلو کڑی
ہکوی دے نال لا کے ہکڑی
اک دوجے نوں بخشیاں کیتی
ہنجواں دی سوغات
آئی ملن دی رات

انگاں دے وچ پیار دی تھرکن
دو دلاں دی مل گئی دھڑکن
دو جنداں حل آلو ہوئیاں
پورن رسک ملاپ
آئی ملن دی رات
ارماناں دے دیپ جلائی
وصلاں والی رات اے آئی
اج نہ ککڑ بانگاں دیوے
نہ ہووے پربھات
آئی ملن دی رات

لکھنؤ ریلوے کے دفتر میں ایک روز اُن کی ملاقات نامور افسانہ نگار رام لعل جی سے ہو گئی۔رام لعل بھی ریلوے میں ملازم تھے بعد میں اُن کے ہم سایہ بھی رہے۔ایک روز رام لعل جی کو اپنی پنجابی نظم سنائی جس کا عنوان تھا''سفنے والی دھرتی''اور بول اس طرح تھے:

اک دھرتی میرے سُفنے اندر
کدی کدی آ جاندی
جس دی مٹھی اک دید توں
روح میری نشیاندی

نظم سنتے ہی وہ کہہ اٹھے:

''یہ نظم تو پوری کہانی ہے۔تم اُردو میں کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟''

پھر وہ ہی اُنہیں ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں لے گئے۔اس طرح خالص پنجابی شاعر نے اردو افسانہ نگاری میں اپنا پہلا قدم رکھا۔

پہلی کہانی''ممی تم اک دیوار ہو''رسالہ''راہی''میں چھپی جو جالندھر سے نکلتا تھا۔

لکھنؤ کا ادبی ماحول بڑا ساز گار تھا۔مہینے میں دو بار مصنفین کبھی جناب آل احمد سرور یا احتشام حسین صاحب کے گھر جمع ہوتے۔صرف ایک کہانی اور ایک نظم پڑھی جاتی اور اس پر کھل کر بات ہوتی۔اس محفل میں شامل مصنفین حیات اللہ انصاری،علی عباس حسینی،ڈاکٹر محمد حسین،ڈاکٹر قمر رئیس،شارب ردولوی،شمیم نکہت،قاضی عبدالستار،قیصر تمکین،عابد سہیل،اقبال مجید،حسن عابد،سبط اختر،نجم الحسن،بشیشر پردیپ،احمد جمال پاشا،رضیہ آپا،جناب سجاد ظہیر۔رام لعل کی صحبت بڑی کارگر ثابت ہوئی۔بقول رتن سنگھ جی:

''ان سب نے مل کر داؤد کے دیہاتی کو کہانی کار بنا دیا''

ایک بار جو اس راستے پر قدم رکھا تو پھر انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

رتن سنگھ جی کی کہانی ''حادثہ'' پڑھ کر راہی معصوم رضا نے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔شاید اس لیے کہ وہ پہلی کہانی تھی جو کھیل کے موضوع پر لکھی گئی۔

رفتہ رفتہ پنجابی شاعری کم ہوتی گئی اور اردو افسانوں میں اضافہ ہوتا گیا۔اکثر جب وہ امرتا پریتم کو رسالہ ''ناگ منی'' کے لیے نظم بھیجتے تو نظم کے ساتھ ساتھ وہ پنجابی کہانی کی فرمائش کرتیں مگر پنجابی کہانی ۲۰۰۰ء کے بعد ہی لکھنی شروع کی۔

بے شک انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز پنجابی شاعری سے کیا، پنجابی کی کہانیاں بھی لکھیں،لوک گیت، دوہے بھی لکھے مگر وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو اردو ادب میں اُنہیں حاصل ہے۔پنجابی والوں نے اُن پر اُردو ادیب کی مہر لگا دی ہے۔ابتدا انہوں نے اردو افسانے سے کی اور پھر ڈرامہ، ناول، ترجمہ، شاعری، تنقید، دوہے، بچوں کے ادب پر بھی طبع آزمائی کی۔

ان کا اندازِ بیان اور اسلوب منفرد ہے۔اپنی بات کے لیے علامت و تمثیل کا سہارا لیتے ہیں۔زندگی کی حقیقت، رشتوں کی اہمیت اور زندگی کا فلسفہ اُن کے افسانوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔دلچسپ بیانیہ، طرزِ اظہار، اختصار، اپنی بات کو مختصر کہنے کے فن میں ماہر، افسانے میں طوالت اور زیادہ کرداروں میں یقین نہیں رکھتے۔ پنجابی رنگ، پنجابی تہذیب، پنجابی محاورے، لوک گیت، پنجابی الفاظ کی چاشنی اُن کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہے۔

اب تک اُن کی چالیس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سے تیرہ (۱۳) پنجابی، تین (۳) ہندی، پندرہ (۱۵) اردو کی ہیں۔ان میں ناول، افسانے، تراجم بھی شامل ہیں۔

اردو ادب کی خدمات کے لیے انہیں بے شمار اہم ایوارڈز سے نوازا گیا۔ بھاشا وبھاگ پنجاب کا شرومنی اردو ساہتیہ کار ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ، قطر ایوارڈ، صوفی ایوارڈ، کیفی اعظمی ایوارڈ، اقبال ایوارڈ، عابد سہیل میموریل ایوارڈ نمایاں ہیں۔اس کے علاوہ ان کی کتابوں کو یوپی، مدھیہ پردیش، پنجاب، دلّی اردو اکیڈمی سے بھی ایوارڈ مل چکے ہیں۔گجرات، مہاراشٹر، NCERT کی جانب سے نصاب میں کہانیاں شامل کی گئیں ہیں۔اردو اکیڈمی دلّی نے ۲۰۱۰ء میں انہیں Fellowship سے نوازا۔

رتن سنگھ جی کی کہانیاں انگریزی، روسی، مراٹھی، گجراتی، تیلگو، ہندی، پنجابی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ لکھنے کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری ہے۔عموماً ادیب ایک عمر کے بعد تھک کر قلم کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں مگر بڑھتا وقت رتن جی کے حوصلے پست نہیں کر سکا۔حال ہی میں انہوں نے شری گرو گرنتھ صاحب جی کا پنجابی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو منظر عام پر جلد ہی جلوہ افروز ہوگا۔

رتن سنگھ جی آج جس بلند مقام پر کھڑے ہیں وہ شاید ممکن نہ ہوتا اگر رگھبیر کور کا ساتھ اُنہیں نصیب نہ ہوتا۔ان کی شادی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ بڑے بھائی کی شادی کو کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ ایک روز بھابی کو کپڑے دھوتے اُن کی پتلون کی جیب سے خوبصورت رنگین خوشبودار رومال مل گیا۔شام کو سیر کے بہانے وہ انہیں ساتھ لے گئیں اور رومال کے متعلق پوچھ تاچھ شروع کر دی۔ اُنہوں نے رومال دیکھتے ہی بتا دیا کہ مجھے کہیں گرا ملا تھا اچھا لگا میں نے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔مگر وہ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئیں اور پانچ سات دنوں میں ہی اپنی کزن سے اُن کا رشتہ پکا کرا دیا۔

۱۹۵۲ء میں اُن کی شادی اپنے سے دو سال چھوٹی رگھبیر کور سے ہوئی جسے اُن کی ہی طرح پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔پہلی اولاد بیٹی ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔دو بیٹے اور دو بیٹیوں نے اُن کی گھر گرہستی کو مکمل بنا دیا۔

اُنہوں نے ملازمت بطور کلرک ریلوے میں شروع کی تھی۔اُس وقت تک وہ صرف میٹرک پاس تھے۔شادی کے بعد انہوں نے پھر سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔بیوی نے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے کر اُنہیں ان ذمہ داریوں سے فارغ کر کے پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔۱۹۶۰ء میں انہوں نے پندرہ سالوں کے وقفے کے بعد بی۔اے پاس کیا۔پھر وہ UPSC کے امتحان میں بیٹھے۔امتحان پاس کر کے جب وہ انٹرویو کے لیے گئے تو UPSC کے صدر سردار سروپ سنگھ بھی وہاں موجود تھے۔اُن کے نام اور کام سے وہ پہلے سے واقف تھے۔انٹرویو کے دوران وہ صرف اُن کی کہانیوں پر ہی گفتگو کرتے رہے۔آل انڈیا ریڈیو میں انتخاب ہو گیا۔موقع بہ موقع ترقی ملتی رہی۔مختلف اسٹیشن پر تبادلہ بھی ہوتا رہا اور آخر میں سری نگر سے بطور سٹیشن ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

رتن سنگھ جی خوش قسمت ہیں کہ اُن کی شریکِ حیات نے ہر قدم پر اُن کا ساتھ دیا۔کندھے سے کندھا ملا کر اُن کے ہمراہ چلیں۔آج بھی ادبی پروگراموں میں اُن کے ساتھ جاتی ہیں۔جب کسی وجہ سے وہ کئی کئی دن قلم کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے تو وہ قلم کاغذ اُن کے سامنے لا کر رکھ دیتی تھیں کیونکہ وہ اُن کی بے چین طبیعت کو بھانپ لیتی تھیں جس کا شاید خود اُنہیں بھی علم نہیں ہوتا۔شوہر کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ادبی حلقے سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ خاص طور سے خواتین قلمکاروں سے اُن کے اچھے مراسم ہیں۔رتن سنگھ جی نے ادبی زندگی شروع کرتے ہوئے خود سے ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے کردار کو کبھی داغدار نہیں ہونے دیں گے۔اسی اصول پر چلتے ہوئے وہ کبھی کسی خاتون قلمکار سے اکیلے نہیں ملے۔جن کے ساتھ بھی مراسم رکھے فیملی تعلقات رکھے۔اُن کے نزدیک دنیا کی سب سے خوبصورت عورت اُن کی اہلیہ ہے جس نے زندگی کے ہر موڑ پر، ہر مشکل میں اُن کا ساتھ دیا اور آج بھی دے رہی ہیں۔صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اُن کی کامیابی کے پیچھے اُن کی سب سے خوبصورت عورت رگھبیر کور کا ہاتھ ہے۔

سالہا سال بیت گئے داؤد سے بچھڑے ہوئے مگر اُس زمین کی

باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ کیجیے

اسٹروک

ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

کئی سال قبل مسیح یونان کے مشہور زمانہ حکیم سقراط نے پہلے پہل اس کا مشاہدہ کیا کہ کچھ افراد پر اچانک شدید سر درد کے ساتھ فالج کا حملہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ان پر بے ہوشی طاری ہوجاتی ہےاور اگر اس اچانک حملے کے دوران انکی موت واقع نہ ہوجائے تو پھر وہ عمر بھر کے لئے مفلوج ہو کر اپاہج ہو جاتے ہیں۔

کئی صدیاں گذرنے کے بعد بھی اسٹروک صحت عامہ کا ایک اہم مسئلہ ہے اور طبی سائینس کی محیرالعقول ترقی کے باوجود اسٹروک کے نتیجہ میں ہو نے والے فالج کا کوئی تسلی بخش علاج نہیں۔اگر چہ اس کے تدارک میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے مگر عالمی طور پر اسٹروک اب بھی اموات کا دوسرا بڑا سبب ہے۔

اسٹروک کیا ہے

ہمارے جسم کی تمام حرکات کی وجہ عضلات (muscles) کا سکڑنا اور پھیلنا ہے اسکی مثال یہ ہے کہ جب ہم چائے کی پیالی اپنے منہہ تک لے کر جاتے ہیں تو کہنی سے منسلک اعصاب سکڑتے ہیں جس سے یہ کام انجام کو پہنچتا ہے۔ان عضلات کو سکڑنے اور پھیلنے کا حکم دماغ سے ملتا ہے۔دماغ اور حرام مغز کی بتی سے بجلی کے تاروں کی طرح اعصاب کے ریشے نکلتے ہیں جو عضلات تک پہنچتے ہیں۔دماغ سے بجلی کی روان ریشوں سے گذرتی ہوئی عضلات تک پہنچتی ہے جو ان عضلات کے سکڑنے کا باعث ہوتی ہے۔اگر چہ دماغ کی کئی بیماریاں اس نظام میں رکاوٹ ڈال کر عضلات کو مفلوج کر سکتی ہیں مگر یہ فالج رفتہ رفتہ یا بتدریج ہوتا ہے۔اسٹروک کی تعریف یہ ہے کہ یہ بیحد اچانک اور بڑی حد تک ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ دماغ میں خون کی ترسیل میں اچانک رکاوٹ پیدا ہوجائے۔اسی لئے اب امریکا میں ہارٹ اٹیک کی طرز پر عوام کی آگاہی کے لئے اسے brain attack کہا جارہا ہے۔

خون کی ترسیل میں رکاوٹ، جو دماغ کے کام کرنے کی صلاحیت کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے تین وجوہات کی بنا پر ممکن ہے۔پہلی یہ کہ خون کا کوئی لوتھڑا جسم کے کسی اور حصے سے بہتا ہوا دماغ کی کسی شریان (artery) میں پھنس جائے جس سے یہ شریان بند ہوجاتی ہے اور دماغ کا وہ حصہ جسکی غزائیت کا انحصار اس شریان پر ہے بے جان ہوجاتا ہے۔اسکی وجہ سے متعلقہ عضو مفلوج ہوجاتا ہے اسے ڈاکٹری زبان میں embolus کہتے ہیں۔شریان بند ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کولیسٹرول کی زیادتی کی وجہ سے شریان کی اندرونی نالی میں ایک کھرنڈ سا بننا شروع ہوجاتا ہے جس سے یہ نالی تنگ ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ یہ مکمل طور بند ہوجاتی ہے اسے ڈاکٹری کی زبان میں thrombosis کہا جاتا ہے۔اسکی تیسری وجہ خون کے دباؤ میں زیادتی کی وجہ سے شریان کا پھٹ جانا ہے جس سے دماغ میں اندرونی جریان خون ہوجاتا ہے۔

اسٹروک کی وجوہات

اسٹروک کی وجوہات میں کئی ایسی بیماریاں شامل ہیں جنکا تدارک یا ان بیماریوں کی صحیح دیکھ بھال سے اس موذی مرض کا بڑی حد تک تدارک کیا جاسکتا ہے۔ان میں ذیابیطیس بلڈ پریشر، کولیسٹرول کی زیادتی، موٹاپا، امراض قلب اور سگریٹ نوشی شامل ہیں۔یہ بیماریاں مختلف طریقوں سے بنیادی طور پر ایک ہی خرابی کا سبب ہوتی ہیں یعنی دماغ میں خون کے بہاؤ میں اچانک رکاوٹ۔رفتہ رفتہ شریان کا بند ہونا یعنی thrombus کی وجوہات میں مندرجہ بالا امراض شامل ہیں۔اس میں بھی گردن میں خون کی بڑی شریانوں یعنی کیروٹڈ CAROTID کی تنگی شامل ہے۔خون کے لوتھڑے کی اہم ترین وجہ دل کے دھڑکن کی بے قائدگی ہے۔

علامات

ڈاکٹری حلقوں میں اسٹرک کو سنگین ''ایمرجنسی'' قرار دیا گیا ہے اور گزشتہ چند سالوں میں امریکا میں یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ ہر ہسپتال میں اسٹروک ایمرجنسی ٹیمز تعینات کی جائیں حکومت یہ مانیٹر کرتی ہے کہ کتنی جلدی مریض پر توجہ دی گئی اور اسٹروک کو بڑھنے سے کامیابی سے روکا گیا۔اس وجہ سے عوامی آگہی کی ایک مہم شروع کی گئی ہے تا کہ لوگ اسپتال سے رجوع کرنے میں دیر نہ کریں۔اس کے لئے اسٹروک کی علامات سے واقف ہونا ضروری ہے۔آج کے دور میں اکثر مریضوں کو اسٹروک کی شروعات میں سر درد نہیں ہوتا سوائے ان کو جن کی دماغ کی رگ پھٹ جائے یا انکے دماغ میں خون رسنے لگے۔اکثریت کو اسٹروک کے شروع میں اچانک جسم کے کسی حصے میں کمزوری یا اپنے متعلقہ عضو پر قابو نہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔غیر ارادی طور پر بازو کسی جانب ڈھلکنے لگتا ہے۔ہونٹ یا آدھا چہرہ بگڑنے لگتا ہے، زبان میں لکنت آجاتی ہے کسی ایک آنکھ کی بینائی میں دھندلاہٹ پیدا ہوجاتی ہے۔کبھی کبھی نگلنا مشکل ہوجاتا ہے اور منہہ سے تھوک بہنے لگتا ہے۔ان علامات کا انحصار اس پر ہے کہ دماغ کا کونسا حصہ متاثر ہوا ہے۔یہ علامات تیزی سے بڑھ کر مکمل فالج کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔مگر اس پورے عرصے میں یہ ممکن ہے کہ اگر چند گھنٹوں میں اسکا صحیح علاج ہوجائے تو نہ صرف فالج کو روکا جاسکتا ہے بلکہ مفلوج حصوں کو دوبارہ کام کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔مگر اس کے لئے صرف چند گھنٹوں ہی کی مہلت ہوتی ہے اگر یہ محدود وقت گزر گیا تو پھر فالج کا کوئی علاج نہیں۔

اسٹروک کا علاج

سب سے پہلے تو اس پر زور دینا ضروری ہے کہ جن بیماریوں سے

اسٹروک ہونے کا خطرہ ہوتا ہے انکی تشخیص اور انکا تسلی بخش علاج ضروری ہے۔ اسٹروک کی علامات محسوس ہوتے ہی فوراً قریبی ایمرجنسی سے رجوع کیا جائے۔ ایمرجنسی میں ہنگامی بنیادوں پر مریض کو دیکھا جاتا ہے اور اور سب سے پہلے اسکا فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اسٹروک کی وجہ کیا ہے۔اس میں بھی یہ اہم ترین چیز ہے کہ اسٹروک خون کے بہاؤ میں رکاوٹ کی وجہ سے ہے یا دماغ میں خون بہنے کی وجہ سے۔اس لئے کہ فالج کے پھیلنے کو روکنے کی جو سب سے موثر دوائیں ہیں وہ دماغ میں خون کے رسنے کی صورت میں استعمال نہیں ہوسکتیں اور مریض کی موت کا باعث ہوسکتی ہیں۔اس کے لئے مریض کا دماغی امراض کے ماہر کے معائینے کے ساتھ دماغ کا اسکین ضروری ہے۔گزشتہ کئی سالوں میں ان ادویات کی ایجاد جو thrombus یعنی خون کے لوتھڑے کو گھلا دیں یا تنگ ہوتی ہوئی شریان کو دوبارہ کھول دیں نے اس مرض کے علاج میں انقلاب برپا کردیا ہے۔اب یہ بات خوشی سے لکھی جاسکتی ہے کہ اچھے طبی مراکز میں صحیح وقت پر پہنچ جانے کے بعد ایک بڑی تعداد میں مریضوں کے اسٹروک کا کامیابی سے علاج اور فالج کا سد باب ممکن ہے۔

اسٹروک کے تدارک میں اہم اقدامات

جو امراض اسٹروک کا باعث ہیں انکی جانب فوراً توجہ ضروری ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں میں شکر اور کولیسٹرول کے کنٹرول کی اہمیت ہے۔جنہیں بلڈ پریشر ہے انہیں چاہئے کہ وہ بلڈ پریشر کو قابو میں رکھیں اور نمک کا استعمال کم سے کم کردیں۔کیروٹڈ آرٹیریز (carotid arteries) میں خون کے بہاؤ کی پیمائش اور انکی تنگی کی جانچ بھی ایک اہم ترین قدم ہے۔اس کے علاوہ دل کی بے قائدگی کے مریضوں کے لئے ایسی دوائیں جو اس بے قائدگی کا سد باب کرتی ہیں ضروری ہے اگر ایسا ممکن نہیں تو انکو ایسی ادویات دی جاتی ہیں جو خون کو پتلا کرتی ہیں تاکہ خون کا لوتھڑا نہ بن پائے۔بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد پابندی کے ساتھ طبی معائینہ اور خون کے ٹیسٹ اور دوسرے ایسے ٹیسٹ جن میں مختلف اعضا کی عکس بندی شامل ہے اسٹروک کا تدارک کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

بعدازاسٹروک

بدقسمتی سے اسٹروک اب بھی ایک سنگین مسئلہ ہے اور کئی وجوہات کی بنا پر جس میں ہیلتھ انشورنس کا فقدان، مریضوں کی لاپرواہی، وقت پر ایمرجنسی روم میں نہ پہنچنا شامل ہیں ایک بڑی تعدا اسٹروک کے نتیجے میں فالج کا شکار ہوجاتی ہے۔یہ ایک افسوسناک اور قابل رحم صورتحال ہے۔آئیندہ تین ماہ میں ہر مریض میں خود بخود ایک معمولی بہتری ہوتی ہے مگر اسکا کوئی حتمی علاج نہیں۔اس دوران فزیکل تھیراپی سے کچھ مدد ملتی ہے جو کچھ مریضوں کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ اس نئی صورتحال سے ایڈجسٹ ہوجائیں اور تھوڑا بہت کام خود انجام دے سکیں۔

☆

''تاریخ کے دھتکارے ہوئے''

ہم جو بہتان تراشی میں بہت آگے ہیں
ہم جو مُردوں کا کفن بیچ کے کھا جاتے ہیں
ہم جو مشہور ہیں! بے حرمتیِ فن کے لئے
ہم! جو جیتے ہیں فقط دھن کے لئے، تن کے لئے
کون معصوم ہے، شیطان ہے، ہم کیا جانیں
ہم تو جو سن لیں اُسی بات کو سچ مانتے ہیں
کھوج کرنے کی مشقت سے ہمیں کیا مطلب؟
ہم تو ٹی وی کی کہانی کو سند جانتے ہیں

ایسے اندھے ہیں کہ تمیز بد و نیک نہیں
جو تحمّل سے ذرا سن لے! کوئی ایک نہیں!
بے حیائی ہمیں ملبوس میں جا ملتی ہے
اور ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں بجا ملتی ہے
آنکھ ننگی ہی رہے، پردہ ہمیں چاہیئے ہے
حال تاریک ہے اور فردا ہمیں چاہیئے ہے!

کارِ دنیا ہو، فنِ شعر ہو یا دیں داری
ہم دکھاتے ہیں فقط حرص فقط مکّاری
آئینہ جو بھی دکھا دے اُسے غدّار کہیں
جو ہمیں جھوٹ سکھاتا ہے، اُسے یار کہیں
اپنے اسلاف کی نسبت کا بھرم رکھتے ہیں
اس میں کیا شرم اگر شرم بھی کم رکھتے ہیں

ہم بھی کیا لوگ ہیں! تاریخ کے دھتکارے ہوئے
اپنی خود ساختہ حالت کے سبب ہارے ہوئے!

علی زریون

(کروڑ لعل عیسن)

''مطلعِ ہوش وخرد''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

فکر تلوار ہے

فکر تلوار ہے
احساس سمِ قاتل ہے
فکر واحساس میں سمبندھ
نہ ہونے پائے
ذہن میں ٹیس اٹھے
روح نہ رونے پائے

جب کلی پھول بنے
پھول ہوا میں بکھرے
ایک اک برگ
رہِ زیست میں چلتے چلتے
آتشِ غم میں جلے
اور بھسم ہو جائے

مرگِ گل
ایک حقیقت ہے
حقیقت ہی سہی
سوچنا ہو تو یہی سوچ کے
دل شاد رکھو
پھر اسی خاک سے
گلزار ابھر آئیں گے

غنچے چٹکیں گے نئے
پھول بھی مہکیں گے
نئے
اور مرجھا کے بکھر جائیں گے
مرجائیں گے
خاک میں لے کے نمو
خاک بسر جائیں گے
پھر اسی خاک سے۔۔۔

شہنشاہِ مشارق!

مشیر طالب
(نیویارک)

صبح نو کی شبنمِ اُمید کا غسلِ بہار
اے وطن زادو! مبارک ہو تمہیں آسودہ زار

قائد اعظم، لیاقت خان اب عمران خان
اس کی کپتانی کا جادو، منزلوں کا راز دار!

فخرِ ملک وقوم یہ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے
کامیابی کا دُلارا، کامرانی کا قرار!

راستے جدوجہد کے اس کے پہچانے ہوئے
منزلیں ہیں منتظر کپتان کی دیوانہ وار

یہ ہمارے خواب کی تعبیر کا ہے آشنا
سوکھی اور بے نخل شاخیں ہو چلی ہیں پھولدار

وقت ہے سب بھول کر دل کے دریچے کھولئے
ابتدا ، تعمیرِ ملت کی ہو پھر سے پُر وقار!!

دشمنانِ ملک و ملت کو نہ مل پائے اماں
یہ خزاں پروردہ! انکو بھائے نہ فصلِ بہار

مطلعٔ ہوش وخرد پہ رنگ ہائے انقلاب
طاقتیں باطل کی اپنے آپ سے ہیں شرمسار

پھر سے اک مہتاب کا جھومر ہے کالی رات پر
چاندنی پھر ہو چلی ہے اہلِ گلشن پر نثار

اے شہنشاہِ مشارق! آ، تجلی لے کے آ،
تاکہ دنیا دیکھ لے کشورِ حسین کا نکھار

بے بصیرت ، بے ہنر ، محراب کے ممبر نشیں
طالبِ جاہ وحشم ذلت پناہی کا شکار

''آلمحۂ موجود میں آ''

یوگیندر بہل تشنہ
(یوایس اے)

چند سانسوں کا حساب باقی تھا
کرموں کا لین دین ابھی رہتا تھا
سایہ فگن تھیں دُعائیں اپنوں کی
وقت بھی ذرا سا میرے حق میں تھا
ورنہ پیشِ داور لایا گیا ہوتا
سنسنائی ایئرپورٹ پر حادثہ جو گزرا

ایئرپورٹ پر لفٹ سے باہر نکلتے ہوئے
جانے بے دھیانی میں کس سے ٹکرایا
کہ آنِ واحد میں فرش پر چت تھا
اوسان کے ساتھ کیا کیا ہوا خطا
پارچات تر بتر ہوئے میرے
نیم بے ہوشی کا عالم طاری تھا

آناً فاناً ایمرجنسی کا عملہ
جانے کہاں سے نمودار ہوا
نبض میری ٹٹولنے میں ہوا مشغول
بلڈ پریشر کا بھی معائنہ کرنے لگا
اتفاقاً بیٹا بہو بھی تھے ساتھ میرے
ورنہ واردات کون بیاں کرتا

اسی اثنا میں وہیل چیئر بھی حاضر تھی
جانچ پڑتال سے عملے نے اپنی تسلی کی
چند ہدایات فلائیٹ کے عملے کو دیکر
ایمرجنسی عملے نے مجھے سُپرد فلائٹ کیا
صدقے جاؤں اہلِ مغرب کی حکمتِ عملی پر
اہلِ مشرق تو صدا دیتے لاؤ اسٹیچر

اور تشنہ جاں بحق ہو گیا ہوتا
معاً مجھکو یونہی یہ گماں گزرا
یہ حادثہ جاں لیوا بھی تو ہو سکتا تھا
اور یہی لمحہ، میرا لمحۂ آخر ہوتا
یک بہ یک طوق ماضی پھینک کر میں نے
کر لیا خود کو شگفتہ و تر و تازہ

مجھ پر ایسی کیفیت دیکھ کر نازل
انگشت بہ دنداں تھی زندگی میری
رہا نہ کوئی رنج، اور نہ کوئی ملال
نہ تھا شکوہ کوئی، نہ زندگی سے کوئی سوال
رازِ حیات پا کر ہو گیا تھا نہال
لمحۂ موجود کا دیکھ کر میں یہ کمال

کرتا رہتا تھا حیران و پریشان اکثر
گاہے وسوسوں کے سپرد کرتا تھا مجھکو
توڑ کر میں وہ رشتۂ ماضی
جنونِ فردا کو جھٹک کر سر سے بھی
وادیٔ موجود میں ہوں نغمہ زن
لباسِ لمحۂ موجود کیا ہے زیبِ تن

جینے لگا ہوں اب زندگی کا ہر لمحہ
لمحۂ آخری کی صورت
کون جانے کل کی سحر ہو کہ نہ ہو
طلوع آفتاب میرے لیے ہو کہ نہ ہو
اے زندگی میرے ہمراہ رقص فرما
میری ہم رقص بن، میرے دل کو رجا

لمحۂ موجود سے ہے اب تو وابستہ
ماضی کی گرفت سے نکل
چھوڑ دے فکرِ فردا
آلمحۂ موجود میں آ

○

جاوید کی وفات پر

جمیل عثمان
(نیویارک)

خبر آئی کہ عم زاد میرا چل بسا ہے
وہ میرا بھائی، میرا دوست
اب اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے

ہمارے درمیاں کتنے سمندر، کتنے دریا، کتنے صحرا تھے
مگر پھر بھی ہمارے درمیاں دوری نہ تھی اتنی
ہم اکثر فون پر گزرے دنوں کو یاد کرتے تھے
وہ عبداللہ کے باغوں سے جامن توڑنا چھپ کے
وہ جمن بی کی مرغی کو چرا کر ذبح کر دینا
پکا کر دوستوں کی دعوتیں کرنا
پتنگیں لوٹنا گلیوں میں، تالابوں میں پیرا کی
تماشا ریچھ کا اور بس میں کنڈکٹر سے چالاکی
وہ کیا دن تھے کہ ہم ہر فکر سے آزاد رہتے تھے
"یہ غم کیا چیز ہے؟" ہم پوچھتے تھے کچھ بزرگوں سے
مگر کوئی جواب ان کا سمجھ میں ہی نہیں آتا
پھر اپنی بے خودی کے راستوں پر لوٹ جاتے ہم
کہ جیسے زندگی یوں ہی ہمیشہ پرسکوں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم یوں جدا ہو جائیں گے اک دن
ہوئے اک گھر سے دو گھر، پھر محلے دو
بٹے دو شہروں میں پھر ملک بھی دو ہو گئے آخر
اسی پر بس نہیں، یہ فاصلے بڑھتے گئے اتنے
کہ ہم دو براعظموں میں ہو گئے تقسیم

تو کیا یہ بعد مشرق اور مغرب بھی نہ تھا کافی؟
جو اس دنیا کو چھوڑا اور چلا وہ دوسری دنیا؟
وہ کیا دن تھے کہ جب ہم ایک گھر میں ساتھ رہتے تھے
اور اب ہماری دنیائیں بھی مشترکہ نہیں ہیں

○

جھوٹ کے پاؤں

شاہین مفتی
(گجرات)

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں
پھر بھی ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُسے
کیا خبر کون سے رستے میں کہاں
وہ سمندر کے کنارے پہ ملے
سرخ بتی کے اشارے پہ ملے
یا کسی اور ستارے پہ ملے
بند کمرے کی اُداسی میں چھپا بیٹھا ہو
سبز وعدوں کی کماندار پناہوں میں کہیں
سلسلہ وار سوالوں کی نگاہوں میں کہیں
یہ بھی ممکن ہے کہ زینے کے تلے
ملگجی شام کو پہلو میں لیے
بند ہوتے ہوئے کھلتے ہوئے دروازے میں
ہم سے ٹکرا کے گزر جائے کبھی
اس ملاقات کی صورت کیا ہو
اُس ستم گر کی شباہت کیا ہو
اُس کی پوشاک کی رنگت کیا ہو
اس مدارات کی قیمت کیا ہو
اس توقع پہ کہ مل جائے کہیں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں رستے میں اُسے

○

''قطع رحمی''

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

رنجش تھی مگر پھر بھی چلے آئے تھے در پر لیکن
ان کے تیور تھے نہ انداز پذیرائی کے

اک زمانہ تھا کہ وہ چشمِ براہ ہوتے تھے
ہم نہیں بھولے وہ انداز دلبرائی کے

اک غلط فہمی جو لے بیٹھے وہ اپنے من میں
کر گئی کام قطع رحمی و رسوائی کے

بدگمانی کا مرض پہلے ہی لاحق تھا انہیں
وہ بھی حائل رہا تجدیدِ شناسائی کے

جب بھی گویا ہوئے محفل میں رقیبوں سے کبھی
سلسلہٴ کوہ بناتے گئے واں رائی کے

جب کبھی پیار ومحبت سے پکارا اُن کو
ہم کو سننے پڑے القاب بھی ہرجائی کے

یوں زمانہ سے ہی عنقا ہوئے آدابِ سخن
اب ہیں دو بول بھی نایاب مسیحائی کے

کاش کے لوث محبت بھی کہیں پائیں یہاں
ہم بھی محسوس کریں لطف شناسائی کے

دل پہ سہتے رہے موت سے جفائیں ان کی
ہوئے مجبور صنم آج لب کشائی کے

اس نے جب توڑ دیئے رشتے کئی برسوں کے
کیا کہوں کیسے کٹے لمحے وہ تنہائی کے

جب توقع نہ رہی اپنوں سے یا غیروں سے
پھر گلے کیسے ریاضؔ ان سے بے وفائی کے

○

نیلا آسمان

واصف حسین واصف
(نیویارک)

نیلا نیلا سا آسمان تو ہے
خوبصورت سا اک گماں تو ہے

کج ادائی بھی یاد ہے اس کی
شیلف پر ٹوٹا مرتبان تو ہے

پچھلی تہذیب کی نشانی سا
گھر میں موجود پاندان تو ہے

درمیاں چاہے ارتباط نہ ہو
پھر بھی کہنے کو خاندان تو ہے

گو کہ کردار مختلف ہے مگر
دھوپ کا ایک سائبان تو ہے

اب ہوا مہربان ہو تو چلیں
دیکھ! کشتی پہ بادبان تو ہے

جسم پھونکے کہ کفر جھلسائے
یہ جہنم کا امتحان تو ہے

خسروِ شہرِ کبر کے صدقے
یہ زمیں میری میزبان تو ہے

○

اچھے دن بھی آئیں گے

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

اس قوم کو تم بیدار تو ہو لینے دو
تعلیم و تعلّم عام تو ہو لینے دو
اچھے دن بھی آئیں گے جب
ظلم و ستم کا راج نہ ہوگا
کوئی کسی کا رب کے سوا محتاج نہ ہوگا
دودھ اور شہد کی نہریں تو نہ ہوں گی، پَر
کوئی بھوکا، پیاسا، بے کس لاچار نہ ہوگا
ہر سُو عدل و انصاف کے چرچے ہوں گے
اقبالؔ اور جناحؔ کے خواب و تدبّر کا
پورا پورا نقشہ ہوگا

ایسا کب تھا پاکستان

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

پانی بجلی کا بحران،
مہنگائی کا اک طوفان
مشکل میں ہے ہر انسان!
یہ ہے، اپنا پاکستان؟
دہشت گردی کا امکان
رہتا ہے ہر سُو، ہر آن
خطرے میں ہے سب کی جان
یہ ہے، اپنا پاکستان؟
ڈاکے، اغوا اور تاوان
رشوت ہے سب کا ایمان
کیسا قائد کا فرمان!
یہ ہے، اپنا پاکستان؟
ایک خدا، اور ایک قرآن،
ایک پیغمبر پر ایمان
بھول گئے اپنی پہچان؟
ایسا کب تھا پاکستان؟
میرے مولا، رب، رحمان،
کر دے اونچی سب کی شان
خوش ہو دیس کا ہر انسان
ایسا ہو اب پاکستان!!

تحفہ

سید طاہر شیرازی (جھنگ)

ایک مدت ہوئی
میرا ساجن مجھے
ملنے آیا نہیں
بیتنے کو چلی
برکھا کی رُت بھی اب
اور
جیون کے سائے
بھی ڈھلنے لگے
راہ گزر کے نشاں
اب تو مٹنے لگے
گھر کی ویرانیاں
بن گئی وحشتیں
دے رہا ہے دِیا
اَب تو لَو آخری
بانٹتا تھا جسے
میرے اندر کا دُکھ
میرے زخموں پہ مرہم
لگاتا تھا جو
وہ تُو آیا نہیں
وہ تُو آیا نہیں
پچھلے سالوں کی طرح
میں نے بھی اس برس
گاؤں کے میلہ سے
ایک کنگن خریدا تھا
اُس کے لیے
اور
تحفے میں مجھ کو
اُسے دینا تھا
وہ تو آیا نہیں
وہ تو آیا نہیں

''یوں نہیں، یوں! اور کچھ دیگر''

پروفیسر غازی علم الدین
(میرپور، آزاد کشمیر)

''یوں نہیں، یوں! اور کچھ دیگر'' کے نام ہی سے تجسس اور جدّت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب کی تحریروں کے دو رنگ نمایاں ہیں؛ ایک تحقیق اور اصلاحِ شعر دوسرا مزاح کا۔ ایک نہایت سنجیدہ......دوسرا شُستہ اور ہلکا پھلکا۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی ایک سنجیدہ فکر اور مخلص تخلیق کار ہیں۔ یہی خوبیاں اُن کے تخلیقی عمل اور ادبی کاوشوں سے مترشح ہوتی ہیں۔ جس قدر میں انھیں جان سکا ہوں، خوبصورت اور نستعلیق شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی تحریریں اُن کے باطن کا پتا دیتی ہیں۔ ان کے صحافی اور کالم نویس ہونے میں کوئی شک نہیں مگر میری نظر میں وہ عالمِ شعروادب اور کامیاب مزاح نگار ہیں۔

مزاح نگاری ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے تخلیقی عمل کا ایک اہم میدان ہے۔ بظاہر تو یہ بہت ہلکی پھلکی شے ہے لیکن اس لطیف شے کو تخلیق کرنے والا کوئی عام انسان نہیں بڑی شخصیت ہوتی ہے۔ جب تک کسی شخص میں غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرزِ بیان کی قوت نہ ہو، وہ کامیاب مزاح نگار نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت سے اغماض ممکن نہیں کہ **المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام** یعنی کلام میں مزاح کی وہی حیثیت ہے جو کھانے میں نمک کی۔ انسانی طبائع میں مزاح جہاں خوش مزاجی، شگفتگی اور لطافت کا باعث بنتا ہے وہاں اصلاحِ احوال بھی اس کا وظیفہ ٹھہرتا ہے۔ انتہائی سنجیدہ بات مزاح کے رنگ میں نہایت شائستگی سے کہی جاسکتی ہے۔ پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہیں کہ مزاح اور پھکڑ پن میں بال برابر فرق ہوتا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی، شائستگی کو غیر شائستگی میں بدل دیتی ہے۔ اس کتاب میں، مزاح پر مبنی، ڈاکٹر صاحب کے چار مضامین شامل ہیں جو ان کی شگفتہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو مزاح نگاری میں رسوخ حاصل ہے۔ ان کی افتادِ طبع فطرتِ سلیمہ پر استوار ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاح میں لطافت اور شائستگی کا عنصر غالب ہے۔ یہ چار مضامین پڑھ کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مزاح نگاری میں ڈاکٹر صاحب کے فکر و خیال کی بلندی اور بصارت و بصیرت کی توانائی پر کوئی کلام نہیں ہے۔ موضوع پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چوں کہ اساتذہ کی شاعری کے دلدادہ ہیں اس لیے ان کے مزاح میں جگہ جگہ شعروسخن کے پیوند لگے ہوتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب مزاح مزاح میں، ہاتھ میں نشتر بھی تھام لیتے ہیں۔ یہ عمل اُن کے مزاح کو بامقصد بناتا ہے۔ اس تخلیقی عمل میں اساتذہ بالخصوص غالب کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں، غالب کی شخصیت اور کلام کی پھلواڑی سے ظرافت کے پھول چنتے ہیں۔ مرزا غالب کو ماضی سے حال میں لاکر صحافی کے روپ میں پیش کرکے، آج کے صحافی کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت اکبر الہ آبادی کو بھی آج کے دور میں ''حاضر'' کرکے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو تراشتے ہیں۔ میں نے یہ حقیقت اپنے مطالعے سے جانی کہ شاعر زمین پر ہوتا ہے شارحین اُسے عرش پر ثابت کرتے ہیں۔ وہ عرش پر ہوتا ہے لیکن اس کے خیال کی تلاش میں شارح زمین ہی پر ٹامک ٹوئیاں مارر ہا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک اور حقیقت کو محترم ڈاکٹر صاحب نے مزاح کے رنگ میں کمالِ خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

''صنعتِ مبالغہ'' کی آڑ میں شاعر کو رائی کا پہاڑ بنانے کا لائسنس مل جاتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اُن کی غلط بیانیاں گمان و گیان کی سب حدوں کو پار کر جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ موت جیسی اٹل اور آفاقی حقیقت کو بھی اپنے زورِ بیان سے تماشا بنا دیتے ہیں۔ موت کے آتے ہی انسان کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور کاروبارِ حیات کو قفل لگ جاتا ہے لیکن شاعر کوئی معمولی مخلوق نہیں۔ وہ مرنے کے بعد بھی نہ صرف پَٹ پَٹ بولتا رہتا ہے بلکہ زندہ لوگوں سے زیادہ ''فنکشنل'' ہوجاتا ہے''۔

اُردو کے دل نشیں، سادہ اور عام فہم اشعار کی ایک بڑی تعداد ہمارے روزمرّہ کا حصہ بنی ہوئی ہے۔ یہ اشعار جہاں ہمارے گردوپیش کی زندگی کے مختلف مسائل اور حقائق کی آسان لفظوں میں ترجمانی کرتے ہیں وہاں حافظے پر فوراً نقش ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان کا چلن ایک مدت سے چلا آرہا ہے لیکن بدقسمتی سے اس علمی، لسانی اور ثقافتی روایت کے لیے موجودہ حالات سازگار نہیں رہے ہیں۔ عام آدمی ہی نہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی سورت اور آیت بتائے بغیر اپنی طرف سے قرآن کا ترجمہ بیان کرتے رہتے ہیں۔ نام نہاد علماء اپنی گفتگو اور تقریر کو، حوالے (Reference) کے بغیر حدیث رسول ﷺ سے مزین کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ توقع رکھنا کہ ہر کوئی، شعر کو اس کی اصل نسبت اور متن کے ساتھ لکھے اور پڑھے، عبث ہے۔ اخباروں، ادبی رسالوں حتیٰ کہ بعض کتابوں میں اشعار اپنی اصل حالت میں لکھے نظر نہیں آتے۔ منبروں، جلسوں اور ٹی وی چینلز پر صنفِ شعری کے ساتھ کھلے عام کھلواڑ ہورہا ہے۔ واٹس ایپ اور انٹرنیٹ پر انتہائی سطحی، کمزور اور عامیانہ اشعار دیدہ دلیری سے معروف شعراء بالخصوص علاّمہ اقبال سے منسوب کیے جارہے ہیں۔

تصحیح و اصلاحِ اشعار کے ضمن میں کچھ لوگوں نے کام کیا ہے لیکن یہ کام جس محنت اور دقّتِ نظری کا متقاضی ہے، اس کے لیے صرف اشعار کا جمع کرلینا ہی کافی نہیں بلکہ رواج پذیر متن کے ساتھ اصل متن کے تعین، شعر کے مشہورِ عام انتساب کے ساتھ اصل شاعر کی بازیافت اور مستند ماخذ کی نشان دہی کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ایک طرفہ ماجرا ہے کہ اصلاحِ اشعار پر مبنی کتب بھی تصحیح و اصلاح سے مستغنی نہیں ہیں۔ ''یوں نہیں، یوں!'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے بڑی محنت، تحقیق اور عرق ریزی سے کوئی دوسو ضرب المثل اور دل

نشیں اشعار کا ناک نقشہ درست کیا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جنھیں ادیب، مصنف، کالم نگار اور شاعر عشروں سے غلط پڑھتے اور لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرؔ سے لے کر فیضؔ تک کے کوئی تیس پینتیس شعراء کے ''تصرّف زدہ'' اشعار کی حقیقت واشگاف کی ہے۔ شعروں کے متون کے اختلافات اور ماخذ کی تفصیل دی ہے۔ بڑی جاں کاہ محنت اور جستجو سے اصل مصادر تلاش کر کے درست اشعار کا کھوج لگایا ہے۔ اس پر مستزاد، مفصل اور ضروری حواشی اور حوالوں کا اہتمام کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس وقیع مضمون میں ''تصرّفاتی بیماریوں'' کی مختلف اقسام دریافت کی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر ضروری ہے:

غلط بخشیوں سے بعض اشعار دوسرے شاعروں کے کھاتے میں ڈال دیے گئے۔ اس ضمن میں ضرب المثل اشعار کچھ زیادہ ہی تختۂ مشق بنے۔ کچھ نامور ادبی شخصیات بھی اس جرم میں شریک ہیں اور ذمہ دار ٹھہرتی ہیں۔ اگر دیوان دیکھ کر تسلی کر لی جاتی تو اُن سے یہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔

انتہائی بے رحمی سے اشعار میں اتنا تصرف کر دیا گیا کہ اُن کے حلیے بدل گئے۔ دونوں مصرعوں میں لفظی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ترتیب الٹ کر مصرعے اوپر نیچے کر دیے گئے۔

کچھ لوگوں نے، اپنی کتابوں میں مشہور اشعار نقل کرنے کے شوق میں، حد درجہ بے احتیاطی کا ثبوت دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اگر پہلے مصرعے میں تبدیلی کی ہے تو دوسرے مصرعے میں بھی تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔

بعض ادبی دانش ور یہاں تک کھلواڑ کر گزرے کہ کسی قطعے کے دو مختلف مصرعوں کو جوڑ کر ایک نیا شعر گھڑ لیا۔ مثال کے طور پر میرؔ کے تین اشعار پر مشتمل ایک قطعے کے تیسرے اور چھٹے مصرعے کو جوڑ کر کس چابکدستی سے یہ شعر ''تخلیق'' کر لیا گیا:

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

مکمل اور اصل قطعہ یوں ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

نسبتِ شعر کے بارے میں، مبالغے سے کام لیتے ہوئے بعض جلد باز جاہلوں نے زمانے کا لحاظ بھی نہ رکھا اور دو تین صدیاں پیشتر کے شاعر کا نام لکھ دیا۔ یہ طومار باندھنے سے قبل اتنا بھی نہ سوچا کہ اُس دور کی اُردو اتنی صاف اور رواں نہیں تھی۔

شعری متن میں بعض ایسی تبدیلیاں کر دی گئیں کہ شعر کا مفہوم بعید از امکان ہو گیا اور کہیں بعید از معمول۔ بعض تبدیلیاں تو شعر کو نہایت عامیانہ بنا گئیں۔

کتابت کی غلطیوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ ''بستی بسنا'' کی جگہ ''بستی بسانا'' کر دیا گیا۔ ''دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف'' کی جگہ ''دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف'' لکھ کر ''ک'' کی تکرار سے تنافرِ حرفی پیدا کر دیا گیا۔ لکھنے اور بولنے میں ''ماننا'' کی جگہ ''منانا'' کا کھلواڑ تو طبیعت میں اکثر انقباض پیدا کرتا رہتا ہے۔ نہایت بدذوقی سے ''عکس'' کی جگہ ''اشک'' کو اپنی چشمِ تر میں جگہ دے کر شعر کو بے معنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ''اشک'' اور ''چشمِ تر'' کی یکجائی پر بجز حیرانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ''جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن'' کی جگہ ''فرصت کے رات دن'' کی تبدیلی نے مرزا غالبؔ کی روح کو تڑپا دیا ہے۔ یہ تصرفات کتابت کی غلطیاں تسلیم کی جائیں یا سماعت کا مغالطہ یا ذہن کا عدم ارتباط؟

اخباری کالموں میں آج کل کثرت سے اشعار غلط لکھے جاتے ہیں۔ بعض کالم نویس اپنی تحریر کو شعروں سے سجانے کے شوق میں قاری کے ذوق کی توہین کرتے ہیں۔ ایک مصرع یاد ہوتا ہے دوسرا اپنی یادداشت کے زور پر ترتیب دے کر کالم میں جڑ دیتے ہیں۔

اس بسیط مضمون کے عمیق مطالعے سے یہ بات بھی کھلتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب ادبی تنقید کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ بعض اشعار پر نقد کرتے ہوئے ایسی جچی تلی رائے دیتے ہیں جو سیدھی دل کو لگتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ شعر ''خدائے سخن'' کے شایانِ شان نہیں لیکن عوام نے اسے مزید عامیانہ بناتے ہوئے ''لڑکے'' کو ''لونڈے'' سے بدل دیا ہے۔ بعض افراد ''سادے'' کو ''سادہ'' کہتے ہیں''

بعض تصرفات ایسے ہیں جن کی ''کرامت'' سے شعر کا مفہوم ہی نہیں بدلتا بلکہ اصل مفہوم کے اُلٹ ہو جاتا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کا ایک معروف شعر ہے:

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

بدقسمتی سے یہ شعر اس طرح مشہور ہو گیا:

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

ڈاکٹر صاحب اس ناروا تصرف پر نقد کرتے ہوئے کیا خوبصورت نکتہ دریافت کرتے ہیں:

''ہم نے اپنے خط، مورخہ ۶ رمئی ۲۰۱۱ء کے ذریعے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی اور تصحیح کی درخواست کی لیکن انھوں نے ہماری گزارش کو کوئی وقعت نہیں دی۔ فاضل ادیب اکثر اپنے کالموں میں اس شعر کا حوالہ دیا کرتے تھے اور یہ بھی خیال نہیں کرتے تھے کہ وہ ''نظریۂ جبر'' پر مبنی شعر کو ''نظریۂ قدر'' میں تبدیل کر دیتے تھے''

باقی صفحہ ۸۱ پر ملاحظہ کیجیے

گرد میں اَٹے چہرے

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

ایک روز دورانِ گفتگو ناول نگاری پر کسی نے استعجابی لہجے میں کہا ''اور رینو بہل کے گرد میں اَٹے چہرے!'' میں نے جواباً عرض کیا: ان گرد میں اَٹے چہروں میں ایک ہے سُنینا۔۔۔

And Sunaina breezes into the hearts of the readers with a graceful charm.

(اور سُنینا وہ کردار ہے جو قارئین کے دلوں میں اپنی باوقار کشش کے ساتھ بادِ بہاری کی طرح گزرتی رہتی ہے)

ڈاکٹر رینو بہل کا ناول ''گرد میں اَٹے چہرے'' ایک ہیروئن پر مرکوز ناول ہے جس میں عورت کے حسن و جمال اور نازک جذبات کے باوجود روایات و حالات اور انسانی درندگی کے ایسے دبیز پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن میں سے اُس کی آہوں اور سسکیوں کا گزر تک نہ ہو سکے۔ مرد کی ان ستم رانیوں میں عورت کی بیوفائیوں کی داستانیں بھی ملی جلی ہیں۔ ان میں رشتوں کی گہرائیاں اور ان میں تلخ و شیریں تجربات بھی جابجا ملتے ہیں جن سے عورت کو ایک مرد کے مقابلے میں زیادہ شدت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسا رینو بہل سے زیادہ شاید ہی اور کہیں دیکھنے کو ملتا ہو۔

آغازِ جوانی میں جب عورت انتہائی نازک جذبات سے دوچار ہوتی ہے تو اُس کی چاہت میں پاکیزگی بھی شدت کے ساتھ عود کر آتی ہے۔ ایسے میں مرد کی بے اعتنائی اور غیر واجب الزام تراشی اس کے معصوم دل کو جس بے رحمی سے پاش پاش کر دیتی ہے اُس کی واجب مثال سُنینا کا کردار ہے۔ اس پر ایک اور کاری ضرب خود اس کی والدہ سے ملتی ہے جو اپنی جسمانی کشش کے زعم میں اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو چھوڑ کر اپنے سادہ لوح خاوند کو عمر بھر کے لیے بدنامی کا داغ دے کر چلی جاتی ہے۔ اپنی ماں شبنم کو اپنے غیر معمولی سراپے کا غیر معمولی احساس بھی تھا جس کی وجہ سے اُس نے یہ بے راہ روی اختیار کی تھی۔ اُس کی دلکشی کو مصنفہ نے خوب بیان کیا ہے لیکن Natural justiea (قدرت کے انصاف) کے تحت اُسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں سُنینا اپنے عالمِ شباب میں وکیل کے عہدے پر فائز ہے لیکن اپنے بزرگ باپ اپنی بہن اور بھائی کی ضروریات کی شناخت و پرداخت سے بھی چشم پوشی نہیں کرتی۔ ایک جوان سال ڈاکٹر شرد جو بڑی تندہی اور خلوص سے اُس کے والد کی تیمارداری میں مصروف رہتا ہے سُنینا سے محبت کا دم بھرنے لگتا ہے۔ سُنینا گو شرد کے اوصافِ حمیدہ سے بخوبی واقف ہے مگر اپنی ذمہ داریاں جن میں اپنے محترم بزرگ باپ کے زور دینے پر انتہائی خودغرض اور بیوفا ماں کی وکالت بھی شامل ہے ہمیشہ شرد کے اظہارِ محبت کو نظر انداز کرتی رہتی ہے جو قاری کے دل میں بھی بری طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ یہ وکالت خود اس کے باپ کی اپنی بے غیرت اور بیوفا بیوی کے لیے لامثال ہمدردی کی وجہ سے ہے جو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر رکھی تھی۔

سُنینا کو پے در پے ملتے خانگی، جذباتی، اخلاقی اور سماجی طوفانوں کے مدّ و جزر سے گزرنا پڑتا ہے اس میں شاید شرد کا دستِ طلب بادِ بہاری کی بجائے بادِ سموم بن کر سُنینا کے دل سے گزرتا رہتا ہے۔ اُس کے پیارے بھائی کا ان خانگی حالات کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جانا اُس کے لیے ایک ہولناک سانحہ تھا جس سے غموں کے بادل اس کے دل پر چھائے رہتے تھے۔ ان حالات سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر شرد کی گرمیٔ جذبات کبھی اس کے دل کو موم نہ کر سکی۔ ڈاکٹر شرد کے جذبۂ ایثار کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ بغیر کسی کے کہے اپنی کوششوں سے سُنینا کی بہن کی شادی ایک بہت اچھے اور کامیاب لڑکے سے کروا دیتا ہے۔ اُس کی قربانی، محبت، خدمت اور لگن قاری کے دل کو موہ لیتے ہیں۔

سُنینا کی لگاتار کوششوں کی بدولت آخرش اُس کی ماں کی رہائی کا حکم صادر ہوتا ہے اگرچہ اُن کے گھر میں اُس کا دوبارہ داخلہ نہیں ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر شرد جسے ہم اس ناول کا ہیرو کہہ سکتے ہیں یہی کہتا رہا ہوگا۔

سیماب سا تڑپتا رہتا ہے یہ ہمیشہ ؟؟
اُن کو بھی رحم آتا اے کاش تیرے دل پر

شیکسپیئرین زاویہ نظر سے جب ہم اس ناول کا ڈوینومنٹ (Donument) دیکھتے ہیں تو سُنینا جس کی شادی کے لیے ڈاکٹر شرد مثلِ ماہیٔ بے آب تڑپتا رہا بلکہ قارئین کو بھی شدت سے انتظار رہا اُسی سُنینا کو ہم یکدم ایک بچہ گود میں لیے دیکھتے ہیں۔ تیزی سے بدلے حالات کے مدوجزر میں شادیوں کا اس عجلت سے واقع ہونا اور اسی عجلت سے والدین کا صاحبِ اولاد ہونا شاید واجب بھی ہے۔

ناول ''گرد میں اَٹے چہرے'' میں ایک کم ظرف عورت کی بے راہ روی، خودغرضی زبردست سنگدلانہ فطرت اور بے غیرت زندگی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی بہن کی ذمہ داریوں کا احساس، ایک مرد کا عورت کے تعین احترام، ایک چھوٹی بہن کی اُمنگیں اور پدرانہ شفقت کی پُرشکوہ بلندیاں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دی گئی ہیں تا کہ تشنگانِ علم وادب کے ذوق کی سیرابی ہو سکے۔

Humble Request

By the next 10 years, Earth will become 4 degrees hotter than its now. Himalayan glaciers are melting at a rapid rate, so all of us lend our hand to fight global warming, Plant more trees, don't waste water. Don't use or burn plastics.

''حاضر ہے جگر بھی''

حسن منظر
(کراچی)

جگر مرادآبادی مستی کے عالم میں کئی کئی مہینوں گھر سے باہر رہتے تھے۔ایک دن جو بے قراری بڑھی تو اُن کے قدم ایک طوائف کے گھر پہنچ گئے۔طوائف کا نام روشن فاطمہ تھا۔حسین،شوخ،چنچل،کمسن۔

☆

''حضور کی تعریف؟''اُس نے پوچھا۔

جگر آنکھیں جُھکائے اُس کے سامنے کھڑے تھے۔شاید نگاہ بھر کے اُسے دیکھا تک نہیں تھا۔جواب میں دو شعر پڑھ دیئے۔

سراپا آرزو ہوں،درد ہوں،داغِ تمنا ہوں
مجھے دنیا سے کیا مطلب کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں

کبھی کیفِ مجسم ہوں،کبھی شوقِ سراپا ہوں
خدا جانے کس کا درد ہوں،کس کی تمنا ہوں

''سبحان اللہ''طوائف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔بے چارے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔جگر نے پھر ایک شعر پڑھ دیا۔

مجھی میں عشق کا عالم،مجھی میں عشق کی دنیا
نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں

''حضور غریب خانے کو کیسے رونق بخشی؟''

کچھ ہی جانتے ہیں لطف ترے کوچے کا ورنہ
پھرنے کو تو مخلوقِ خدا پھرتی ہے

''شعر کا سُنتا تھا کہ روشن فاطمہ پھڑک گئی،طوائف چہرہ شناس،سُخن فہم تھی۔بار بار اس شعر کو پڑھتی اور داد دیتی تھی۔''میں اب تک آپ سے کیوں محروم رہی؟''کیا آپ اس شہر کے نہیں ہیں؟ ہیں تو یہاں کب سے ہیں؟ اور اب تک یہاں کیوں نہیں آئے؟''

نہ پوچھ دہر میں کب سے میں اس طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں،جو نہ اُٹھ سکا وہ حجاب ہوں

''دیکھئے میں پاگل ہو جاؤں گی۔اللہ کے واسطے اپنا نام تو بتایئے؟''

دیکھا تھا کل جگر کو سرِ راہِ میکدہ
اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چُور تھا

وہ پھر بھی نہیں سمجھی۔شاید اُس نے جگر کا نام سُنا ہی نہیں تھا یا پھر وہ یہ سمجھی کہ وہ یہاں کیسے آسکتے ہیں،کوئی اور جگر ہوگا۔اسی وقت ایک مہمان آگیا۔یہ جگر کا واقف کار تھا۔دن کا وقت تھا اس لیے محفل گرم نہیں ہوئی تھی۔

نوارد روشن فاطمہ سے مخاطب ہوا۔

''آپ جگر صاحب سے واقف ہیں؟ مشہور شاعر جگر مرادآبادی ہیں۔''

''آؤ بھئی چلیں میں نے بہت زحمت دے لی انہیں''جگر نے کہا۔

''ایسے تو نہیں جانے دوں گی۔''روشن فاطمہ نے جگر کا ہاتھ تھام لیا۔''یہ طوائف کا کوٹھا ہے جناب! یہاں وہ آتا ہے جس کی جیب میں مال ہوتا ہے۔''

جگر نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے نوٹ ہاتھ میں آئے طوائف کے سامنے رکھ دیئے۔

''نہیں حضور! قیمت تو گاہک کی حیثیت دیکھ کر طے ہوتی ہے۔ایسے نوٹ تو مجھے کوئی بھی جاہل سیٹھ دے سکتا ہے۔آپ تو مجھے غزل سُنائیں۔''

''شعر سمجھتی ہو؟''

''حضور پہلے سمجھتی ہوں پھر گاتی ہوں۔''ابھی روشن کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جگر کی پُرسوز آواز نے دن کو قیامت کا دن بنا دیا۔

کیا چیز تھی،کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا درد جگر بھی

کیا دیکھیں گے ہم جلوہ محبوب کہ ہم سے
دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی

واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کے سحر سے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی

اس دل کے تصدق،جو محبت سے بھرا ہو
اس درد کے صدقے جو اِدھر بھی ہو اُدھر بھی

ہے فیصلۂ عشق جو منظور تو اٹھیئے
اغیار بھی موجود ہیں حاضر ہے جگر بھی

☆

ایک صدی کا قصّہ

بھارت بھوشن

دیپک کنول (ممبئی،بھارت)

ایک بارکسی فلمساز نے ساحرلدھیانوی سے ایک تصویر کی فرمائش کی۔وہ اُس پرڈیوسر کواپنے گھر پر لے آئے اوراپنی البم سے اُسے ایک تصویرنکال کے دے دی۔فلمساز نے تصویردیکھ کے کہا۔معاف کیجئے آپ اس تصویر میں شاعر تونہیں لگتے۔ساحر صاحب مسکرائے اور جواب میں کہا۔اگرآپ کوایک شاعر کی تصویرہی چاہیے تو جاکے بھارت بھوشن کی تصویر لے لو۔وہ ہرزاویے سے شاعر لگتا ہے۔ساحر نے اُس فلمساز سے مزید کہا کہ بھارت بھوشن کی یاداشت کمال کی ہے۔وہ جب کوئی غزل یانظم ایک بار پڑھتا ہے تو پہلی قرات میں ہی وہ تخلیق اُسکے ذہن میں حفظ ہوجاتی ہے۔

بھارت بھوشن ایک ایسا اداکار تھا جسے شاعر یاگلوکار کے رولز کے لئے مختص کیا گیا تھا۔بھارت بھوشن 14 نے جون 1920 کو(میرٹھ) اُترپردیش کے ایک بنیا پریوار میں جنم لیا۔بھارت بھوشن کے والد رائے بہادر موتی لال ایک سرکاری وکیل تھے۔اُسکی والدہ کاانتقال تب ہواجب بھارت بھوشن محض دوسال کا تھا۔والدہ کے انتقال کے بعد دونوں بھائی اپنے دادا کے پاس علی گڑھ چلے گئے۔وہاں پر دونوں بھائیوں نے نہ صرف ابتدائی تعلیم پوری کی بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی گریجویشن کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران بھارت بھوشن اداکاری کی طرف مائل ہوا۔اس سے پہلے اُس نے کسی ڈرامے میں حصہ نہیں لیا تھا۔یہ شوق اچانک پیدا ہوا تھا۔دھیرے دھیرے اُسکا یہ شوق جنون کی شکل اختیار کر گیا۔وہ فلموں میں کام کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے اُسنے گھر چھوڑنے کا فیصلہ لیا۔اُسکے والد اُس کے فیصلے کے خلاف تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُنکا بیٹا اس لائن میں چلا جائے جو اُس زمانے میں کافی بدنام تھی۔کوئی بھی شریف آدمی فلم لائن میں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔باپ کی یہ خواہش تھی کہ وہ کوئی سرکاری افسر بنے جب کہ بیٹے نے اپنے لئے کچھ اور ہی سوچ کے رکھا تھا۔اپنے والد کی پرزور مخالفت کے باوجود اُسنے گھر چھوڑ دیا اور کلکتہ کا رخ کیا۔یاد رہے کہ اُن دنوں کلکتہ فلم سازی کا ایک اہم مرکز تھا۔کلکتہ میں اُسنے فلمی دفتروں کے خوب چکر لگائے ۔خوب جوتیاں چٹخائیں پر اُسکی مراد پوری نہ ہوئی۔تھک ہار کے وہ بمبئی چلا آیا۔یہاں بھی سفر آسان نہ رہا۔بالآخر اُسے فلم ''چترلیکھا'' میں کام کرنے کا موقع ملا گیا۔یہ فلم 1941 میں ریلیز ہوئی۔اسکے ہدایت کار کیدار شرما تھے۔اس فلم میں اُسکے ساتھی کلاکار مہتاب،نند کمار اور اے ایس گیانی تھے۔دلچسپ بات یہ تھی کہ اس فلم کو اُستاد جھنڈے خان نے موسیقی سے آراستہ کیا تھا۔اسکی کہانی بھگوتی چرن ورما کے مشہور ناول ''چترلیکھا'' پر مبنی تھی۔کیدار شرما نے اس انڈسٹری کو کئی سارے اداکار دئے ہیں۔راجکپور، مدھوبالا، گیتادت، مالا سنہا اور نہ جانے کتنے جو بعد میں فلمی اُفق پر کئی دہائیوں تک درخشاں رہے۔پھر آئی 1942 کی ''بھکت کبیر''1943 کی ''بھائی چارہ'' ۔ 1945 کی ''ساون''1948 کی ''سہاگ رات''۔فلم ''سہاگ رات'' میں اُسے دو ہیروئنوں کے ساتھ پیش کیا گیا۔یہ تھی مالا سنہا اور گیتا بالی اور ساتھ میں تھا شمی کپور۔دونوں گم نام ستارے تھے۔یہ فلم بھی کیدار شرما کی ہدایت میں بنی تھی۔اس فلم میں اُسنے اپنے کردار کو بخوبی نبھایا تھا۔یہ فلم کسی حد تک کامیاب رہی تھی مگر بھارت بھوشن کو اس فلم کی کامیابی کا کوئی فائدہ نہ ملا۔اُس کی جدوجہد کا دور جاری تھا۔یہ فلم 1949 میں ریلیز ہوئی ۔اسی سال اُس کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں جن کا نام ''رنگیلا راجستھان'' اور ''اُدھار'' تھا۔فلم 1950 میں اُسکی ایک نہیں پانچ فلموں کی نمائش ہوئی۔ ''آنکھیں''،''بھائی بہن''،''جنم اشٹمی''،''کسی کی یاد'' اور ''رام درشن'' 1951 کی ''ہماری شان'' اور ''ساگر''۔اتنی ساری فلموں میں کام کرنے کے باوجود بھارت بھوشن فلم بینوں کے دلوں میں اپنی جگہ نہ بنا سکا۔کامیابی اُس سے میلوں دور تھی۔چودہ فلموں میں کام کرنے کے باوجود وہ اپنی پہچان نہ بنا سکا۔وہ دس برس تک یونہی جدوجہد کرتا رہا۔

وجے بھٹ فلم ''بیجو باورا'' بنانا چاہتے تھے۔اس کے لئے سب سے پہلے موسیقار نوشاد علی کو سائن کیا گیا کیونکہ یہ ایک میوزیکل فلم تھی اور اسکے لئے سب سے موزوں سنگیت کار نوشاد تھا۔ جب ستاروں کے بارے میں سوچا جانے لگا تو نوشاد کی خواہش تھی کہ اس فلم کے لئے دلیپ کمار اور نرگس کو لیا جائے۔وجے بھٹ بھی دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ دلیپ صاحب کھنڈالہ میں شوٹنگ کر رہے تھے۔جب اُن سے رابطہ کیا گیا تو اُنہوں نے سب سے پہلے کہانی سننے کی فرمائش کی۔وجے بھٹ ایک کامیاب ہدایت کار تھے۔اُنہوں نے کئی ہٹ فلمیں دی تھیں۔اُن کی انا کو چوٹ پہونچی جب دلیپ صاحب نے اُسے پہلے کہانی سنانے کے لئے کہا۔وہ اداکار کی شرطوں پر کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔اُن کی انا کا سوال تھا سو اُنہوں نے دلیپ صاحب کو لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔وہ کسی اور اداکار کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگے۔نوشاد صاحب نے اُنہیں صلاح دی کہ کسی اور نامی اداکار کو لینے کی بجائے وہ کسی نئی اداکار جوڑی کو لینے پر غور کریں۔ وجے بھٹ کو ناشاد صاحب کی تجویز پسند آئی۔ نئے چہروں کی تلاش شروع ہوگئی۔وجے بھٹ کو بھارت بھوشن کا خیال آیا۔اتنی فلمیں کرنے کے باوجود ہدایت کار اُسے نوآموز ہی سمجھتے تھے۔ بھارت بھوشن کئی مہینوں سے وجے بھٹ کے دفتر کے چکر لگایا کرتا تھا۔وجے بھٹ کو بھارت بھوشن کا خیال آتے ہی اُسکا معصوم چہرہ یاد آگیا جو اس رول سے کافی حد تک مناسبت رکھتا تھا۔بھارت بھوشن کا چہرہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ مظلوم اور ستم کا مارا ہو۔ بھارت بھوشن کو بیجو کے رول کے لئے فائنل کیا گیا۔اب ہیروئن کا سوال تھا۔مینا کماری وجے بھٹ کی ہی دین تھی۔ بھٹ کیمپ نے ہی اُسے بطور چائلڈ آرٹسٹ متعارف کیا تھا۔اُسے ہیروئن کے رول کے لئے سائن کیا گیا۔فلم کی شوٹنگ شد و مد سے چلنے لگی۔فلم 1952 میں ریلیز ہوئی۔پہلے ہفتے تو یہی لگا کہ فلم فلاپ ہوگئی مگر دوسرے ہفتے سے فلم نے جو رفتار پکڑی اُسنے فلمی

پنڈتوں کو حیرت میں ڈال دیا۔فلم کے گانے پورے ملک میں گونجنے لگے۔تو گنگا کی موج میں جمنا کی دھارا۔من تڑپت ہری درشن کو آج۔محمد رفیع،شکیل بدایونی اور نوشاد نے مل کر ہندی کلاسیکی کو ایک نئی رفعت بخشی تھی۔فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ راج کپور،دیو آنند اور دلیپ کمار جیسے چوٹی کے اداکاروں کے بیچ بھارت بھوشن نے اپنی جگہ بنالی تھی۔وہ عورتوں میں خاصا مقبول ہوا تھا۔اُسکے چہرے کی اُداسی اور افسردگی نے ''بیجو باورا'' کے کردار کو جاوداں کر دیا تھا۔

''بیجو باورا'' کی بے پایاں کامیابی کے بعد بھارت بھوشن کو جو رول ملنے لگے وہ تو کسی شاعر کا کردار ہوتا تھا یا کسی گویے کا۔جیسے 1954 کی فلم ''مرزا غالب'' جسکے ہدایت کار سہراب مودی تھے۔اس فلم میں اُسکی ہیروئن ثریا تھی۔ثریا ایک کامیاب گلوکارہ اور اداکارہ تھی۔اس فلم کو مدھر سنگیت سے موسیقار غلام محمد نے آراستہ کیا تھا۔اس فلم میں طلعت محمود اور ثریا کے گانے کافی مقبول ہوئے تھے۔اس فلم کے لئے بھارت بھوشن کو بہترین اداکاری کے لئے فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا۔پھر آئی 1956 کی فلم ''بسنت بہار''۔یہ فلم بھی میوزیکل تھی۔اسکے ہدایت کار راجہ نواٹھے تھے۔اسکے فلمساز آر چندرا تھے۔اسکے مکالمے راجندر سنگھ بیدی کے قلم سے نکلے تھے۔اس فلم میں بھارت بھوشن کے مد مقابل اُس زمانے کی بہترین اداکارہ نمی تھی جو اپنی اداکاری کے جادو سے سب کو دیوانہ بنا چکی تھی۔اس فلم کی سب سے اہم بات اسکا سنگیت تھا جسے شنکر جے کشن نے ترتیب دیا تھا۔اس فلم کے گانے اتنے مدھر اور دلفریب تھے کہ یہ گانے آج بھی اُتنے ہی مقبول ہیں جتنے اُس زمانے میں تھے۔یہ فلم کمائی کے لحاظ سے کافی کامیاب رہی اُسکے بعد آئی 1959 کی فلم ''کوی کالیداس''1960 کی فلم ''برسات کی رات'' یا 1962 کی فلم ''سنگیت سمراٹ تان سین''۔ان ساری فلموں میں بھارت بھوشن یا تو شاعر کے کردار میں تھا یا کسی گویے کے کردار میں۔ان سب فلموں میں سب سے زیادہ کامیاب فلم ''برسات کی رات'' تھی۔اس فلم کے ہدایت کار پی ایل سنتوشی تھے اور فلمساز آر چندرا تھے۔اس فلم کی کامیابی میں ساحر صاحب کے گانوں کا کافی ہاتھ تھا۔روشن کا سنگیت اور ساحر لدھیانوی کے گیت۔دونوں نے مل کر فلم میں چار چاند لگائے تھے۔اس فلم میں ایک نہیں چار چار قوالیاں تھیں۔۱۔نا تو کارواں کی تلاش ہے ۲۔نگاہ ناز کے ماروں کا حال کیا ہوگا ۳۔یہ ہے عشق عشق ۴۔جی چاہتا ہے چوم لوں تیری نظر کو میں۔ان قوالیوں کی بے پناہ مقبولیت دیکھ کر اُسکے بعد فلم سازوں نے اپنی فلموں میں ایک عدد قوالی رکھنا لازمی کر دیا۔اُنہیں لگتا تھا کہ قوالی کے ہونے سے زیادہ لوگ فلم دیکھنے آئیں گے۔یہ چلن نصف صدی تک چلا۔

بھارت بھوشن کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔وہ ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا۔اُسکی لائبریری میں سو سے زائد کتابیں تھیں۔یہ کتابیں بھانت بھانت کے موضوعات پر مبنی تھیں۔یہ واحد فلم اداکار تھا جس کے پاس کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ان کتابوں کو رکھنے کے لئے اُسنے الگ سے ایک گھر خریدا تھا۔بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کی فلم ''برسات کی رات'' کی کہانی اُسی نے لکھی تھی۔فلم ''برسات کی رات'' جسمیں اُسکے مد مقابل مدھو بالا تھی۔اس فلم میں وہ ایک شاعر کے کردار میں تھا۔اس فلم نے باکس آفس پر ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''گھونگھٹ'' کو نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔یہ فلم جیمنی فلمز کے بینر تلے بنی تھی اور اس فلم کے فلم ساز ساؤتھ کے کامیاب فلمساز ایس ایس واسن تھے۔اس فلم نے بھی ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔اس فلم کے ہدایت کار رامانند ساگر تھے جو کہ ایک کامیاب رائٹر تھے۔اس فلم میں پردیپ کمار کے علاوہ اُس کے ساتھ دو دو ہیروئنیں بینا رائے اور آشا پاریکھ جلوہ گر تھیں۔اس فلم کے موسیقار روی تھے۔

بھارت بھوشن نے ہر مزاج کے ہدایت کار کے ساتھ کام کیا۔ایک طرف اُسنے خواجہ احمد عباس کی فلم ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' میں کام کیا اور دوسری طرف ایس این ترپاٹھی کے ساتھ اُسنے فلم ''رانی روپ متی''،''کوی کالیداس'' اور ''سنگیت سمراٹ تان سین'' میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔1964 کی رنگین فلم ''جہاں آرا'' میں اُنکی جہاں آرا مالا سنہا بنی تھی۔اس فلم میں ان دونوں کے علاوہ ششی کلا اور پرتھوی راجکپور بھی تھے۔اس فلم کی ہدایت ونود کمار نے دی تھی جو ''میرے حضور'' فلم سے خاصی شہرت پا گئے تھے۔اس فلم کو مدن موہن نے اپنی سریلی دھنوں سے سجایا تھا۔اس فلم نے اُس زمانے میں ایک کروڑ دس لاکھ کی کمائی کی تھی۔

بھارت بھوشن ایک کامیاب اداکار تھا۔ایک وقت ایسا بھی تھا جب اُسکے پاس تین تین بنگلے تھے۔ایک بنگلہ اُسنے اپنی کتابوں کے لئے مختص کیا تھا۔اُسکی شادی میرٹھ کے ایک متمول زمیندار رائے بہادر بدھا پرکاش کی بیٹی شاردا سے ہوئی تھی۔اُن کے یہاں دو بیٹیوں نے جنم لیا تھا۔جن کا نام انو رادھا اور اپراجیتا تھا۔انو رادھا پولیو کا شکار تھی۔اُس کی بیوی شاردا دوسرے بچے کو جنم دیتے وقت چل بسی۔بھارت بھوشن نے فلم ''برسات کی رات'' میں کام کرنے والی ساتھی کلاکار رتنا سے دوسری شادی کی۔

1965 کے بعد اُسنے وقت کی آہٹ کو سن لیا تھا۔جب اُسے راج شری کی فلم ''تقدیر'' میں بوڑھے باپ کا رول کرنے کی پیشکش کی گئی تو اُسنے یہ پیشکش ٹھکرائی نہیں بلکہ اسے لبیک کہا۔راج شری فلمز اس فلم سے یہ اُمید لگا کے بیٹھے تھے کہ یہ فلم بھی اُنکی سابقہ فلم ''دوستی'' کی طرح دھوم مچائے گی مگر ہوا اسکے اُلٹ۔یہ فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری اور اس کی ناکامی سے سب سے زیادہ بھارت بھوشن متاثر ہوا۔اُسے دو سال تک کسی نے کام نہیں دیا۔ہیرو کے رول دینا تو دور رہا کوئی اُسے چھوٹا موٹا رول دینے کے لئے بھی راضی نہ تھا۔اصل میں جس طرح کے رول اُسنے کئے،وقتی طور اُسکے کام کو سراہا گیا مگر بالآخر اس طرح کے کردار اُسکے لئے سم قاتل ثابت ہوئے۔ناصر حسین فلم ''پیار کا موسم'' بنا رہے تھے۔اُنہوں نے بھارت بھوشن کو ششی کپور کے باپ کا رول آفر کیا۔''تقدیر'' نے اُسکی تقدیر بگاڑ دی تھی۔اب اُسے باپ کے رول پیش کئے جا رہے تھے۔مرتا کیا نہ کرتا۔وہ بخوشی ایسے رول کئے جا رہا تھا۔

فلمی دنیا کے رنگ بڑے نرالے ہیں۔یہاں چڑھتے سورج کی سبھی پوجا

کرتے ہیں۔ڈوبتے سورج کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے۔ایک دور ایسا بھی تھا جب بھارت بھوشن کی طوطی بولتی تھی۔اُسنے ہر کامیاب ہیروئن کے ساتھ کام کیا۔اُسنے 1952 کی فلم ''آنند مٹھ'' میں پرتھوی راج کپور اور گیتا بالی کے ساتھ کام کیا۔فلم ''لڑکی'' میں کشور کمار اور وجینتی مالا کے ساتھ اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔''پھاگن'' میں اُسکی ہیروئن فلمی دنیا کی وینس مدھو بالا تھی۔1941 سے لے کے 1965 تک وہ مرکزی کردار ادا کرتا رہا۔ بھارت بھوشن نے کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ جیسے ''برسات کی رات'' ''بسنت بہار'' ''نئی عمر کی نئی فصل'' اور ''دوج کا چاند'' فلم ''دوج کا چاند'' کو اُسنے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر پرڈیوس کیا تھا۔اگر اسے خودکشی سے مترادف کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔فلم بنانا اُسکے لئے گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔فلم چلی نہیں۔اُسنے سودخوروں سے اس فلم کو بنانے کے لئے جو قرض لیا تھا اُس قرض کو چکانے کے لئے اُسے اپنے تینوں بنگلے بیچنے پڑے۔اُسکی کاریں بک گئیں۔اُسکا ایک شاندار بنگلہ مشہور اداکار جیتندر نے خرید لیا۔دوسرا بنگلہ اپنے زمانے کے منفی رول کرنے والے اداکار چندر شیکھر نے خرید لیا۔یہ سارے پیسے قرض داروں کے پاس چلے گئے۔اب اُسکے پاس سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں تھی۔شاید اُس مالی بحران کے وقت اُسنے ساحر صاحب کا یہ گانا ضرور گنگنایا ہوگا۔چین و عرب ہمارا۔ ہندوستان ہمارا۔رہنے کو گھر نہیں سارا جہاں ہمارا۔کھلے آسمان کے نیچے سونے کی بجائے اُسے شہر کی ایک چال میں جا کر رہنا پڑا۔کل تک جو مہنگے بنگلوں کا مالک تھا آج وہ ایک چال میں رہ رہا تھا۔انسان اپنی بربادی کا سامان خود ہی کرتا ہے۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بھارت بھوشن جوا کھیلنے کا بھی عادی تھا۔فلمسازی بھی ایک جوا ہی ہے۔اب اگر ایک انسان دو طرح کے جوئے کھیلنے کا عادی ہو تو اُسے بربادی سے خدا بھی نہیں بچا سکتا۔

امیتابھ بچن کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ اپنی کار میں بیٹھ کر شوٹنگ کے لئے جا رہا تھا۔شانتا کروز سے گزرتے ہوئے اُسکی نظر بس اسٹاپ پر کھڑے ایک شخص پر پڑی۔وہ اُس شخص کو دیکھ کر چونک گیا۔یہ شخص اور کوئی نہیں بلکہ بھارت بھوشن تھا جو کہ مسافروں کی لائن میں کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔کل تک جو فلمی دنیا پر راج کر رہا تھا آج وہی انسان عام لوگوں کے بیچ کھڑا تھا اور کوئی اُسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس کے کل تک لاکھوں کروڑوں پرستار تھے آج اُسکی پہچان ہی گم ہو گئی تھی۔یہ وقت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے۔راجیش کھنہ، ششی کپور اور شمی کپور کے عروج کیساتھ ہی بھارت بھوشن کی قسمت کا ستارا غروب ہونے لگا تھا۔لوگوں کی یاداشت بہت کمزور ہوتی ہے۔لوگ بھارت بھوشن کو بھول چکے تھے۔

کامیابی اور ناکامی دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتی ہے۔یہاں کس فنکار کا ستارا کب ڈوبے قیاس لگانا مشکل ہے۔نئے چہروں کے آنے سے فلموں کا مزاج بدل گیا تھا۔شمی کپور، راجیش کھنہ، ششی کپور، امیتابھ بچن، دھرمیندر، جتیندر وغیرہ فلمی دنیا میں وارد ہوئے تھے۔یہ جوان تھے۔خوبصورت تھے۔اور ہمہ جہت فنکار تھے۔ان کے ساتھ کسی امیج کا لیبل چسپاں نہیں تھا۔وہ ہر طرح کے رول کر سکتے تھے۔انہوں نے اداکاری کے میدان میں کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑی۔ان کے آنے سے کئی سارے مزاحیہ اداکار بیکار ہو گئے۔وہ ہر طرح کے رول کرنے میں اہل تھے۔بھارت بھوشن فلموں کے بدلے مزاج کے ساتھ میل نہیں کھا رہا تھا۔اب شاعروں اور گائیکوں پر فلمیں نہیں بن رہی تھیں بلکہ ڈان اور اسمگلروں پر فلمیں بنائی جا رہی تھیں۔بھارت بھوشن چھوٹے موٹے رول کرنے لگا۔جب ان چھوٹے موٹے رولز سے اُسکی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں تو اُسنے ٹی وی کا دامن تھام لیا۔یہاں بھی اُسے کوئی اہم رول ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔وہ نوکر، باپ یا دادا کا ورل ادا کرنے لگا۔ جب اس سے بھی گھر کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں تو وہ ہر طرح کے کام کرنے لگا۔دروغ بر گردن راوی۔کہا جاتا ہے کہ اُسنے ایک اسٹوڈیو میں واچ مین کا کام بھی کیا۔اُسنے گورو دت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' کی کہانی کو سچ ثابت کر کے دکھایا تھا۔جس طرح فلم میں گورو دت عرش سے فرش پر آ جاتا ہے ٹھیک اسی طرح بھارت بھوشن بھی عرش سے فرش پر آ گیا تھا۔

بھارت بھوشن نے اپنی خستہ حالی کے دور میں فلم ''یارانہ'' میں ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔اس سے پہلے اُس نے ایک سی گریڈ کی فلم ''رنگا خوش'' میں کام کیا۔اسکے بعد اُسنے فلم ''ادھی شنکرا چاریہ'' میں کام کیا۔یہ ایک دستاویزی فلم تھی جسے نیشنل فلم ڈیولپمنٹ آف انڈیا نے پرڈیوس کیا تھا۔اسکے ہدایت کار جی وی ایر تھے۔یہ فلم ادھی شنکرا چاریہ'' کی زندگی پر مبنی تھی۔اسمیں کلیدی رول ایک بنگالی اداکار سرو دامن بینر جی نے ادا کیا تھا جب کہ بھارت بھوشن معاون اداکار کے رول میں تھا۔اسکے بعد آئی فلم ''گھرانہ''۔یہ فلم 1983 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے کلاکار رشی کپور، گوندا، جیا پردھا، میناکشی ششادھری اور نیلم کوٹھاری تھے جب کہ بھارت بھوشن ایک مختصر سے رول میں تھا۔ستم ظریفی یہ ہے کہ اُسے کوئی اہمیت نہ دی گئی تھی نہ ہی پبلسٹی میں اور نہ ہی کاسٹنگ میں۔یہ فلم 1989 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال ایک اور فلم ''طوفان'' ریلیز ہوئی۔بھارت بھوشن کی آخری فلم ''آخری چیتاونی'' تھی جو 1993 میں پردہ سیمیں پر نظر آئی۔

وہ اس فلم کی ریلیز کا انتظار نہیں کر سکا۔اُسکا اس بے مروت دنیا سے دل بھر گیا تھا۔27 جنوری 1992 کے دن اُسکے سینے میں درد ہونے لگا۔درد جب شدت اختیار کر گیا تو وہ گھر سے نکلا اور ایک آٹو رکشا میں بیٹھ کر اُسے اسپتال لے جانے کے لئے کہا۔ابھی وہ اسپتال پہونچ بھی نہیں پایا تھا کہ موت نے اُسے دبوچ لیا اور اُسنے آٹو رکشا میں ہی دم توڑ دیا۔وہ جو لاکھوں کروڑوں دلوں پر راج کرتا تھا، کسمپرسی کی حالت میں مر گیا۔کوئی اُسکے جنازے میں شریک نہیں ہوا۔کسی نے اس بدنصیب کے لئے دو آنسو نہیں بہائے۔کسی نے اُسکا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ گم نامی کی موت مر گیا۔آہ کیسی دنیا ہے یہ۔ساحر نے سچ ہی کہا تھا۔یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے۔اس نگار خانے میں ہر چیز چمکتی ضرور ہے مگر کب معدوم ہا جائے کوئی نہیں جانتا۔یہاں ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔پردیپ کمار، اے کے ہنگل اور کتنے ستارے کسمپرسی کی حالت میں مر گئے۔اپنے زمانے کی مشہور ڈانسر ککو اپنے آخری ایام میں بھیک مانگتی دیکھی گئی۔کھیم چند پرکاش جس کی فلم ''محل'' کے

دوگانوں نے لتا منگیشکر کو ملک گیر شہرت بخشی۔ وہ جب مرگیا تو اُسکی بیوی روپ تارا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر بھیک مانگا کرتی تھی۔ ابھی حالی ہی کی بات ہے، فلم نگری کا ایک مشہور فوٹوگرافر جگدیش مالی جسکی بیٹی انترا مالی نے کئی فلموں میں بطور ہیروئن کام کیا تھا، وہ مرنے سے قبل سڑکوں پر بھیک مانگا کرتا تھا۔ وہ جب مرا تو وہ ادھ ننگا تھا۔ اُسکے پاس پہننے کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ بڑی بے مروت اور بے رحم لائن ہے یہ۔

بھارت بھوشن اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ فلمی دنیا کے جتنے بھی بے تاج بادشاہ ہیں اُنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس فلمی نگری میں ایک ایسا ستارا بھی تھا جس نے دو دہائی تک اس انڈسٹری پر راج کیا۔ اور جس کے مرنے کے بعد۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔ دنیا بھلے ہی اُسے بھول جائے فلمی تاریخ میں وہ ہمیشہ امر رہے گا۔

ازفردوسِ بریں

انو جانی!

تمہارا خط ملا، پاکستان کے حالات پڑھ کر کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ یہاں بھی اسی قسم کے حالات چل رہے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں نے مر مر کر یہاں کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ مجھے یہاں بھائیوں کے ساتھ رہنے کے کہا گیا تھا، میں نے کہا کہ میں زمین پر بھی بھائیوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا، مجھے ایک الگ کوارٹر عنایت فرمائیں۔ مصطفیٰ زیدی نے یہ کام کر دیا اور مجھے کوارٹر مل گیا، مگر اس کا ڈیزائن نثری نظم کی طرح کا ہے جو سمجھ میں تو آجاتی ہے لیکن یاد نہیں رہتی، روزانہ بھول جاتا ہوں کہ میرا بیڈروم کہاں ہے۔ لیکن اس کوارٹر میں رہنے کا ایک فائدہ ہے، میر تقی میر کا گھر سامنے ہے۔ ان کے 250 اشعار جن میں وزن کا فقدان تھا، نکال چکا ہوں مگر میر سے کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔

کُوچہ شعر وسخن میں سب سے بڑا گھر غالب کا ہے۔ میں نے میر سے کہا آپ غالب سے بڑے شاعر ہیں آپکا گھر ایوانِ غالب سے بڑا ہونا چاہئے، میر نے کہا، دراصل وہ گھر غالب کے سسرال کا ہے، غالب نے اس پر قبضہ جمالیا ہے۔ میر کے گھر کوئی نہیں آتا، سال بھر کے عرصے میں بس ایک بار ناصر کاظمی آئے وہ بھی میر کے کبوتروں کو دیکھنے کے لئے۔ ایوانِ غالب مغرب کے بعد کھلا رہتا ہے، جس کی وجہ تم جانتے ہو:

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک' بار'' ہوتا

یہاں آکر یہ مصرعہ مجھے سمجھ میں آیا۔ اس میں'' بار'' انگریزی والا ہے۔

دو مرتبہ غالب نے مجھے بھی بلوایا لیکن منیر نیازی نے یہاں بھی میرا پتہ کاٹ دیا۔ سودہ کا گھر میرے کوارٹر سے سو قدم کے فاصلے پر ہے۔ یہاں آنے کے بعد میں ان سے ملنے گیا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے، میاں! تم میرا سودا لا دیا کرو۔ مان گیا۔ سودہ کا سودا لانا میرے لئے باعث عزت ہے۔ لیکن جانی! جب سودہ حساب مانگتے تھے تو مجھ پر قیامت گزر جاتی تھی۔ جنت کی مرغی اتنی مہنگی لے آئے، حلوہ کیا نیاز فتح پوری کی دکان سے لے آئے؟ تمہیں ٹینڈوں کی پہچان نہیں ہے؟ ہر چیز پہ اعتراض۔ مجھے لگا تھا کہ وہ شک کرنے لگے ہیں کہ میں سودے میں سے پیسے رکھ لیتا ہوں۔ چار روز پہلے میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں اردو ادب کی تاریخ کا واحد شاعر ہوں جو اسی لاکھ کیش چھوڑ کے یہاں آیا ہے۔ آپکے ٹینڈوں سے کیا کماؤں گا۔ آپکو بڑا شاعر مانتا ہوں اس لئے کام کرنے کو تیار ہوا، آپکی شاعری سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا، آپکی کوئی زمین استعمال نہیں کی۔ آئیندہ اپنا سودا فیض احمد فیض سے منگوایا کیجئیے، تا کہ آپکا تھوڑا بہت قرض تو چکائیں۔ میرے ہاتھ میں بینگن تھا، وہ ان کو تمایا اور کہا:

بینگن کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ایک شہد کی نہر کے کنارے احمد فراز سے ملاقات ہوئی، میں نے کہا میرے بعد آئے ہو اس لئے خود کو بڑا شاعر مت سمجھنا، فراز نے کہا، مشاعرے میں نہیں آیا۔ پھر مجھ سے کہنے لگے، امراؤ جان کہاں رہتی ہے؟ میں نے کہا، رسوا ہونے سے بہتر ہے گھر چلے جاؤ، مجھے نہیں معلوم کہاوہ کہاں رہتی ہے۔

جانی! ایک حُور ہے جو ہر جمعرات کی شام میرے میرے گھر آلو کا بھرتا پکا کے لے آتی ہے۔ شاعری کا بھی شوق ہے، خود بھی لکھتی ہے، مگر جانی! جتنی دیر وہ میرے گھر رہتی ہے صرف مشتاق احمد یوسفی کا ذکر کرتی ہے۔ اس کو صرف مشتاق احمد یوسفی سے ملنے کا شوق ہے۔ میں نے کہا، خدا ان کو لمبی زندگی دے، پاکستان کو ان کی بہت ضرورت ہے، اگر ملنا چاہتی ہو تو زمین پر جاؤ، جس قسم کی شاعری کر رہی ہو کرتی رہو، وہ خود تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے اور پکنک منانے سمندر کے کنارے لے جائینگے۔ ابنِ انشاء، سید محمد جعفری، دلاور فگار، فرید جبالپوری اور ضمیر جعفری ایک ہی کوارٹر میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے 9 نومبر کو اقبال کی پیدائش کے سلسلے میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ اقبال، فیض، قاسمی، صوفی تبسم، فراز اور ہم وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ کوارٹر میں اندھیرا تھا اور دروازے پر پرچی لگی تھی:'' ہم لوگ جہنم کی بھینس کے پائے کھانے جا رہے ہیں، ڈنر اگلے سال 9 نومبر کو رکھا ہے۔'' اگلے دن اقبال نے پریس کانفرنس کی اور ان سب کی ادبی محفلوں میں شرکت پر پابندی لگادی۔

تم نے اپنے خط میں مشفق خواجہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ یہاں اکیلے رہتے ہیں، کہیں نہیں جاتے۔ مگر حیرت کی بات ہے جانی! میں نے ان کے گھر اردو اور فارسی کے بڑے بڑے شاعروں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ یہاں آنے کی بھی جلدی نہ کرنا کیونکہ تمہارے وہاں رہنے میں میرا بھی فائدہ ہے۔ اگر تم بھی یہاں آگئے پھر وہاں مجھے کون یاد کرے گا؟؟؟

جیتے رہو اور کسی نہ کسی پر مرتے رہو، ہم بھی کسی نہ کسی پر مرتے رہے مگر جانی! جینے کا موقع نہیں ملا.

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار جاوید جی! تسلیمات۔

پیارے گلزار جاوید آپ کس مٹی کے بنے ہو کہ میرے تمام تر تاخیری حربوں کو برداشت کرتے رہے، مجھے پہلا پیغام میرے ہمدم دیرینہ ڈاکٹر ریاض احمد کی وساطت سے بھیجا، پھر کئی بار فون پر بھی بات چیت ہوئی، مجھے اپنی کچھ تخلیقات بھیجنا تھیں جس کی روشنی میں آپ اپنا سوال نامہ ترتیب دیتے ہیں (اللہ بچائے ایسا سوال نامہ جو کسی بھی تخلیق کار کے ہوش اڑا دے) میں سدا کا سست، کاہل اور آج کا کام کل کی بجائے پرسوں بلکہ برسوں کی طرف اچھالنے والا اور میرے پاس تو نہ افسانہ کا ریکارڈ ہے نہ انشائیہ کا نہ تنقیدی مضامین کا اور نہ ہی شاعری کا وہ تو بھلا ہو دوستان عزیز جواد اور حسام حر کا جنہوں نے کونے کھدروں سے کچھ چیزیں نکال کر میرا شعری مجموعہ، تنقیدی مضامین اور ادبی کالموں کے مجموعے شائع کر دیئے۔ اور ان دنوں برخوردار شکیل نایاب میری تخلیقات یہاں وہاں سے اکٹھی کر کے، ان دوستوں تک پہنچا رہا ہے جنہوں نے میرے حوالے سے ایم اے اور ایم فل کے تھیسز لکھے۔ اور پھر اچانک مجھے امریکہ سے بلاوا آ گیا ساڑھے چار مہینے کی طویل ادبی یاترا نے تو سانس لینے بھی نہ دیا، گلزار جی آپ کے فون وہاں بھی آتے رہے میسنجر اور وٹس ایپ پر بھی رابطہ رہا اور پھر حسب عادت میں نے آپ کو پروفیسر شکیل نایاب کا نمبر دے دیا کہ ان کے پاس میری ٹوٹی پھوٹی تخلیقات ہیں، جب واپس آیا تو ایک ہوشربا سوال نامہ ملا، جس کا جواب دیتے دیتے سانس اکھڑ گئی اور جو الٹا سیدھا بن پڑا لکھ دیا (اگر ابھی تک احباب نے وہ نہیں پڑا تو پلیز اسے پڑھیئے گا بھی نہیں، میری دانشوری (؟) کا بھرم رہ جائے گا)۔ چلئے اپنے قرطاس اعزاز کو سکپ کرتا ہوں شکریہ بھی ادا نہیں کرتا کہ محبتوں میں یہ ریت ہے ہی نہیں۔ چہارسو کا باقی شمارہ حسب معمول بہت بھرپور ہے جس مضمون نے بہت دیر تک مجھے اپنے سحر میں رکھا وہ دیپک کنول کا گیتا بالی کا قصہ تھا۔ اس کے بعد میں نے چہارسو رکھ کر یوٹیوب پر گیتا بالی کے گانے سننے شروع کر دیئے، پھر مجھے افسانوں نے پکڑ لیا، سب بہت خوب تھے مگر روٹھی ہوئی بیوی کے نام خط میں یونس خان کی آخری سطریں یکدم دھندلی ہو گئیں تھیں، آنسوؤں نے ٹھیک سے پڑھنے بھی نہ دیا۔ طیبہ خان کو کہانی لکھنے کا ہنر آتا ہے اس کی کہانی عمر قید کا ذائقہ ہر چند بہت ہٹ کے تھا، مگر جانے کیوں ''مجھے اجنبی نہیں لگا''۔ میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا میں اسلم جمشید پوری نے پڑھنے والے کو جی کھول کے تنگ کیا، کمال بنت کاری ہے۔ کانچ کا چھنا کا بھی تک کانوں میں گونج رہا ہے اور کانچ کی کرچیاں آنکھوں میں رڑک رہی ہیں، افسانہ انگلی پکڑے شہر شہر ساتھ لئے پھراتا رہا اور آخر میں انگلی چھوڑ کر اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا۔ جو کرچیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں اپنے ہی شعر کی بازگشت میں گھر گیا

ہر ایک زخم میں سینے کے کانچ بھرتا ہوا
سو اس طرح سے میں جیتا ہوں روز مرتا ہوا

ویسے میں پہلے ہی چینلز کی بریکنگ نیوز سے اوب چکا ہوں اس لئے مجھے کانچ کا چھنا کا کے راوی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ''لائٹ آن'' ہونے کے بعد سٹیج پر بھی پردہ گر جاتا ہے۔ گلزار جاوید کی کہانی نے بھی قرأت کے دوران سہولت سے سانس نہیں لینے دیا۔ مضامین کا انتخاب بھی بہت خوب ہے، ڈاکٹر ریاض احمد کا فیروز عالم کے افسانوں کے مجموعے ''خزاں کا گیت'' کا تجزیہ عمدہ ہے، بہت متوازن تبصرہ ہے اچھا لگا۔ نازیہ پروین نے بھی نادیدہ فصل کی کہانیوں کی وساطت سے انل ٹھکر جی کو جانا پہچانا اور ان کی کہانیوں کی پرکھ پرچول کا حق ادا کر دیا، خوب ہے، گر مشتاق بر روئے زمیں است نے بہت ڈھارس دی ورنہ تو فرح کامران کے ''کشور ناہید سے کشور آپا تک'' تو مجھے ادھ موا کر دیا تھا، اس کی تحریر مجھے خنجر کی نوک سے دل پر کشیدہ کاری کرتی ہوئی لگی۔ فرح کامران نے کشور ناہید کے آئینہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنے اور اپنا کتھارسس پورا کرنے کی سعی کی ہے، اس بلا کی ٹیلینٹڈ بہت ہی محبت کرنے وال ایک نیک و پاکیزہ روح اور باہمت خاتون سے میری ملاقات ہے، یہ چار پانچ ماہ پہلے کے پھاگن کی ایک رس بھری شام کا قصہ ہے جب بادل چھاچھوں برس رہے تھے اور میں بہت ہی پیارے دوست ڈاکٹر محمد شفیق اور شاہد کامریڈ کے ہمراہ ان کے گھر پہنچا تھا جہاں نیویارک اور نیو جرسی کے کم و بیش سارے معتبر قلمکار آئے ہوئے تھے اور پھاگن کی چھما چھم بارش کی یہ شام فرح کامران جی نے میرے اعزاز میں سجائی تھی۔ اور چہارسو کے اس شمارہ میں شائع ہونے والا مضمون ''ادب کے اطراف میں'' کھڑے ناصر علی سید پروفیسر خالدہ ظہور نے اس شام پڑھا تھا۔ اس بلا کی محبتی اور بہادر خاتون نے کشور ناہید کو اور اس کی خواتین کی بیداری کے لئے کی جانے ساری جدوجہد کو خراج پیش کرتے ہوئے اپنے جیون ساتھی کامران ندیم سے اپنی غیر مشروط محبت کا عہد نامہ بھی تحریر کیا ہے، اسے کرنا پڑا ہے، اس کی ماں نے اسے سنہرے سپنوں کی بھیانک تعبیروں سے بہت اوائل ہی میں آگاہ کر دیا تھا اس لئے وہ اس محاذ پر ثابت قدم رہی، کامران ندیم باقی دنیا کے لئے بچھڑ گیا ہے مگر فرح کامران کے لئے نہیں وہ اب بھی اس کی محبت کی چھتری تلے سانس لے رہی ہے مجھے ایک اچھی شاعرہ کی عمدہ نثر کے ساتھ وقت گزار کے بہت اچھا لگا، سکھی رہو فرح کامران جی اور گلزار جاوید جی آپ بھی کہ آپ چہارسو کی مالا میں ایسے قیمتی موتی پروتے رہتے ہیں، شاعری میں نئے پرانے لہجے خوب ہیں، اب غزل کا رنگ اور سے اور ہوا جاتا ہے، ڈاکٹر روف خیر کی غزل میں اختر الایمان کا قافیہ عجب لطف دے گیا، کچھ نظمیں بہت اچھی ہیں حکایت لذیذ اتنی نہیں تھی پھر بھی طول کھینچ گئی۔ چلئے چہارسو کی ایک

غزل کے اس شعر سے اپنی بوریت کم کرتے ہیں

حصار باندھ لیا خامشی کا جنگل نے
کنوئیں کی تہہ میں ستاروں کا رتجگا ہوگا

(عطاؤالرحمٰن قاضی)

ناصرعلی سید (پشاور)

محترم گلزار صاحب، السلام علیکم۔

تازہ ترین شمارہ انٹرنیٹ پر پڑھا اگرچہ میں صرف کتاب ہاتھ میں لے کر نیم دراز ہو کر ہی پڑھتا ہوں کہ اسی میں پڑھنے کی لذت ہے مگر آپ کے افسانے کو فہرست میں دیکھ کر بے صبر ہوگیا۔ افسانے پر تبصرے سے پہلے چند گزارشات، کیونکہ میں ہر چیز کی تاریخ اور پس منظر سے واقف ہونا چاہتا ہوں اور اسی لئے اردو ادب اور صحافت کی تاریخ کا بھی قاری اور طاب علم ہوں۔ ''دلی'' جو تقریباً آٹھ سو سال اسلامی تہذیب و کلچر اور اردو ادب کا مرکز تھا تقسیم کے بعد ہندوستان کے حصے میں آیا اور فسادات کی وجہ سے اس شعبے سے وابستہ کئی نامور اشخاص اپنی بساط لپیٹ کر پاکستان آ بسے۔ ان میں اخبار انجام کے محمد عثمان آزاد، جنگ کے میر خلیل الرحمان، ساقی کے شاہد احمد دہلوی نگار کے نیاز فتح پوری اور نقاد کے ظفر نیازی شامل ہیں۔ انہی میں غنی دہلوی اور سعید امرت شامل تھے۔ غنی دہلوی نے کراچی سے شمع دہلی کے طرز پر ایک فلمی ادبی رسالہ رومان نکالا جس کے نائب مدیر سعید امرت تھے۔ میرا پہلا سنجیدہ افسانہ ''ایڈیٹ'' ۱۹۶۱ء میں رومان ہی میں شائع ہوا تھا۔ سعید امرت سن چالیس اور پچاس کی دہائی کے معتبر افسانہ نگار تھے انکا خاص موضوع طوائفوں کی کہانیاں تھیں اور یہ اس حد تک بے باکی سے لکھا کرتے تھے کہ ان پر فحاشی کا الزام لگتا تھا۔

آپ کا افسانہ '' کانچ کا چھناکا'' نے مجھے ان کی یاد دلا دی انکی ایک کہانی میں ایک بگڑا جاگیر دار بے خبری میں اپنی ہی بیٹی کی قیمت لگا کے سہاگ رات منا بیٹھا اور پھر حقیقت جان کر اس قدر شرمندہ ہوا کہ خودکشی کر لی۔ ایک ہی مرکزی خیال کی کہانی اپنے اپنے طور پر لکھی جا سکتی ہے بلکہ لکھی جاتی ہے۔ آپ کی کہانی اس قدر پر اثر تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑے سینہ چیرتے ہوئے میرے دل میں کھب گئے۔ اور پھر کہانی کا نجام جسے آپ نے آخیر تک چھپائے رکھا اس نے تو ایسا ذہنی جھٹکا دیا کہ اب تک اس سے جانبر نہیں ہو سکا ہوں الفاظ کا چناؤ، جزئیات، جسمانی ملاپ کی لفظی منظر کشی اور جملوں کی کاٹ نے جگر جیسے چھلنی کر دیا۔

اسی مد میں ایک اور بیان شائد قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ سن ساٹھ کی دہائی میں ہمارے اخبارات اور رسائل میں امریکی کلچر کے حوالے سے '' کی کلب'' کا بڑا ذکر رہا۔ یہ ایسی ہی چیز تھی جس کا تذکرہ آپ نے افسانے میں کیا ہے۔ اس کلب کے ممبران ایک شام جمع ہوتے تھے، کلب میں ہوٹلوں کی طرح کمرے ہوتے تھے۔ تقریب کے بعد خواتین کمروں میں چلی جاتی تھیں۔ ان کمروں کی چابیاں ڈبوں میں ڈال دی جاتی تھیں اور پھر ممبران ان ڈبوں میں سے چابیاں نکالتے تھے اور جس کمرے میں چابی فٹ ہوتی تھی وہاں تاریکی میں جا کر باہمی رضامندی سے لطف اٹھایا جاتا تھا۔ میں ۱۹۷۰ء میں امریکا آیا تھا۔ اب مجھے ۴۸ سال ہو چکے ہیں میں نے عام طور سے ایسا کوئی کلب نہیں دیکھا۔ ہاں ہر معاشرے کی طرح یہاں بھی چوری چھپے ایسے لوگ ہیں جو اس طرح کی حرکتیں کرتے ہونگے اور اسکی اطلاع رازداری سے صرف قابل اعتماد ممبران ہی کو دی جاتی ہوگی۔

آپ نے ایک انتہائی شرمناک اور غلیظ حرکت کی نشان دہی کی ہے اور اپنے خاص طنزیہ انداز میں ایک دل لرزانے والی کہانی تشکیل دی ہے۔

شمارے کے باقی مشمولات معیاری ہیں اور بطور مدیر آپکی محنت او دیانتداری کا منہ بولتا ثبوت۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

ناصر علی سید صاحب کو پڑھ کر لطف آیا، خصوصاً ''ایک محتاط کہانی''۔ ضمیر درویش کی نعت ''میگھا رے'' گیت کے اسلوب میں بڑی منفرد لگی، کیا کہنے۔ آپ نے بھی اشرافیہ کی زندگی کے ایک پہلو کی جھلک بڑی قیامت خیز انداز میں دکھائی ہے، واہ۔ مجموعی طور پہ اس بار شمارے کی کئی تحریریں بہت اچھی لگیں، آخر میں نوید سروش کا ایک شعر لکھتا چلوں:

معراجِ فن کو پانے کے عزمِ سفر میں تھے
سب جانتے ہیں ہم اسی شہرِ ہنر میں تھے

فیصل عظیم (کینیڈا)

میرے گلزار، خوش رہو۔

اس بار تمہیں شاباش دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ تم نے میرے ہم شہر جناب ناصر علی سید کو قرطاسِ اعزاز پیش کر کے ایک طرح سے میرا مان بڑھایا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ناصر علی سید صاحب کہاں چھپے بیٹھے تھے جو تمہاری عقابی نظر اُن تک نہ پہنچ سکی۔ بھئی کیا آدمی ہیں۔ قلم ہے کہ پانی کی سی روانی کی مانند بہتا چلا جاتا ہے۔ غزل ہو، نظم ہو، گیت ہو، افسانہ ہو، کالم ہو یا پھر ڈرامہ اور اس کے علاوہ براہِ راست میں انہوں نے جس برُدباری اور سخن فہمی کے ساتھ تم سے کچھ اس طرح دو دو ہاتھ کیے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل کسے فاتح اور کسے مفتوح قرار دیا جائے۔

یارِ عزیز! ''تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو'' تم نے اس بار کیا افسانہ لکھ ڈالا۔ مغرب میں تو اس طرح کی پارٹیوں کا رواج اکثر سننے میں آیا ہے جسے وہ لوگ جنسی آزادی کا نام دیتے ہیں مگر مشرق کے ایک ادیب کی جانب سے اس طرح کی کہانی کا لکھا جانا کم از کم میرے لیے تو بہت الارمنگ ہے۔ کہانی آغاز سے لے کر انجام تک قاری کو گرفت میں رکھتی ہے مگر آخر کی دو لائنوں سے تو قاری

کو زبردست دھچکا لگتا ہے اور کچھ دیر کے لیے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو جاتی ہے۔آسٹریلیا میں مقیم بلال مختار نے ''روشنی کا ہالہ'' بھی بہت عمدہ کہانی لکھی ہے۔کہانی کا کمال یہ ہے کہ کسی جگہ کوئی لفظ نہ فالتو ہے اور نہ تہذیب سے گرا ہوا اور بیان بھی بہت سبک ہے۔سلیم آغا قزلباش اپنے نامور والد کی طرح بہت تیزی سے کہانی میں نام پیدا کر رہے ہیں یقیناً تنقید میں تو پہلے ہی وہ کافی نام بنا چکے ہیں۔میری دعائیں اُن تک پہنچایئے۔طیبہ خان نئی رائٹر لگتی ہے مگر کہانی کہنے اور بُننے کا ہُنر خوب آتا ہے۔اگر مشق جاری رہی تو آگے جانے کے روشن امکانات ہیں۔اگر میں یہاں شیخ بشیر کی کہانی کا ذکر نہیں کروں گا تو اپنے ساتھ زیادتی کروں گا۔موجودہ حالات کے پسِ منظر میں خوف کی کیفیت کو خوب بیان کیا ہے۔شیخ صاحب مجھے آپ سے ایسی مزید کہانیوں کی توقع بندھ گئی ہے۔

یوں تو آپ نے ربع صدی کے اندر چہارسو میں بہت سے کامیاب تجربے کیے ہیں مگر محبی فیروز عالم کے طبّی مضامین کا تجربہ بہت شاندار ہے۔گھر بیٹھے چہارسو کے قاری کو جس طرح طبّی معاونت مل رہی ہے یہ بہت بڑا کارِخیر ہے جس کے لیے میری تمام دعائیں ڈاکٹر فیروز عالم کو پہنچایئے۔تابش خانزادہ پہلی قسط سے جس ردھم کے ساتھ ناول کو لے کر چلے ہیں تین برس ہونے کو آئے وہ بدستور برقرار ہے اور قاری کی دلچسپی کو خوب مہمیز دے رہا ہے۔دیپک کنول جی بھی اپنی کوششوں کو خوب سے خوب تر کیے جاتے ہیں اور ایک سے ایک لاجواب شخصیت تلاش کر کے ایسی ایسی معلومات مہیا کرتے ہیں کہ پڑھ کر حیرانی کے ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے۔اس بار ڈاکٹر تقی عابدی نے پنہاں کی شخصیت وفن کو عمدگی سے پیش کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔اپنے ڈاکٹر ریاض صاحب نے فیروز عالم کی کتاب ''خزاں کا گیت'' کے حوالے جو مضمون سپردِ قلم کیا ہے اُسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طبی ڈاکٹر بہت جلد نقد و نظر میں بھی نمایاں مقام حاصل کر لے گا۔

شاعری میں غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، قاسم جلال اور کرامت بخاری کی غزلوں نے بہت لطف دیا۔عبداللہ جاوید، عبدالرحمٰن عبد،ضمیر درویش اور شگفتہ نازلی کی نظموں نے بھی بہت خوشی پہنچائی۔آپا جمیلہ شبنم کی غزل دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔میں آپا سے یہ پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ وہ ادب کی جس صنف میں طبع آزمائی نہ کرتی ہوں کم از کم اُس کی نشاندہی ضرور کر دیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو ایس اے)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

کافی انتظار کے بعد بھی چہارسو کی ہارڈ کاپی ابھی تک موصول نہیں ہوئی۔تھک ہار کر انٹرنیٹ پر چہارسو کی ورق گردانی شروع کر دی اور کئی چیزیں جستہ جستہ پڑھتا اور چکھتا چلا گیا مگر جب آپ کا افسانہ کانچ کا چھنا کا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا آخر میں پہنچ کر بہت زور کے شاک میں مبتلا ہونا پڑا۔

آپ اسے کانچ کا چھنا کا کہیں میں خوشبو کا دھماکہ کہونگا۔آپ حقیقت اور فکشن کو آپس میں اس طرح تحلیل کرتے ہیں کہ حقیقت فکشن معلوم ہوتی ہے اور فکشن حقیقت۔یوں کہانی اردو افسانے کے بدلتے اسلوب کی نشان دہی کرتی ہے۔

آخری عبارت نے کہانی میں دھار پیدہ کی ہے جب وہ سینے پر جھکتا ہے اور خوشبو دھماکہ کرتی ہے۔ابھی تک صدمے میں مبتلا ہوں۔

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

گلزار جاوید جی، سلام وتحیات۔

''چہارسو'' مسلسل مل رہا ہے جس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ اپنی صحت کے پیشِ نظر میں نے خط لکھ کر متعدد ادبی پرچے بند کرا دیئے ہیں۔میں نے لکھا ''رسالہ اور ٹکٹ بچایئے'' بعض پرچے تو لفافے میں بند کئی روز تک میز پر پڑے رہتے ہیں۔من ہی نہیں کرتا، کھولنے اور پڑھنے کو مگر ''چہارسو'' جس قسم کا ادب پیش کرتا ہے مجھے اس کا انتظار رہتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتا ہوں خاص طور پر آپ کے ''براہِ راست'' کا۔انٹرویو لینا بھی ایک فن ہے۔انٹرویو لینے والے کے پاس ایسی ذہانت ہو کہ وہ مناسب اور برمحل سوالات سے شخصیت کے اندر چھپے ہوئے اصل انسان کو باہر لا سکے۔بلاشبہ آپ اس فن میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔آپ کے سوال تخلیقی ہوتے ہیں اس لیے انٹرویو دینے والوں کو بھی جواب دینے میں لطف آتا ہے۔روزنامہ جنگ کی سروس کے دوران میں نے سینکڑوں انٹرویوز کیے۔ان شخصیات میں صرف ادیب شاعر ہی نہیں فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات بھی شامل تھیں۔منیر نیازی کے میں نے ایک سے زیادہ انٹرویو کیے اور ان کی یادداشتیں بھی ریکارڈ کیں جو ''سانجھاں'' میں آٹھ قسطوں میں شائع ہوئیں۔

''انٹرویو لینے والے اکثر لوگ ابتدا میں یہ سوال کرتے ہیں۔آپ کہاں، کس سن میں اور کیوں پیدا ہوئے؟ سینکڑوں مرتبہ اس سوال کا جواب دے کر تنگ آ گیا ہوں بھئی گر میں پیدا ہو گیا ہوں تو مجھے معاف کر دو'' ان کا کہنا تھا کہ میرے سوال ایسے ہوتے ہیں کہ جواب دینے میں مزہ آتا ہے۔

آپ Filler کا استعمال بھی زبردست کرتے ہیں یعنی ایسی باتیں جو زندگی اور سبق آموز ہوتی ہیں۔مثلاً جولائی اگست کے شمارے میں یہ فلرز Master Piece of the year، دوڑ، شعری مشین وغیرہ۔

''چہارسو'' کے بانی مدیرِ اعلیٰ کے طور پر سید ضمیر جعفری کا نام شائع ہوتا ہے۔''چہارسو'' سے اس لیے بھی عقیدت ہے کہ سید ضمیر جعفری صاحب میرے مرشد تھے۔اگست ۱۹۹۱ء کو روزنامہ جنگ جمعہ میگزین (ان دنوں ہفتہ وار تعطیل جمعہ کو ہوتی تھی) میں ضمیر جعفری صاحب کا انٹرویو شائع ہوا جو میں نے لیا۔وہ لاہور تشریف لاتے تو میں ان سے ملنے چلا جاتا۔بعض اجلاسوں کی صدارت میں نے جعفری صاحب سے کرائی۔

آپ نے ''چہارسو'' کا زرِ سالانہ ''دل مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' رکھا ہے۔۱۲۰ صفحات پر مبنی اس معیاری ادبی جریدے کی اشاعت (بغیر اشتہارات اور

جریدے کی قیمت کے) کسی کارنامے سے کم نہیں جو آپ بخوبی سرانجام دیے جارہے ہیں۔ ماہنامہ شاداب ۲۶ صفحات پر مشتمل ادبی جریدہ ہے جو کنول فیروز ۴۹ برسوں سے مسلسل شائع کر رہے ہیں۔ کنول فیروز نے ۴۹ برسوں سے استقامت کا ثبوت دیا ہے یعنی صفحات، نیوز پرنٹ اور ٹائٹل سنگل کلر۔ البتہ قیمت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ آج کل ۲۶ صفحات پر مشتمل اس جریدے کی قیمت ۶۰ روپے اور زرِ سالانہ ۶۰۰ روپے ہے۔

تنویر ظہور (لاہور)

واجب الاحترام گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

"چہارسُو" کی "وسعت رس" اور "طلبیدہ حاضری" خاصی دل اندوز ہے۔ اخلاص مندیوں کے مضامین کا لفافے کے شکستہ خط ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ "چہارسُو" پیش کاری میں اس حد تک منفرد و یکتا ہے کہ دیکھنے سے دل ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ اب کے چہارسو پروفیسر ناصر علی سید کے خصوص میں تھا۔ آپ نے پروفیسر صاحب کو جو عزت دی ہے وہ ہم سرحدیوں کے لیے انتہائی دلی خوش کن ہے۔ ناصر علی سید کی معصومیت اور خود سپردگی کے اثرات ایک طرف ان کا ادبی مقام ماشاءاللہ خاصے کی چیز ہے۔ ان کا یہ بھاری بھرکم مقام بے نظیر و بے مثال ہے۔ ان کی شاعری کے فانوس تو لگے بندھے ہیں ہی ان کی نثر کے چراغ بھی "اطراف" میں روشن ہیں۔ میں جب پشاور ٹی وی کے نعتیہ یا اسلامیہ مشاعرے میں جاتا ہوں تو ان کی سرکردگی اور نظامت کی "دل پذیری" لے کر لوٹتا ہوں۔ اندازہ ہے اب وہ نظامت نہیں کرتے ہوں گے مشاعرے کے آخری شاعر ہوتے ہوں گے۔ اللہ رکھے آخر ہی پر سجتے ہوں گے۔ "میں آدھے سے زیادہ مر چکا ہوں" بڑا دردناک مضمون ہے۔ گو انجم یوسف زئی سے زیادہ مراسم نہیں رہے (بدقسمتی سے) مگر ان کو دیکھا اور سُنا ضرور ہے۔ اکادمی کی ایک اہل قلم کانفرنس میں ملاقات بھی ہوئی تھی یہ پرانی بات ہے۔ مرحوم قبول صورت، قبول رنگ اور قبول سخن تھے۔ لفظوں کی موتی ان کی زبان پر دھری تھی اگرچہ زیادہ لفٹ نہیں کراتے تھے مگر دیکھتے پیار سے تھے۔ ناصر علی سید کے مضمون سے انجم یوسف زئی کی جدائی کا المناک منظر رلا رلا گیا۔ یہ سید صاحب کی تحریر کا اثر تھا کہ انجم مرحوم "دمِ وداع" کی تاثیر۔ انجم یوسف زئی پائے کے شاعر تھے وہ کوہاٹ کے جادو نگار شاعروں میں انہی کی طرح مرعوب کن۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں۔ چوبیس مشہور بحروں کے باب میں محمد اسامہ سرسری (کویت) اگرچہ سرسری گزرے ہیں، وہ بھلا ہے بھلا ہے کے سے "آدابِ سخن" میں سرخرو ہیں۔ محذوف کے ساتھ مصور بھی ہے۔ آخر پر محذوف اور مصور ایک تخلیق میں یکساں ہیں۔ ایک تخلیق ان کا اجتماع ممکن ہے اس شعر میں دیکھیئے

ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آ کے ملو دور سے کیا بات کرو ہو

پہلے مصرعے میں مفاعیل آخر پر اور دوسرے میں فعولن۔ بحر رجز مثمن سالم کا تفعلن رکن جو ایک مصرع میں چار بار آتا ہے۔ بہر نوع آدابِ سخن (چوبیس بحریں) لائق توصیف سلسلہ ہے انہوں نے مثنوی گلزارِ نسیم کی بحر کا ذکر نہیں کیا۔ تسکین اوسط سے اس کے دو اظہار بنتے ہیں۔

۱۔ مفعول مفاعلن، فعولن (مفاعیل)
۲۔ مفعولن فاعلن، فعولن (مفاعیل)

اس اظہار میں سب بڑے شاعروں نے شاعری کی ہے اس میں فراق گورکھپوری کا کلام لاجواب ہے۔ ایبٹ آباد کے امتیاز الحق امتیاز نے بھی متاثر کرنے والی شاعری کی ہے اور بھی کچھ بحریں "لائق اعتبار" ہیں۔ اگلی قسط میں انہیں بھی شامل کر لیں۔ محمد اسامہ سرسری کی عروض سے دلچسپی بھلی ہے بھلی ہے تین فعولن۔ آپ نے دوہے کی بحر والی میری غزل شائع کی ہے مہربانی آپ کی۔ مقطع کے دوسرے مصرعہ میں "لیے" کی جگہ "لینے" شائع ہوا ہے۔ مصرع یوں ہے۔

"کیسے ہجرِ یار کے درد لیے ہیں جمیل"

بدخطی کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔ رسالے کے افسانے نہایت اچھے ہیں۔ "کانچ کا چھنا کا" لکھنے والے کے قلم کی سحر کاری کی قسم کھاتا ہے۔ "زہریلا انسان" کی طلسماتی آب و ہوا لے ڈوبنے والی ہے۔ اسے پڑھ کر بیٹھا انسان تادیر جادونگری کے محاصرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ گیتا بالی کی شخصیت، فن کاری اور فنی اہمیت دیپک کنول نے اپنے مضمون میں لفظ لفظ بڑے خلوص سے اجاگر کی ہے۔ گیتا بالی کی اداکاری بے ساختگی اور برمحل وقوع پذیری کا مرقع تھی۔ سچ ہے گیتا بالی مابہ الامتیاز فن کی پیش کار تھی۔ نوید سروش اور یوگیندر بہل تشنہ نے اپنے اپنے خطوں میں اس ناچیز کی عزت بڑھائی ہے میں ان کا شکر گزار ہوں میں ان کی شاعری کا دلدادہ ہوں۔ کمال کی چیز ہے۔

ایسی قناعت ایسا توکل پھر کب اس دنیا نے دیکھا
مولا علی سے کون ہے بڑھ کر اور فقیری کیا ہوتی ہے
(عارف شفیق)

ہم بھی اس دور کے قریئے اپنی فقیری کو سینے سے لگائے زندہ ہیں۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ اپنی ادبی روایت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ خطوط کے بعد "براہِ راست" کا مطالعہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ آپ کے مطالعے سے پُر سوالات کے جوابات تفصیلی ہیں اور اشعار نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ بہت سے جوابات نے متاثر کیا۔ "جو شعر بن رہا ہے"۔ "شاعری اس سچ کی تلاش میں نکلی ہوئی ہے"۔ "حلقہ اربابِ ذوق پشاور" والے سوال کے جواب سے کچھ اختلاف ہے۔ "رفعت کے نام" ایک محبت بھرا خط ہے "میں آدھے سے زیادہ مر چکا ہوں" بہت سے تخلیق کاروں کے دردمند چہرے سامنے

آئے انجم یوسف زئی ایک زبردست شاعر اور زندہ دل انسان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ رجحان ساز شاعر، محقق اور نقاد ڈاکٹر ریاض مجید نے ناصر علی سید کی فکر خصوصاً نظم پر باریک بینی سے بات کی ہے انہوں نے موضوعات، ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے منفرد شاعر قرار دیا ہے۔ محمد اظہار الحق نے تلخ نوائی میں صاحب گوشہ کے شعری محاسن اور اُن کے مطالعے کو موضوع بنایا ہے۔ کیا زبردست شعر ہے:

غریبِ شہر کا دشمن فقیہہ شہر بھی تو ہے
کوئی فتویٰ امیر شہر کے ڈر سے نہیں دیتا

محمود شام اور واصف علی واصف اور دیگر کی تحریریں ناصر علی سید کے فن و فکر کی تفہیم میں معاونت کرتی ہیں۔ فاری شانے ناصر علی سید کے غزلیہ کلام کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔ ناصر علی سید کا تحریر کردہ ڈرامہ ''زندگی'' میں تجسس بلا کا ہے مکالمے جاندار ہیں۔

طیبہ خان کا افسانہ ''عمر قید'' متاثر کن ہے کہانی کا بہاؤ فنی پختگی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔'کانچ کا چھناکا' گلزار جاوید صاحب کا ہلکے پھلکے انداز میں لکھا جانے والا بہت اہم موضوع پر سنجیدہ افسانہ ہے۔ کہانی کے اختتام پر عنوان کی معنویت کھلتی ہے۔ میاں بیوی کے مشرقی تعلقات۔۔۔ پھر خوشی سے معاہدہ یہ سطور بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

''ہم دونوں میں سے کسی ایک کا کسی دوسرے سے تعلق گہرا ہو جاتا تو پارٹی کے علاوہ بھی اُس سے ملنے پر کوئی پابندی عائد نہ کرتے۔'' (ص ۷۶)

نگہت یاسمین کا ''سے کی کہانی'' ہمارے معاشرے کا المیہ ہے جو بزرگوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے وقت اپنے آنے والے وقت کو بھول جاتے ہیں۔ ''انیسہ بیگم'' جیسے نہ جانے کتنے کردار ہیں جو اپنوں کی بے بسی کا شکار ہیں۔ سلیم آغا قزلباش کا افسانہ پیش کش کے اعتبار سے شاندار ہے اس بنت میں محنت نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد نے ڈاکٹر فیروز عالم کی کتاب ''خزاں کا گیت'' کا تعارف پیش کیا ہے مگر جلدی میں لیاقت میڈیکل کالج (اب یونیورسٹی) کراچی میں لکھ گئے جو کہ جام شورو میں ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ''پراسٹیٹ کینسر'' کی بیماری، وجوہ اور بچاؤ کی تفصیل سادگی سے بیان کی ہے۔ آدابِ سخن میں محمد اسامہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر قاسم جلال، کرامت بخاری، عطاء الرحمٰن قاضی، مراق مرزا، شریف شیوہ اور ابراہیم عدیل کی غزلوں کے اشعار فنی پختگی اور ندرتِ خیال کا نمونہ ہیں۔ آصف ثاقب کی غزل بڑی تیکھی ہے جس میں ملن کی آس اور عشق کی آنکھ مچولی کی رنگین داستان ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر کی غزل کی ردیف ''پھنس گئے'' مزاح کی طرف لے جاتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے کمال مہارت سے اشعار نکالے ہیں۔ اشرف جاوید کی غزل کا مطلع کس جانب اشارہ کر رہا ہے۔

بیان سے کبھی پشیمان سے نکل گیا ہے
امیرِ شہر بھی ایوان سے نکل گیا ہے

عارف شفیق کی غزل صوفیانہ چادر میں ملفوف ہے مزا آ گیا۔ عبداللہ جاوید کی نظم ''ہونے اور نہ ہونے کے درمیان'' اور ڈاکٹر جواز جعفری کی ''میں نے باغ کی جانب پیٹھ کر لی'' متاثر کرتی ہیں۔ نظموں کی فکر، منظر اور پیش کش لاجواب ہے۔ یوگیندر بہل تشنہ نے اپنی محبت کا اظہار خوب کیا ہے۔ وجیہہ الوقار نے رس رابطے کی ترتیب میں خاصی محنت کی ہے پس ورق پر نئی کتابوں کے عکس آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں بلکہ رال ٹپک رہی ہے۔ نیرّ اقبال علوی کی ''پاگل خانہ'' پہنچ گئی ہے۔ بہت شکریہ۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ شمارے کی رسید بذریعہ ٹیلی فون دے چکا ہوں۔ قرطاس اعزاز کے حقدار اس مرتبہ ناصر علی سید ٹھہرے تو اُن کے بارے میں تفصیلات پڑھ کر ان کی ذات بابرکات سے آگاہی ہوئی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مضمون موصوف کے بارے میں مختصر مگر جامع تھا اس کے علاوہ خود صاحبِ اعزاز کا افسانہ ''ایک محتاط کہانی'' اُن کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ ان کی شاعری بھی ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ ہائیکو: ''ہجر کی بارش تو، کیچڑ سا کر دیتی ہے، اجلے خوابوں کو'' سوچنے کا ایک نیا انداز ہے۔

افسانوں میں سلیم آغا قزلباش کا ''سودا'' اور شیخ بشیر احمد کا ''رودادِ چمن'' پسند آئے۔ اسلم جمشید پوری آج کل کم وبیش ہر جریدے میں دکھائی دے رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ ''میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا'' بھی اُن کے اپنے اسٹائل کی کہانی ہے جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ ''کانچ کا چھناکا'' میں لفظ ''چھناکا'' نے مجھے ایک خوشگوار صوتی احساس دیا ہے ورنہ یہ خوبصورت لفظ تو آج کے اردو ادب میں شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گیا ہے۔ جتنا خوبصورت لفظ ہے اتنا ہی دلکش افسانہ بھی۔ دل میں ایک کسک ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔ مراق مرزا کی غزل کا یہ مطلع

''چہرہ کون و مکاں پر بھی عیاں ہو جاؤں گا
میں کتاب ہوں اک دن عیاں ہو جاؤں گا''

پسند آیا۔ اُن کی شاعری بھی اتنی ہی پُرکشش ہے جتنے ان کے افسانے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب۔ آداب۔

چہار سو کا تازہ شمارہ پورے آب و تاب کے ساتھ دستیاب ہوا۔ ایک بار پھر آپ نے دریائے ادب سے نایاب گوہر جناب ناصر علی سید کو تلاش کر کے اُن سے بھرپور تعارف کرایا۔ ایک ناصر علی میں کئی ناصر علی چھپے ہیں۔ افسانہ نگار،

شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد صاحب کی خوبیوں سے پرت در پرت کھول کر اُن کی بھرپور شخصیت سے قارئین کو پہچان کرنے میں آپ کامیاب ہوگئے ہیں۔ ''براہِ راست'' میں جم کر پوچھے گئے سوالات اور ایمانداری سے دیئے گئے جوابات نے نہ صرف قارئین کی معلومات میں اضافہ کیا بلکہ دلچسپ انداز میں اُن کی شخصیت کی پرتیں کھل کر سامنے آ گئی۔ آپ کے سوالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ قرطاس اعزاز کی ادبی خدمت کا پہلے اچھا خاصا مطالعہ کرنے کے بعد اُسے سوالوں کے دام میں پھنساتے ہیں۔ اسی لیے آپ کا ہر بار انٹرویو الگ ہوتا ہے۔ ایک بار پہلے بھی میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ وقت آ گیا ہے غور وفکر کا جب انٹرویو کو بھی ڈرامہ، ناول، افسانہ کی طرح ادب کی اہم صنف مانا جائے۔ کیوں نا یہ آواز چہارسو کے فورم سے مل کر اٹھائی جائے؟

''روشنی کا ہالہ'' زبردست افسانہ ہے اسے پڑھ کر دیر تک اس کے سحر سے باہر نہیں نکل پائی۔ موضوع اور انداز بیان لاجواب۔ ''سودا'' سلیم آغا قزلباش کی اچھی کہانی ہے۔ والدین اولاد کی خوشی کی خاطر اپنا سودا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اولاد والدین کی قربانی کو اپنا حق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بشیر صاحب نے ''روداد چمن'' میں کشمیر کے حالات پر درد بھرا بہت عمدہ افسانہ لکھا ہے جسے پڑھ کر دل اور دماغ دیر تک وہاں کے مکینوں کے درد میں بھیگا رہتا ہے۔ ''سے کی کہانی'' ایک روایتی ساس اور بہو کی کہانی ہے۔ یونس خان کا افسانہ ''روٹھی ہوئی بیوی کے نام خط'' رشتوں کی نفسیات اُس کی الجھنوں پر مبنی دلچسپ افسانہ ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صاحب کا افسانہ ''میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا'' تازہ سلگتا حادثات پر طنزیہ انداز میں اُن کو قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ بامقصد اور اچھا افسانہ ہے۔ طیبہ خان کا ''عمر قید'' اُس لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بے جوڑ شادی کو توڑنے اور آزادی کی خاطر اپنی اولاد تک کو قربان کر کے سونے کے پنجرے سے بھاگ نکلتی ہے۔ اکثر بے جوڑ شادیوں کا اختتام ایسا ہی ہوتا ہے، رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اور دیر تک آپ اس کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتے۔ ''کانچ کا چھناکا'' قاری کے اندر تک جھانکتا ہے۔ اس شمارے میں چھپے سبھی افسانہ نگاروں کو میری جانب سے بہت بہت مبارک۔

تابش صاحب ناول کو کس موڑ پر لے آئے ہیں۔ یہ باب بھی تجسس اور دلچسپی سے بھرپور ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک ہی نشست میں اسے پڑھ لیا جائے۔ اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ مشتاق یوسفی صاحب کا جانا ادب کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ زید بن عمار نے خراجِ عقیدت بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم میڈیکل پریکٹشنر کے ساتھ ساتھ ادیب بھی ہیں اور اس کا فائدہ سبھی کو ہر شمارے میں اُن کے تازہ مضمون سے ہوتا ہے۔ ہر بار وہ کسی نہ کسی بیماری سے آگاہ بھی کرتے ہیں اور معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد کا مضمون ''خزاں کا گیت'' فیروز عالم صاحب کی نئے افسانوی مجموعے میں شامل کہانیوں پر عمدہ تبصرہ ہے۔ کشور ناہید میری پسندیدہ ادیبہ ہیں اُن پر لکھا فرح کامران کا مضمون اور ملک زادہ جاوید صاحب کا مضمون ابھی پڑھنا باقی ہیں۔ امید ہے یہ دونوں دلچسپ ہوں گے۔

دیپک کنول جی کے کیا کہنے۔ ہر بار ایک نئی شخصیت کے ساتھ اُن کی پوری تفصیل لے کر اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت بخشے اور آپ اسی طرح چہارسو کے پودے کو سینچ کر اُس کی خوشبو چہارسو پھیلاتے رہیں۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

سبز و سفید لہراتے ہلالی پرچموں (عطائے ربِ کریم پرچم) جھلملاتے ملی نغموں (وطن کی مٹی گواہ رہنا) جگمگاتے چراغوں اور دمکتے چہروں کے مابین جشنِ آزادی کے شکرانے کے ساتھ غیر ارادی طور پر توجہ مقبوضہ کشمیر و فلسطین کی جدوجہد آزادی کی کامیابی کے لیے مرکوز ہو جاتی ہے۔ بڑھتی رہے یہ روشنی۔۔۔ چلتا رہے یہ کارواں۔۔۔

جناب ناصر علی سید کا قرطاس اعزاز اُن کی جملہ جہات فنی و ادبی پہ محیط ہے اور متنوع زاویوں سے مطالعے کو طمانیت عطا کرتا ہے۔

پروفیسر بیگ احساس جس دوستانہ ڈھب اور اپنائیت بھرے لہجے میں احساس تشکر ادا کر رہے تھے اس پر تحریر سے زیادہ تقریر کا گماں گزرا اور جب جب ایسا ہونے لگے تب تب غالبؔ بہت یاد آئے کہ مراسلے سے مکالمے تک کی راہیں ایقان کی نہج کو چھونے لگیں۔۔۔

بیگ احساس تم ہی ہو؟ نہایت شگفتہ اسلوب میں لکھا گیا مزاح آمیز معنویت کا خاکہ ہے۔ جو قاری کو شاداں وفرحاں کیے رکھتا ہے اور صاحبِ خاکہ سے متعلق ان کے اخلاص کی مسلسل گواہی بھی دیتا ہے۔ رنگ باتیں کریں کے لیے مبارکباد۔

گزشتہ دنوں یوسفی صاحب کے آبِ گم اور پروفیسر پطرس بخاری کے سویرے جو کل آنکھ میری کھلی سے اقتباسات ضیا محی الدین بہت دلچسپ اور پُر لطف پیرائے سے آخر شب میں سُنا رہے تھے واقعتاً مزاح پڑھنے کے ساتھ ساتھ سننا بھی کمال کا تجربہ ہے۔

''کانچ کا چھناکا'' کے راوی ڈیش صاحب کی دعوت خاص پر انجمن آزاد خیالی کی رنگینیوں ورعنائیوں میں بھٹکتے بھٹکتے ہوش وخرد کی راہداریوں سے اس قدر دُور نکل آئے کہ حقیقت وگماں میں فرق ممکن نہ رہا۔ ایسے میں آخری خبریں آنے تک کا منظرنامے کا منطقی انجام تک پہنچنا کچھ ایسا بعید از قیاس کبھی نہیں ہے۔ کولیسٹرول کے بارے معلوماتی تجزیہ پڑھنے کو ملا۔ خزاں کے گیت اور نادیدہ فصیل پہ نقد ونظر سے افسانوی مجموعوں کے متن سے آگہی اور متعلقہ نثری خصوصیات سے شناسائی پائی اور مطالعے کے لیے تعارف وتفہیم سہل ثابت

ہوئے۔

کشور ناہید سے کشور آپا تک آتے آتے حقوق نسواں کی علمبردار ہونے کے ناطے ان کی نظموں کا امتیاز واختصاص خواتین کی سوچ کے متعلق معاشرتی شعور کا دھارا بدلنا رہا ہے۔مگر اس کے ساتھ اُن کی میزبان فرح کامران کے بارے میں بھی جاننے کا موقعہ ملا کہ وہ کس قدر باہمت اور حوصلہ مند ہیں اور یہ کہ لاشعوری طور پر اس ذہنی تقویت وتربیت میں کشور آپا کی نسوانی نظموں کا جرأت مندانہ ودلیرانہ ردِعمل بھی شامل حال رہا ہوگا جو نہایت خوش آئند ہے اور مشعل راہ بھی۔ پبلو نرودا کی نظم Beautiful 10 lines you start dying slowly اور مختصر مختصر شعری مشین، دوڑو، مین آف دی گولڈن آرم ذہن کے ساحل کو چھوتی ہوئی دانائی کی لہریں ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جولائی ، اگست ۲۰۱۸ء اردو ادب کے حوالہ سے قومی اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر، افسانہ نگار، نقاد، ادیب اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے معروف ڈرامہ نگار ناصر علی سید صاحب سے منسوب کرکے بجا طور پر آپ نے ان کی ادبی خدمات کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں گزشتہ تیس (۳۰) سالوں سے موصوف کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ وہ خوش مزاج ہونے کے علاوہ محبت و خلوص کا جذبہ رکھنے والے ایک انتہائی نفیس انسان ہیں۔

شمارے میں بہت اچھے افسانے، مضامین اور شاعرانہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ آپ کا لکھا ہوا افسانہ ''کانچ کا چھناکا'' خود کو آزاد خیال اور ماڈرن بننے والوں کے لیے ایک باعث عبرت سبق ہے جو کہانی کے انجام سے صاف عیاں ہو جاتا ہے۔ نگہت یاسمین کا افسانہ ''سمے کی کہانی'' بے جس معاشرہ کی ایک ایسی افسوس ناک تصویر ہے جب ماں بڑے پیار اور چاہ کے ساتھ بیٹے کی شادی کے بعد بہو کو اپنے گھر لاتی ہے لیکن بوڑھے والدین کی ضروریات اور احساس سے لاتعلق اولاد کی موجودگی میں وہی گھروں کے لیے اجنبی بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کے اختیارات بھی سلب ہو جاتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا'' معاشرہ میں بے حسی اور جنسی درندگی کی ایک افسوسناک اور دل شکن داستان ہے اور بدقسمتی سے ملکی قوانین اور نظام ایسے واقعات کو کنٹرول کرنے اور عبرتناک سزائیں دینے میں ناکام رہے ہیں۔ یونس خان نے افسانہ ''روٹھی بیوی کے نام خط'' میں دلچسپ پیرائے میں ازدواجی الجھنوں کا تذکرہ کرنے کے بعد معاملات بہتر کرنے کے لیے راہنمائی کی ہے۔ اسی طرح سلیم آغا قزلباش کا افسانہ ''سودا'' بلال مختار کا ''روشنی کا ہالہ'' اور شیخ بشیر احمد کی کہانی ''رودادِ چمن'' واقعات، احساسات وجذبات کے اعتبار سے پُر اثر افسانے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے نہایت قابل فہم زبان میں ''پراسٹیٹ کینسر'' کے موضوع پر ایک مفید معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے جو خاص طور پر پچاس سال سے زیادہ عمر کے مرد حضرات کو سمجھ کر اس پر اپنے مفاد میں عمل کرنا چاہیے تاکہ کسی پیچیدگی سے پہلے ہی مرض کا کامیاب علاج ممکن ہو سکے۔

شاعری میں بہت خوب کلام شامل ہے جس میں ناصر علی سید، شگفتہ نازلی، ڈاکٹر انیس الرحمٰن، آصف ثاقب، ڈاکٹر سید قاسم جلال، مراق مرزا اور ایک شکوہ لیے ہوئے ڈاکٹر فیروز عالم کے نام یوگیندر بہل تشنہ کا کلام ''آوارۂ عالم'' شامل ہے۔ آخر میں اس تمام انتخاب اور ادبی محنت اور خدمت کی بنا پر ایک دلچسپ شمارہ پیش کرنے پر آپ کو دل کی گہرائی سے مبارک باد اور جذباتِ تشکر پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیم۔

جولائی ، اگست ۲۰۱۸ء کا ''چہارسُو'' روایتی آب وتاب کے ساتھ موصول ہوا اور دلِ بے قرار کو گھٹن زدہ ماحول میں تروتازہ ہوا کے چند فرحت بخش جھونکے نصیب ہوئے۔ حق بات تو یہ کہ ''چہارسُو'' کے پیچھے آپ مستند جوہری کی مانند متحرک دکھائی پڑتے ہیں جو ہمہ وقت اپنی اولوالعزمی وچابکدستی کے ساتھ ایک دیدہ زیب طلائی جھومر تیار کرتا ہے اور پھر اسے بصد اہتمام اردو ادب کی پیشانی پہ آویزاں کرکے اس کے روپ رنگ کو دوچند کر دیتا ہے۔ اب کی بار جس جھومر نے قارئین کی آنکھوں کو خیرہ کیا اس ہستی کا نام ناصر علی سید ہے۔ تاہم اسے میری کج نگاہی کہہ لیجیے کہ میں بھی محمود شام صاحب کی طرح موصوف سے شناسا نہ تھا۔ ''چہارسُو'' کا بے حد ممنون احسان کہ اتنے بڑے قد کاٹھ کے ادیب، دانشور اور تخلیق کار کو روشناس کرایا۔ شکریہ!

آٹھوں افسانے عمدہ اور پُر تاثیر تحریریں تھیں۔ بطورِ خاص سلیم آغا قزلباش صاحب کا ''سودا'' اسلم جمشید پوری کا ''میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا'' طیبہ ولایت خان صاحبہ کا ''عمر قید'' اور بلال مختار کا ''روشنی کا ہالہ'' بہت منجھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ مگر ''کانچ کا چھناکا'' نہایت پیچیدہ عنوان کو بڑی تہہ داری اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ ہمارے سماج میں اگر یہ عنوان شجرِ ممنوعہ کے زمرے میں آتا ہے۔ تاہم زیرِ زمیں ایسی باتیں ممکنات میں سے ہیں۔ آپ نے بڑی دلیری اور ذہانت سے ان قباحتوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

علاوہ ازیں فرح کامران صاحبہ کا ''کشور ناہید سے کشور آپا تک'' ''گیتا بالی''، ''خزاں کا گیت'' پر ڈاکٹر ریاض احمد صاحب کا تبصرہ ''پراسٹیٹ کینسر'' پر ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی معلوماتی تحریر اور ناصر علی سید کے فن اور ان کی بے مثل شخصیت بارے تحریر کیے گئے تمام مضامین وآراء بہت معلوماتی اور ان کے قد وقامت کو مزید بڑھانے میں ممد ومددگار ہیں۔ طوالت کی وجہ سے حصہ شاعری پر اپنی آراء سے اجتناب کر رہا ہوں۔

نیرّ اقبال علوی (لاہور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

وقارِ ادب تسکین ادیب نامہ ماہنامہ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آغاز ہی میں صاحبِ قرطاس ''ناصر علی سید'' کے لیے سید شکیل احمد نایاب کا کمیاب فن پارہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ناصر علی سید ایک کہنہ مشق شاعر ہیں موصوف ایک سچے پاکستانی ہیں جو ادب سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ براہِ راست میں آپ کے سوالات اور سید صاحب کے جوابات کے توسط سے اُن کے ماضی وحال سے آگاہی کا موقع ملا۔ گلزار صاحب آپ کا بے حد شکریہ آپ ہمیں چہارسو کے ذریعے بڑے اعلیٰ قلم کاروں سے ملواتے ہیں۔ اس بار دونوں حصوں کے افسانے بہترین انتخاب ہیں۔

آپ کو افسانے کے سمندر کا شناور کہنا چاہیے۔ آپ کے افسانے اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ غزلیات میں غالب عرفان، قاسم جلال، کرامت بخاری، گل بخشالوی، عارف امام، نوید سروش، عارف شفیق اور سید طاہر شیرازی کے کلام میں بہت سے اشعار دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم امراض کی علامات، علاج کے حوالے سے ایک طرح کا جہاد کر رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

ہر ماہ ایک نابغہ روزگار شخصیت سے ملاقات بہت دلچسپ سلسلہ ہے۔ یہ آپ کی محنت اور لگن ہے۔ جو کہاں کہاں سے ہیرے، موتی اور جواہر ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔

آپ سچ مچ ایک جوہری کی نظر رکھتے ہیں۔ اس ماہ کی شخصیت ناصر علی سید باکمال انسان ہیں۔ کتنی ان کی جہتیں ہیں اور ہر لاجواب ہے۔ کس کس کی تعریف کریں۔ دعا ہے رب کریم انہیں سلامت رکھے۔ ناصر علی سید پر محمود شام کی تحریر ''ہوا، ساغر، چاندنی'' پڑھ کر لطف آ گیا۔ محمود شام صاحب اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

افسانے سبھی اچھے ہیں لیکن بلال مختار کا ''روشنی کا ہالہ'' دل کو چھونے والی تحریر ہے۔ گلزار جاوید صاحب آپ کا افسانہ بہت ہی خوفناک ہے۔ اس نے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ بہت سال پہلے کراچی میں ہوا تھا۔ وہ لوگ غالباً ہوٹل کے کمروں میں بیویوں کو بند کر کے چابیاں کلس کر کے کسی میز پر رکھ دیتے تھے اور پھر جو چابی جس کے ہاتھ لگتی ۔۔۔ استغفرُ اللہ۔۔۔ گراوٹ کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

ہر کہانی میں مقصدیت ہے۔ آغا صاحب کا ''سودا'' دلگداز کہانی ہے۔ والدین اپنی اولاد کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ شیخ بشیر احمد کی ''رودادِ چمن'' پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ جانے کتنے خاندان کھو جانے والوں کے منتظر ہوں گے۔ ہر صبح نئی آس امید کے ساتھ جاگتے ہوں گے اور ہر رات آنسو بہا کر سو جاتے ہوں گے۔ مرنے والوں کو رو دھو کر صبر آ جاتا ہے لیکن غائب ہو جانے والوں کی پھانس ساری زندگی سینے میں گڑی رہتی ہے۔

زہریلا انسان میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سپیرا ہیرو معصوم سا بھولا بھالا اچھا لگتا ہے۔ لڑکیاں عورتیں اس پر خاموشی سے عاشق ہوتی رہتی تھیں۔ پر وہ کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ پر اس بار تابش صاحب کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس بیچارے کو معصوم ہی رہنے دیجئے۔ اپنے افسانے ''کھارے سوڈے کی بوتل'' کی تعریف کے لیے میں یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر ریاض احمد اور نوید سروش کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔

سیما پیروز (لاہور)

سلیکشن

شگفتہ نازلی

(لاہور)

فون پر لوکل کالج کی۔۔۔
پرنسپل یُوں گویا ہوئیں۔۔۔
دیکھیے اس سبجیکٹ کے لیے۔۔۔
دوسو عرضیاں آئی ہیں۔۔۔
ایک انار، دوسو بیمار۔۔۔
اِنٹرویو تو چند دن تک ہے۔۔۔
پر آپس کی بات ہے یہ۔۔۔
ہم نے سلیکشن کرلی ہے۔۔۔
رہ گیا گریڈ اور سیلری سکیل۔۔۔
یہ تو بعد میں طے ہوگا۔۔۔
پھر بھی آپ اگر چاہیں۔۔۔
کل تک عرضی معہ کوائف۔۔۔
دَفتر کو بھجوا سکتی ہیں۔۔۔!

○

...... وقارِ ہنر ......

وقارِ ہنر کی اشاعت میں دیر ہونے کا سبب بیان کرنا مقصود نہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس میں شامل مضامین کی فہرست تیار کرنا اور مختلف دریچوں میں ان مضامین کو ترتیب دینا آسان کام نہیں تھا مگر اس سے بڑھ کر کمپوز کیے گئے مضامین میں درستی کا عمل اور ہر مضمون کی پروف ریڈنگ کرنا میرے لیے محال تھا۔ میں اپنے انتہائی قابلِ احترام دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری یہ مشکل آسان کی۔ جناب خالد لطیف سابق سب ایڈیٹر روزنامہ ''مشرق'' اور دوسرے جناب طارف واصفی صدر فکرِ اقبال فورم میرے کام آئے اور ایک ایک مضمون کو دو دو مرتبہ پڑھا اور ہر مضمون کو اغلاط سے پاک کیا۔

وقارِ ہنر میں تجزیے اور تبصرے اور عملی تنقید پر مشتمل مضمون شامل کیے گئے ہیں، مرزا غالب پر چار مضامین اور علامہ اقبال پر دو مضامین قارئین ذوق و شوق سے پڑھیں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے عہدِ ناصبور میں مطالعۂ کتب کا رجحان نشیبی گراف کا نشان امتیاز بن چکا ہے۔ معاشرے کے بیشتر افراد زندگی بھر معاشی ناآسودگی میں مبتلا اور شعر و ادب سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہیں مگر ایسا بھی نہیں، ابھی ایسے باذوق لوگ موجود ہیں جو کتاب سے محبت رکھتے ہیں اور فارغ اوقات میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ادب پر گفتگو اور ادبی مکالمہ خال خال رہ گیا ہے۔ ...... حسن عسکری کاظمی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۵۰۰، دستیابی: اظہار سنز، 19۔ اردو بازار، لاہور۔

...... یادیں باقی ہیں ......

رزقِ حلال کے لیے کمالی صاحب نے جو مشقتیں اُٹھائی ہیں اُن کے پیشِ نظر میں اور میری اہلیہ کسی شک وشبہ کے بغیر انہیں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں اور ان سطور کے ذریعہ پہلی مرتبہ اُن سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے خصوصی طور پر دُعائیں کریں کہ اللہ ربّ العزت ہمیں بھی رزقِ حلال سے نوازے اور کسی کا محتاج نہ بنائے۔ ہماری اور ہماری اولاد کی زندگیوں میں اللہ عزّ وجل کی طرف سے خیر و برکت کا سایہ رہے اور ذاتِ باری ہم سے دین کا کوئی بڑا کام لے (آمین) معین کمالی صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے پڑھنے والے پر جس طرح تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں، قاری پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے۔ سادہ لیکن شاندار انداز میں اپنی بات کو پیش کرنے کا ہنر کمالی صاحب کو خوب آتا ہے۔ اشاروں اور کنایوں سے بھی کام لیتے ہیں مگر قاری کسی ابہام کے بغیر بات کو سمجھ لیتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔ دلچسپی اور اثر انگیزی تحریر پر اس طرح چھائی رہتی ہے کہ پڑھنے والا کہیں بوریت محسوس نہیں کرتا۔ ......فاروق انور

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: مکتبۂ دُگر، گلشنِ اقبال، کراچی۔

...... اصلی تے جعلی شعراں دا ٹاکرا ......

ایہہ کوئی 1995ء دی گل اے میں اپنی ہلتر پاروں اِک دن کتاب ''سیف الملوک'' لے کر پڑھن لگا تے میری نظر مُڈھلے صفحے دے اس شعر!

اوّل تے کُجھ شوق کسے نہ کون سُخن اج سُن دا ــــ جے سُنسی تاں قصہ اُتلا کوئی نہ رمزاں پُن دا

اُتے اٹک گئی۔ ایس شعر نے مینوں دسیا جے میاں محمدؒ ہوراں دا دل سی جے لوک پری تے شہزادے دے قصّے توں ہٹ کے میرے صوفیانہ کلام نوں پڑھ، سمجھ کے نیک رستے اُتّے ٹُر پین۔ میاں محمد بخشؒ ہوراں دے شعر وِچ لکھے ہوئے ایس حکم نوں من کے 1998ء وچ اک کتاب ''گلستانِ رمُوز'' لکھ کے چھپوا دِتی۔ اوہدے لکھن دے سبب بارے پورا حوالہ گلستانِ رموز دے دیباچے تے تصحیح شدہ نسخے ''سیف الملوک'' دے مقدمے وچ لکھیا ہوا ہے۔ اوس کتاب گلستانِ رمُوز دا سارا کلام شیخ غلام حسین اینڈ سنز لاہور دے چھپے ہوئے نسخے ''سیف الملوک'' وچوں اخذ کیتا سی جہڑا 1898ء وچ یونیورسل پریس جہلم توں چھپے ہوئے نسخے دی نقل اے۔ ......چودھری محمد اسماعیل چیچی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۵۰۰، دستیابی: BII/578، گلی عرفانی مسجد، مسلم آباد، گجرات۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
رنگ
محمد پرویز کلیم
ادھورے ہاتھ
غلام شبیر اسد
خواب دیکھتے رہنا
محمد حمید شاہد